گئودان

پریم چند

[illegible]

گُل کدہ

علمی، تحقیقی، ادبی، تنقیدی اور سوانحی

مقالات و مضامین

رئیس احمد جعفری (ندوی)

ناشر

شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اوّل ... ... نومبر سنہ ۱۹۶۰

مطبوعہ .. .. علمی پرنٹنگ پریس لاہور

طابع و ناشر .. .. شیخ نیاز احمد

قیمت .. .. .. روپے

حکیم محمد سعید

(مینیجنگ ٹرسٹی ہمدرد دواخانہ کراچی کے نام)

مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر،
اسی سے غریبی میں ہوں میں امیر

فہرس

عنوانات	صفحہ نمبر
تاریخ و تحقیق	
وضع حدیث	۹
انکار حدیث	۳۲
عربوں کے آثار	۷۵
عربوں کی فکری تاریخ پر ایک نظر	۹۵
غیر مسلم رعایا سے ترکوں کا روادارانہ سلوک	۱۱۷
محاضرات	
قرآن اور اس کی فضیلت	۱۳۰
معاویہ اور علی	۱۳۴
اعلام الاسلام	
ادب الجاحظ	۱۳۷
ابونصر فارابی	۲۰۸

عنوانات	صفحہ نمبر
نقد الشعر	
انتخاب کلام میر	۲۴۳
مصحف مصحفی	۲۶۲
انتخاب کلام ذوق	۲۸۰
رام پور کا ایک ملک الشعرا	۲۸۷
حسرت کے چند نشتر	۳۱۲
چمن بے نظیر	۳۱۵
گل کدہ	۳۲۰
شخصیات	
اسٹالن کی شخصی زندگی	۳۳۱
آغا خاں	۳۴۲
علم النفس	
بچہ کی نفسیات	۳۵۱

پیرایۂ آغاز

کئی سال ہوئے مسرز غلام علی اینڈ سنز نے میری ایک کتاب "کشکول" چھاپی تھی جو میرے علمی و تاریخی اور تحقیقی مقالات پر مشتمل تھی، ایک عرصہ سے وہ ایڈیشن ختم ہے، میرے محترم اور مکرم شیخ نیاز احمد صاحب کا ارشاد تھا کہ اس پر نظر ثانی کر دوں تو دوسرا ایڈیشن چھپ جائے۔

اس ارشاد کی تعمیل کرنے بیٹھا، تو کتاب بالکل نئی ہو گئی، اسی لئے نام بھی بدل دیا، کشکول کے صرف چند مضامین اس میں ملیں گے باقی سب نئے ہیں، ۳۱ء میں، ان سطروں کا لکھنے والا، جامعہ ملیہ (دہلی) کا طالب علم تھا، طالب علمی کے زمانہ میں اس نے سب سے پہلی کتاب "سیرت محمد علی" لکھی، رسالہ جامعہ میں بھی مضمون نگاری کا سلسلہ جاری رہا، ۳۴ء میں، روزنامہ خلافت کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بمبئی آگیا، جہاں دسمبر ۴۷ء تک قیام رہا، پھر، ۴۹ء میں پاکستان آیا، کراچی سے اپنا روزنامہ "خورشید" نکالا، ۵۲ء میں روزنامہ زمیندار کا چیف ایڈیٹر بن کر لاہور آگیا، ۵۵ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ

عنوانات	صفحہ نمبر
افکار و مسائل	
"نیاز" مندانہ گزارشات	٣٥٦
ملائیت کا فتنہ	٣٦٥
ایک قوم تین زبانیں	٣٦٩
اردو مرحوم	٣٧٢
کراچی جیل اور خالق دینا ہال	٣٨١
خود نوشت	
مولانا شبلی اور عطیہ بیگم فیضی	٣٨٣
رپورتاژ	
سلطان سعود ابن عبدالعزیز کا دربار	٣٨٩
آثار قدیمہ	
مٹیا برج	٣٩٩
وفیات	
موت العالم موت العالم	٤٠١
سید صاحب: نقوش و تاثرات	٤١٠

عنوانات	صفحہ نمبر
مسعود عالم ندوی	٤٣٣
شفیق الرحمان قدوائی	٤٤٠
سر رفیع الدین	٤٤٢
قطب میاں	٤٤٤
عبدالرحمان صدیقی کی یاد	٤٤٦
خلیفہ صاحب	٤٥٢
یادِ ماضی	
مولانا شوکت علی اور سر اکبر خاں	٤٥٩
خاکے	
پرویز صاحب اور نظام ربوبیت	٤٦٣
خلافت معاویہ و یزید	٤٧٢
فیچر	
مہاجر	٤٧٦
تاریخی فیچر	
قاضی کا انصاف	٥٠١
عبدالعزیز والی اندلس کا قتل	٥١٧
جلال الدین خوارزم شاہ	٥٢٨

وضع حدیث

نومبر ۳۰ء کے جامعہ میں ایک مقالہ عنوان بالا سے شائع ہوا ہے، مضمون کے مطالعہ کے بعد ہر شخص یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے،

"اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں وہ تھوڑی سی حدیثیں جو بلاشبہ صحیح نہیں، اس طرح مخلوط ہوگئیں، کہ بڑے بڑے نقادوں کے لئے یہ مشکل ہوگیا کہ" اس دریائے کذب سے سچائی کے قطروں کو چن سکیں" جامعہ، صفحہ ۳۳۴، (نومبر ۱۹۶۰ء)

گویا "سچائی کے وہ قطرے" اس جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں "اس طرح مدغم ہوئے کہ اس پردۂ عالم پر متحقق طور پر کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جسے حدیث صحیح کے نام سے باور کیا جاسکے، جس کے متعلق یہ سمجھا جاسکے کہ وہ قول رسول ہے، جس کے متعلق یہ اعتماد کیا جاسکے کہ وہ لوث کذب و دروغ سے پاک ہے لیکن کیا واقعات بھی اس دعوے پر شاہد ہیں؟ کیا حقیقتہً یہ دعویٰ ایسا ہے کہ جس پر ایمان لایا جاسکتا ہے۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مذہب کے نام پر، جذبات کے نام پر، قرآن و حدیث کے نام پر، آپ کے احساسات سے اپیل کروں اور یہ چاہوں کہ آپ مذکورۂ بالا دعویٰ کی صداقت اس لئے تسلیم نہ کریں کہ اس سے حدیث پر زد آتی ہے، حدیثیں مشتبہ ہوجاتی ہیں اور اقوال رسول کی جو نعمت عظمیٰ ہمارے پاس تھی وہ چھنی جاتی ہے، اگر وہ دعویٰ دلائل کی بنیاد پر استوار ہوسکے تو یقیناً ہمیں اس "دفتر بے معنی" کو دھ

لاہور سے وابستہ ہوگیا، جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، ۲۸ سال کی یہ طویل مدت صرف لکھنے اور پڑھنے اور مطالعہ و مشاہدہ میں بسر ہوئی۔

اس کتاب کے مضامین و مقالات، خواہ وہ تحقیقی اور علمی ہوں، یا تاریخی اور سیاسی، مذہبی اور دینی ہوں، یا ادبی اور تنقیدی، میرے ذاتی تاثرات و مشاہدات کا نتیجہ ہیں، ہر شخص اپنا ایک مخصوص ذوق، ایک مخصوص نقطۂ نظر اور مخصوص انداز فکر و خیال رکھتا ہے، میں نے جو کچھ پڑھا، جو دیکھا، جو کچھ پایا، جو کچھ سمجھا، اسے الفاظ میں منتقل کر کے اپنے پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دیا۔

سامنے مہمان کے جو تھا بستر رکھ دیا،!

رئیس احمد جعفری

۸۹- ٹیگور پارک - لاہور

اس کے اور کیا رہجاتا ہے کہ رسول کے اقوال، اس کے اعمال وافعال، اور اس کے بنائے ہوئے راستوں، اس کے کئے ہوئے فیصلوں اور اس کے فرمائے ہوئے ارشادات کو مشعل راہ بنائیں اور اسی کی روشنی میں تلاش وتجسس اور غور وتفحص سے وہ راہ حق ڈھونڈیں جس کے ہم متلاشی ہیں،

کہا جا سکتا ہے اور کہا گیا ہے کہ

"وضاعین وکذابین کی ایک بے شمار فوج پیدا ہوگئی جو دن رات حدیثیں گھڑنے میں لگی رہتی، بلکہ ان میں سے بعض کا پیشہ یہی تھا، صفحہ ۳۴۴"

اس صورت میں بھلا حدیث پر اعتماد کی کیا صورت ہے؟ اور یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس مشکوک ومشتبہ صورت مسئلہ میں کمزور پہلو پر عمل کیا جائے؟

جواب نہایت غیر مشتبہ ہے، آج ہم بے تامل کذابین وضاعین حدیث کی ایک فہرست پیش کر دیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں مسئلہ پر جتنی حدیثیں وارد ہوتی ہیں وہ غلط ہیں، موضوع ہیں، باطل ہیں،

لیکن ہمارے قول کی بنیاد کیا ہے، ان "وضاعین وکذابین" کے ہم شاہد عینی نہیں، ہم نے نہ انہیں جھوٹ بولتے سنا، نہ وضع حدیث کرتے دیکھا، ہمارا مبلغ علم یہ ہے کہ ان کے معاصرین نے، نقادان فن نے، اور حدیث واشخاص کے پرکھنے والوں نے متفقہ طور سے ان کے ضعف، کذب اور دروغ گوئی کا پردہ فاش کیا ہے ہم اس پر اعتماد کریں، اور ان لوگوں کو کاذب، وضاع اور نہ معلوم کیا کیا سمجھیں پس معاصرین کے قول کی روشنی میں، مبصرین ونقادان اسماء الرجال کی رائے کے مطابق ہم ایک جماعت کو غیر ثقہ قرار دے سکتے ہیں، دروغ گو باور کر سکتے ہیں تو ایک دوسری جماعت کے متعلق اس کی توثیق قبول نہیں کر سکتے؟ اور پھر جب یہ حقیقت بھی ہم پر

ناب" میں نہیں بلکہ اسی "جھوٹ اور کذب" کے سیلاب میں بلاتامل غرق کر دینا چاہئے، آج کی صحبت میں اسی موضوع پر گفتگو مقصود ہے کہ آیا وہ "جھوٹ اور کذب کا سیلاب" ہے یا حقائق و معارف کا بحر بیکراں؟

یہ حقیقت ہے کہ عہد رسالت میں احادیث کے ضبط و کتابت کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی، اس لئے کہ احتمال تھا کہ قرآن و حدیث میں مخلوط نہ ہو جائیں، اس کے علاوہ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں خود "حدیث ناطق" موجود تھی، یعنی سرکار رسالت کا وجود باجود، جب تک رسالت مآب رونق بخش کارگاہ حیات رہے اس وقت تک حدیثیں منضبط نہیں ہو سکیں اس لئے کہ رسول اللہ کی حیات طیبہ جس وقت تک باقی رہی اس وقت تک استفسار واستصواب، سوال و جواب اور پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رہا، نماز کے متعلق شبہ ہوا کہ "خیط ابیض" اور "خیط اسود" سے کیا مراد ہے؟ سرکار نے اس کی تشریح فرمادی، امامت کون کرے؟ کس کا حق ہے! کے وقت کی نماز فرض ہوتی ہے، سنتوں کی حیثیت کیا ہے تیمم کس کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ یہ اور اس قبیل کے بیسیوں جزئی سوالات ہیں جن کا جواب قرآن مجید میں نہیں مل سکتا، لامحالہ ہمیں اس "عمل" کو ڈھونڈھنا پڑے گا، جسے خود قرآن نے "اسوۂ حسنہ" کے نام سے یاد کیا ہے، اور اس "قول" کی جستجو کرنی پڑے گی جسے قرآن ہی نے "ان ہوالاوحی یوحیٰ" کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ جب ہم میں کسی بات میں اختلاف ہو، راہ حق مسدود ہو رہی ہو تو لامحالہ "ردوہ الی اللہ ورسولہ" پر عمل کرنا پڑے گا اب عہد حاضر میں خدا براہ راست ہم پر وحی نازل نہیں کر سکتا کہ وہ ہمارے "تنازع" کا خاتمہ کرے، اگر قرآن میں وہ چیزیں ہمیں نہیں ملتی، تو ہم سوا اس کے اور کیا کر سکتے ہیں کہ رسول کی طرف رجوع کریں، رسول بھی مرئی اور مادی صورت میں ہمارے سامنے موجود نہیں تو چارۂ کار سوا

ایک گروہ پیدا ہوا اور اس نے ان لوگوں کے عزائم باطلہ کو تار تار کر کے رکھ دیا، اس نے ان کی پردہ دری کی، ان کے سوانح حیات قلمبند کئے ان کے صدق و کذب کا امتحان کیا، ان کی دیانت و ثقاہت کو جانچا ان کی صداقت اور راست گوئی کی پڑتال کی اور بالآخر انہیں بے نقاب کر کے چھوڑا، ان کے لئے ایک مستقل تاریخ بنائی جس میں ان کے پوست کندہ حالات ملتے ہیں، ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ

قال سفیان الثوری لما استعمل الرواة الکذب استعملنا لهم التاریخ وقال حسان بن زید لم نستعن علی الکذابین بمثل التاریخ اقول للشیخ کم سنة وفی ای تاریخ ولد فان اقر بمولده عرفنا صدقه من کذبه وقال الحسن بن الربیع قدمت بغداد فلما خرجت شیخی باب الحدیث فلما خرجت الی الخارج قالوا توقف فان احمد بن حنبل یجئ فقعدت و اخرجت النواحی فلما جاء قال لی ای سنة مات عبد الله بن المبارك فقلت سنة احدی

سفیان الثوری کہتے ہیں کہ جب راویوں نے کذب کی آمیزش شروع کر دی تو ہم نے تاریخ سے کام لینا شروع کیا، اور حسان بن زید کہتے ہیں کہ کذابین کے لئے تاریخ سے بڑھ کر ہمارا کوئی مددگار نہیں ہے میں شیخ سے اس کا سن دریافت کرتا ہوں اس کی تاریخ ولادت پوچھتا ہوں اگر وہ سچ سچ کہہ دیتا ہے تو ہم اس کا صدق اسکے کذب سے پہچان لیتے ہیں اور حسن ربیع کہتے ہیں کہ ایک بار میں بغداد گیا جب چلنے لگا، تو اصحاب حدیث نے میری مشایعت کی جب میں باہر پہنچا تو انہوں نے کہا ذرا ٹھہر جائیے، احمد بن حنبل آرہے ہیں۔ جب وہ آئے مجھ سے پوچھا، کہ عبداللہ بن مبارک کا کس سنہ میں انتقال

روشن ہے کہ ان ائمہ جرح وتعدیل نے بلاتذبذب بلاتامل، بلاپس وپیش، جس
جماعت کی توثیق کی اسے سچا جانا، تنقیدی نظر ڈالنے کے باوجود اسے کبھی جھوٹ
بولتے نہیں پایا، اس کی ساری زندگی ان کے سامنے گزری پر انہوں نے کبھی
اس جماعت کے کسی فرد کو کسی آلودگی میں ملوث نہیں پایا، نازک سے نازک موقع
ان کا اعلان صداقت زلزلہ انداز قصر طاغوت ثابت ہوا، سخت سے سخت آزمائش
پر ان کی زبان سے اگر نکلا تو کلمۂ حق، جرح کرتے وقت انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ
یہ امام وقت ہے، علامہ دہر ہے عوام کے نزدیک مقبول ومحبوب ہے، ان کا
دوست ہے رشتہ دار ہے عزیز ہے، انہوں نے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ بڑی
سے بڑی شخصیتوں پر جرح کی، تنقید کی، ان کی زندگی کے ہر پہلو کو پبلک کے
سامنے پیش کیا، اور بتلادیا کہ اس کی حقیقت کیا ہے، پھر وہ کون سے اسباب وعلل
ہیں جو مانع ہوتے ہیں، کہ ہم اس توثیق کے بعد انہیں ثقہ نہ مانیں، راست گو نہ مانیں
صداقت شعار نہ مانیں، ہم اگر نہ بھی ماننا چاہیں تو ہمارا ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے اور
مجبور کرتا ہے کہ ہم ان کی رائے پر اعتماد کریں، اور ان کے فرمودہ حق کو بالکل "حق"
مانیں، یہ ضرور ہے کہ جب آثار واخبار کی کثرت ہوئی، اور مکہ شریف ومدینہ منورہ
سے باہر قال اللہ وقال الرسول کا غلغلہ بلند ہوا تو ان میں خرقہ پوشان مکر وسالوس
بھی تھے، جو بظاہر مسلمان تھے، لیکن جن کے قلوب کفر وشرک کی تاریکی سے ظلمت
شب تاب کا منظر پیش کررہے تھے، انہوں نے اپنے اغراض نامسعود کے لئے
اپنے مصالح سیاسی کے لئے اور اپنی کامیابی وکامرانی کے لئے دنیا میں غلط
احادیث کی نشر واشاعت کرنا چاہی، یہودیت اور عیسویت نے اسرائیلیات کو حدیث
کے نام سے پیش کرنا چاہا لیکن وہ اپنے مقصد میں بالکل کامیاب نہیں ہوسکے فوراً
ہی ائمہ جرح وتعدیل کی ایک جماعت پیدا ہوئی، اسماء الرجال سے بحث کرنے والا

حافظ ابن الحافظ الی من ذکرہ
علائی و اخرج المدلسین
تصنیف من المتاخرین
محدث الکبیر المتقن برہان
ین الحلبی سبط ابن العجمی
یر متقید بکتاب العلائی
زاد علیھم قلیلاً فجمیع ما
کتاب العلائی من الاسماء
ثمانیة وستون نفسا وزاد
لیھم ابن العراقی ثلاثة عشر
فسا وزاد علیہ الحلبی اثنین
ثلاثین نفسا وزدت علیھما
سعةً وثلاثین نفسا فجملہ
ا فی کتابی ھذا مائة واثنان وخمسون نفسا[1]۔

متاخرین میں جن لوگوں نے مدلسین
کی تخریج کی ہے ان میں جلیل القدر
محدث برہان الدین الحلبی ہیں جنہوں
نے علائی کی پابندی نہیں کی،
علائی کی کتاب میں اسماء جن کی
تخریج ہوتی ہے ۶۸ ہیں ابن
عراقی نے اس پر ۱۳ ناموں کا
اور اضافہ کیا ہے حلبی نے ۳۲
نام اور ایزاد کئے ہیں، اور میں نے
ان پر ۳۹ نام اور بڑھائے ہیں، پس
میری کتاب میں کل ۱۵۲
نفوس کا تذکرہ ہے

یہ اتنی تحقیق آپ کو معلوم ہے کس چیز پر کی گئی ہے یہ وہ وضاعین کذابین
ہیں جو اس "جھوٹ اور کذب کے سیلاب میں شناوری کررہے ہوں، وہ بھی
نہیں ہیں، جن کا پیشہ حدیث کا گھڑنا ہے، وہ بھی نہیں ہیں جو اسرائیلیات کی اشاعت
رہے ہوں، وہ بھی نہیں ہیں جن کا وظیفہ حیات کذب و دروغ کی نشر و ترقی ہو،
یہ لوگ مدلسین ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو حدیث بیان کرتے ہیں، سلسلہ رواۃ
ان کرتے ہیں، لیکن اپنے شیخ کا معروف نام نہیں ظاہر کرتے، بلکہ غیر معروف نام
سے انتساب کرتے ہیں یہ ایک قسم کی تدلیس ہوئی، یہ کیسے ممکن تھا کہ اسماء الرجال کے

---

[1] کتاب طبقات المدلسین الابن حجر

وثمانين فقيل له ما تريد بهذا؟
فقال اريد الكذا بين؎

ہوا تھا؟ میں نے کہا ۲۸۱ھ میں
ان سے دریافت کیا گیا کہ آپکا اس سوا
کیا مطلب تھا؟ فرمایا میں کذابین کی نشا
اسی طرح کرتا ہوں۔

علامہ ابن حجر جو اساطین علم حدیث میں ہیں، فرماتے ہیں کہ

قد افرد اسماء المدلسين بالتصنيف
من القدماء الحسين بن علي
الكرابيسي صاحب الامام الاعظم
الشافعي - ثم النسائي، ثم الدار
قطني، ثم نظم شيخ شيوخنا
الحافظ شمس الدين الذهبي
في ذلك ارجوزة وتبعه بعض
تلامذته وهو الحافظ ابو
محمد احمد بن ابراهيم المقدسي
فزاد عليه من تصنيف العلائي
شيئاً كثيراً مما فات الذهبي
ذكره ثم ذيل شيخنا حافظ العصر
ابو الفضل بن الحسين في هوامش
كتاب العلائي اسماء وقعت له
زائدة ثم فيما ذيل العلامة قاضي
القضاة ولي الدين ابو زرعة

قدما کی تصانیف میں مدلسین کی جو
کی ہے ان میں حسین بن علی الکرابیسی
امام شافعی ہیں پھر نسائی پھر دار قط
پھر ہمارے استاذ الاساتذہ علامہ ذ
نے کچھ اضافہ کیا ہے پھر ان کے بعض تلا
نے اس باب میں ان کی پیروی کی، ان
حافظ ابو محمد احمد بن ابراہیم مقدس
ہیں، علائی نے اپنی تصنیف میں
تمام چیزیں ایزاد کیں جو علامہ ذ
سے رہ گئی تھیں پھر ہمارے استا
ابو الفضل بن حسین کا ذیل ہے
علائی کی کتاب کے حاشیہ میں زیاد
اسماء کا تذکرہ ہے پھر ان کے فرز
ارجمند علامہ قاضی القضاۃ ولی الدین
ابو زرعہ نے ان چیزوں کو شامل کیا ہے
جو علائی نے ذکر کی ہیں،

العلم ان جابر بن عبد الله رحل مسيرة شهر الى عبد الله بن انيس في حديث واحد[1]

ہو چنانچہ امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں کتاب العلم میں ذکر کیا ہے کہ جابر بن عبداللہ عبداللہ بن انیس کے پاس، ایک مہینہ کی مسافت طے کرکے صرف ایک حدیث کے لئے گئے

ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ خلفائے راشدین حدیث کے بارے میں بہت سست تھے، وہ خود بھی روایت بہت کم کرتے تھے، اور دوسروں کو بھی کم کرنے دیتے تھے، اور حضرت ابوہریرہؓ پر یہی اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ کثیر الروایۃ تھے، چنانچہ حضرت عمر نے انہیں کثرت روایت سے روکا بھی تھا، اس کی صفائی خود حضرت ابوہریرہ نے بایں الفاظ دی ہے کہ:-

ان الناس يقولون اكثر ابو هريرة ولولا آيتان في كتاب الله ما حدثت حديثا ثم يتلو (ان الذين يكتمون ما انزلنا من البينات والهدى والى قوله الرحيم) ان اخواننا من المهاجرين كان يشغلهم الصفق في الاسواق وان اخواننا من الانصار كان يشغلهم العمل في اموالهم وان ابا هريرة كان يلزم رسول الله بشبع بطنه ويحضر مالا يحضرون

لوگ کہتے ہیں ابوہریرہ کثیر الروایت ہے اگر دو آیتیں میرے پیش نظر نہ ہوتیں تو میں کبھی حدیث بیان نہ کرتا، (ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والهدیٰ تا الیٰ قوله الرحیم) ہمارے مہاجرین بھائی تجارت میں مشغول رہتے تھے ______

______ ہمارے انصار بھائی اپنے مال کی دیکھ بھال میں سرگرداں رہتے تھے لیکن ابوہریرہ رسول اللہ کا دامن پکڑے ہوئے تھا، کبھی آپ سے جدا نہیں ہوتا تھا، وہ اس وقت بھی

---

[1] توجیہ النظر صفحہ ۱۰

مبصرین کی نگاہ دور رس سے بچ جائے ان پر بھی کتابیں تصنیف ہوئیں، ان پ
اضافہ کیا گیا، ذیل لکھے گئے، اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان لوگوں کو منصۂ شہو
پر جلوہ گر کیا گیا، آپ خود غور فرما سکتے ہیں کہ مدلسین سے اتنا شغف کیا گیا
"وضاعین وکذابین کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا گیا ہوگا ان پر بھی دفتر کے دفتر سیاہ کیے
گئے، کتابیں لکھی گئیں، تاریخیں ضبط تحریر میں آئیں، اور بالآخر انہیں بے نقاب کرد
گیا، علامہ ذہبی کی میزان الاعتدال اور علامہ ابن حجر کی تہذیب التہذیب او
تقریب التہذیب اس پر شاہد عادل ہیں، امام بخاری، امام نسائی وغیرہ نے
مستقل تصنیفیں لکھیں جن میں، التاریخ الصغیر، کتاب الضعفا والمتروکین للبخاری
اور کتاب الضعفا والمتروکین للنسائی زیادہ قابل ذکر ہیں،

ان کتابوں میں اور اسماء الرجال کی دوسری کتابوں میں رواۃ پر مفصل
بحث ملے گی، ان کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی زندگی
کا ہر گوشہ بے نقاب کیا گیا ہے بخوف طوالت ان کتابوں میں سے کوئی تفصیلی
اقتباس نہیں پیش کرنا چاہتا ہوں، اگر ضرورت ہوئی تو کسی آئندہ موقع پر تفصیل سے
بہ عرض کیا جا سکتا ہے، کہ ان دفاتر میں کیا کیا ہے اور ہم حدیث کے حسن و قبح کی
جانچ پڑتال سے کس قدر فائدہ اٹھا سکتے ہیں، نیز یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ رواۃ حدیث
نے جمع حدیث میں کس قدر دقتیں اور مصیبتیں اٹھائی ہیں؟ طاہر جزائری پر مولانا
اسلم نے کافی اعتماد فرمایا ہے، وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے:-

قد کان للصحابة رضی الله عنهم
عناية شديدة فی معرفة الحديث
وفی نقله لمن لم يبلغه فقد
ذکر البخاری فی صحيحه فی کتاب

صحابہ رضی اللہ عنہم معرفت حدیث
میں بہت توجہ فرماتے تھے، اسی طرح
نقل و ضبط میں بھی خصوصاً اس حدیث
کے بارے میں جو کسی کو ابتک نہ پہنچی

"حضرت ابوبکر نے ایک مجموعہ احادیث بھی لکھا تھا جس میں تقریباً پانسو حدیثیں تھیں، مگر آخر میں اس کو حضرت عائشہ سے لے کر آگ میں جلا دیا کیونکہ ان کو خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ میں نے کسی کو معتبر سمجھ کر کوئی روایت اس سے لکھدی ہو اور درحقیقت وہ معتبر نہ ہو" (جامعہ صفحہ ۳۲۷)

خطوط کشیدہ الفاظ اس پر دال ہیں کہ یہ حضرت ابوبکر کا زیادہ سے زیادہ جذبہ احتیاط پسندی تھا، ورنہ حدیث کو قبول کرنے میں اگر اس کی صداقت ثابت ہوگئی ہو، انہوں نے کبھی انکار نہیں فرمایا، بلکہ اسے تسلیم کیا، اور نافذ کیا، چنانچہ اسی تذکرۃ الحفاظ میں جس سے مولانا نے یہ واقعہ نقل فرمایا ہے، غالباً اسی صفحہ پر اور اس نقل شدہ واقعہ کے ذکر سے پہلے ایک دوسرا واقعہ بھی مذکور ہے جو بہر حال ہمارے لئے قابل غور ہے کہ

وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے حدیث کے قبول کرنے میں سب سے پہلے احتیاط برتی، ابن شہاب قبیصہ بن ذویب سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت آئی جو "جدہ" کا حق طلب کرتی تھی، حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ قرآن مجید میں تو میں تیرے لئے کچھ نہیں پاتا، اور نہ یہ جانتا ہوں کہ رسول اللہ نے اس بارے میں کچھ فرمایا ہے، پھر آپ نے لوگوں سے دریافت	كان اول من احتاط في قبول الاخبار فروى ابن شهاب عن قبيصة بن ذويب ان الجدة جاءت الى ابي بكر تلتمس ان تورث فقال ما اجد لك في كتاب الله شيئاً وما علمت ان رسول الله ذكر لك شيئاً ثم سال الناس فقام المغيرة فقال سمعت رسول الله يعطيها السدس فقال له

حاضر رہتا تھا، جس وقت لوگ غ... ویحفظ ما لا یحفظون[1]۔
ہوتے تھے، وہ اسے بھی یاد رکھتا ...
لوگ نہیں یاد رکھتے تھے،

حضرت ابوہریرہ نے اپنی صفائی میں خود یہ الفاظ ارشاد فرمائے ...
اس جگہ یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے، کہ بعض صحابہ جو قلت روایت کے حا...
وہ ڈرتے تھے کہ

کہیں کثرت روایت سے غلطی نہ سر... اذا الاکثار مظنۃ للخطاء فی
اور حدیث میں غلطی ایک بہت بڑا خط... الحدیث عظیم الخطر[2]

برعکس اس کے حضرت ابوہریرہ قرآن شریف کی اس وعید سے ڈر...
تھے اور چاہتے تھے کہ جو کچھ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے وہ بیان کر...
تاکہ ان لوگوں میں نہ شمار کیا جاؤں، جو حق و ہدایت کو چھپاتے ہیں،
جہاں تک ان کا حافظہ ان کی اعانت کرتا تھا وہ حدیثیں بیان فرماتے...
اور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوتے تھے، لہٰذا یہ بات بالکل ...
اور باہر ہے کہ حضرت ابوہریرہ اور دوسرے جلیل القدر صحابہ کا اس...
میں اختلاف، اختلاف فی الاجتہاد کی حیثیت رکھتا تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ...
اختلاف مسلک امت کے لئے باعث رحمت ثابت ہوا، خلفائے راشد...
اور دوسرے صحابہ اگر اس میں اتنا تشدد آغاز کار ہی میں نہ کرتے، تو تق...
تلبیس و تدلیس کا دروازہ کھل جاتا، لیکن ابتدا ہی میں ان کی اس احتیا...
پسندی نے غور و تامل کے دروازے کھول دیئے اور اب جو قدم اٹھ...
تھا وہ سوچ سمجھ کر،

مولانا اسلم صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ

---

[1] توجیہ النظر صفحہ ۱۱ [2] توجیہ النظر

ن اباموسیٰ سلم علی عمر
ن وراء الباب ثلاث مرأت
لم یوذن له فرجع فارسل
عمر فی اثرہ فقال لم رجعت
ال سمعت رسول اللہ اذا
سلم احدکم ثلاثا فلم یجب
فلیرجع قال لتاتینی علی ذالك
بینة اولا فعلن بك فجاءنا
ابوموسیٰ منتقعا لونہ ونحن
جلوس فقلنا ماشانك فاخبرنا
فقال هل سمع احد منکم؟ فقلنا
نعم کلنا سمعه فارسلوا معه
رجلا منهم حتی اتی عمر
فـ خبرہ۔[1]

ابونضر سے اور وہ ابوسعید سے روایت کرتے ہیں کہ ابوموسیٰ نے دروازے کے پیچھے حضرت عمر کو تین بار سلام کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا تو وہ واپس آئے حضرت عمر نے انہیں بلوایا اور کہا کہ تم واپس کیوں گئے، انہوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ سنا ہے کہ تم میں سے جب کوئی تین بار سلام کرے اور جواب نہ ملے تو اسے واپس ہونا چاہیئے، حضرت عمر نے کہا کہ تمہیں اس قول پر دلیل لانا پڑے گی، ورنہ میں بری طرح پیش آؤنگا، تو ابوموسیٰ ہمارے پاس آئے چہرہ کا ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا، ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے ہم نے پوچھا کیا حال ہے؟ انہوں نے اپنے واقعہ سے مطلع کیا اور دریافت کیا کہ تم میں سے کسی نے اسے سنا ہے ہم نے کہا، ہاں ہم میں سے ہر شخص نے سنا ہے، تو ان کے ساتھ ایک آدمی کر دیا، اس نے حضرت عمر کو اس کی خبر دی،

علامہ ذہبی اس واقعہ پر ذیل کی رائے ظاہر فرماتے ہیں جو بڑی حد تک قابل قبول ہے کہ

احب عمر ان تیأکد عن خبر ابی
موسیٰ بقول صاحب اخر ففی

حضرت عمر یہ چاہتے تھے کہ ابوموسیٰ کی حدیث کسی دوسرے آدمی سے اور

---

[1] تذکرۃ الحفاظ

هل معك احد؟ دشهد محمد بن مسلمة بمثل ذالك فانفذ لها ابو بکر رضی الله عنہ[1]

کیا تو مغیرہ اٹھے اور کہا کہ میں نے رسول ا... سنا ہے وہ سدس عطا فرماتے تھے حض... ابو بکر نے پوچھا کوئی شاہد؟ محمد بن مسلمہ... شہادت دی تو آپ نے اسے نافذ فرما...

اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر اگرچہ محتاط تھے لیکن باینہ... اگر کوئی سچی حدیث انہیں مل گئی ہے تو انہوں نے اسے قبول کر لیا ہے... جب انہوں نے قبول کر لیا تو امت کیوں نہ قبول کرے گی؟ رہا صح... کا معیار سو ارباب نظر نے ایسے ایسے اصول وضع کر دیئے کہ اب احادیث ک... صداقت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنا چاہیئے، اس جگہ ایک "سخن گسترانہ... بات اور عرض کر دوں کہ مولانا نے حضرت ابو بکر کا جو واقعہ نقل فرمایا ہے، ک... انہوں نے احادیث کا ایک مجموعہ جلا دیا اس کو خود صاحب تذکرۃ الحفاظ... مراسیل میں شمار کیا ہے، اور مراسیل کا پایۂ استناد جتنا بلند ہے مولانا مجھ سے... زیادہ واقف ہیں،

حضرت عمر کا تشدد اس بارہ میں بہت زیادہ واضح ہے ایکبار کثرت... روایت پر وہ حضرت ابوہریرہ کو پیٹنے کی دھمکی بھی دے چکے ہیں لیکن اس کے... باوجود اگر ان کے معیار کے مطابق انہیں کوئی صحیح حدیث مل گئی ہے تو انہوں... بھی اسے تسلیم فرما لیا ہے، امام ذہبی حضرت عمر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

وهو الذی سن للمحدثين التثبت فی النقل ورکان متوقف فی خبر الواحد اذا ارتاب فروالحريری عن ابی نضرۃ عن ابی سعيد

حضرت عمر وہ بزرگ ہیں جنہوں نے... محدثین کے لئے تثبت فی النقل لاز... کر دیا اگر آپ کو شک ہوتا تو خبر واح... میں کبھی کبھی آپ تامل فرماتے، جریری...

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، امام ذہبی، ذکر ابی بکر

بن شعبة ان عمر استشار هم فی املاص المرأة یعنی السقط فقال لہ المغیرة قضی فیہ رسول اللہ بغرة فقال لہ عمر ان کنت صادقاً فات احد العلم ذالک قال فشهد محمد بن مسلم ان رسول اللہ قضی بہ[1] .

روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے سقط کے بارے میں مشورہ کیا، تو مغیرہ نے کہا کہ رسول نے ایک لونڈی کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے تو حضرت عمر نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دوسرا آدمی لاؤ جو اس سے واقف ہو، محمد بن مسلم نے شہادت دی کہ رسول اللہ نے ایسا فیصلہ کیا تھا

آگے چل کر دوسرا واقعہ پیش کیا جاتا ہے اس میں حضرت عمر نے اپنا مسلک اور واضح کر دیا ہے کہ جب حضرت عمر نے مسجد کی توسیع کے لئے حضرت عباس سے ان کی زمین چاہی تو انہوں نے انکار کیا اور حدیث بیان کی کہ تم زیادتی نہیں کر سکتے، تو حضرت عمر نے کہا کہ اس پر دلیل لاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا، پس انہوں نے ایک جماعت انصار سے اس کا تذکرہ کیا۔ انصار نے حضرت عمر سے تصدیق کی کہ ہاں یہ حدیث صحیح ہے پھر حضرت عمر نے فرمایا کہ

انی لم اتهمك ولکنی احببت ان اتثبت[1]

میں تمہیں غیر معتبر نہیں سمجھتا، لیکن یہ چاہتا تھا کہ حدیث ثابت ہو جائے ۔

اسی طرح حضرت علیؓ بھی پورے اطمینان کے بعد حدیث قبول فرماتے تھے، یہاں تک کہ وہ تو

انہ یستحلف من یحدثہ بالحدیث[2]

جو شخص حدیث بیان کرتا تھا، اس سے قسم لے لیتے تھے،

طاہر جزائری نے حضرت ابو بکر کے اس واقعہ پر جب آپ نے سدس دلایا

---

[1] تذکرة الحفاظ ۔ [2] تذکرة الحفاظ

هذا دليل على ان الخبر اذا
رواه ثقتان كان اقوى وارجح
مما انفرد به واحد، وفي ذالك
حض على تكثير طرق الحديث
لكي نفي عن درجة الظن الى
درجة العلم اولو احد ايجوز
عليه النسيان، والوهم ولا
يكاد نحو ذالك على ثقتين لم
يخالفهما احد وقد كان عمر
من وجل بخطى الصاحب على
رسول الله يامرهم ان يقلو
الرواية عن نبيهم ولئلا
يتشاغل الناس بالاحاديث

زیادہ موکد ہوجائے، اس سے
ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کو
ثقہ آدمی روایت کریں تو وہ بہت
زیادہ اقوی اور ارجح ہوجاتا ہے
بنسبت اس کے کہ منفرداً کسی شخص نے روایت
کی گئی ہو اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے
حضرت عمر طرق حدیث کی کثرت کی طرف
لوگوں کو مائل کرنا چاہتے تھے، تاکہ حدیث
درجہ ظن سے درجہ علم تک پہنچ جائے کیونکہ
ایک آدمی کے لئے یہ ممکن ہے کہ اس پر نسیان
و وہم کا غلبہ ہو اور جب دو ثقہ آدمی روایت
کریں تو یہ اندیشہ کم ہوجاتا ہے، حضرت
عمر اس سے ڈرتے رہتے تھے کہ بیان حدیث
میں کوئی خطا سرزد ہوجائے انہوں نے
حکم دے رکھا تھا کہ روایتہ کم کی جائے تاکہ
لوگ حفظ حدیث سے غافل نہ ہوجائیں

علامہ ذہبی نے جو رائے ظاہر فرمائی ہے وہ بہت صحیح ہے اور یہی وہ جذبہ احتیاط پسندی تھا کہ جس سے حضرت عمر قلت روایت اور کثرت رعاۃ کو پسند فرماتے تھے، اور جب ایسا ہوتا تھا، تو بلا تامل وہ حدیث کو تسلیم کرلیتے تھے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے کہ

روی هشام من ابیه المغیرہ — ہشام اپنے والد مغیرہ بن شعبہ سے

۱؎ تذکرۃ الحفاظ۔

"صحابۂ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو، اور جو کچھ کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو اس کو مٹا ڈالو" (جامعہ صفحہ ۳۲۶)

تو جس کتاب سے مولانا نے یہ حدیث لی ہے اسی کتاب میں یہ حدیث بھی ملتی ہے کہ

عن ابن جریج عن عطا عن عبد اللہ بن عمرو قال قلت یا رسول اللہ اقید العلم؟ قال نعم قال وما تقییدہ قال کتابتہ۔

ابن عمر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ سے پوچھا کہ کیا علم قید کیا جا سکتا ہے فرمایا، ہاں میں نے پوچھا اس کی تقیید کیا ہے، فرمایا، کتابت،

و

اور

عن حماد بن سلمۃ عن محمد بن اسحٰق عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہٖ قال قلت یا رسول اللہ اکتب ما اسمع منک؟ قال نعم، قلت فی الرضا والغضب قال نعم فانی لا اقول فی ذالک کلہ الا بالحق،

حماد بن سلم محمد بن اسحاق وعمر بن شعیب وہ اپنے والد سے وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ سے پوچھا کہ میں وہ سب کچھ لکھ لیا کروں، جو آپ سے سنوں، فرمایا، ہاں! انہوں نے کہا کہ آپ خوشی سے فرماتے ہیں یا غصہ سے؟ فرمایا سوا سچ کے میں اور کچھ نہیں کہتا،

اور سب سے بڑھکر بخاری کی یہ حدیث کہ

عن ابی ھریرۃ انہ قال ما

ابوہریرہ کہتے ہیں کہ اصحاب رسول میں

تھا، بہت عمدہ بات لکھی ہے کہ

الاتراہ لما نزل بہ امر الحدۃ ولم یجدہ فی الکتاب کیف سال عنہ فی السنن فلما اخبرہ الثقۃ لم یکتف حتی استظہر بثقۃ اخر ولم یقل حسبنا کتاب اللہ کما تقولہ الخوارج[1]

کیاتم اسے نہیں دیکھتے کہ اس ع
والے واقعہ میں جب حضرت ا
نے قرآن میں اس کے متعلق کچھ
پایا، تو اس بارے میں سنن و حد
کی طرف توجہ کی، اور جب ثق
حدیث بیان کی تو آپ نے صرف
پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ ایک دو
ثقہ سے اسے موکد کر لیا اور یہ
کہا کہ ہمارے لئے تو "کتاب اللہ"
ہے، جیسا کہ خوارج کہا کرتے تھے

اور حضرت ابوبکر یہ فرما کیسے سکتے تھے جب کہ ان کے سامنے یہ بھی تھ

فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون (قرآن مجید) — اگر تم کوئی چیز نہ جانتے ہو تو "اہل ذکر" سے دریافت کرو،

اور اہل ذکر ان سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا تھا، جنہوں نے ایک ا
حدیث کے لئے دور دراز کی مسافتیں طے کیں، طرح طرح کے مصائب دا
کئے، آفات و حوادث کا مقابلہ کیا، فاقے کئے، لتے باندھے راستے کی لالٹینو
میں پڑھا، مسجد کے چراغ میں پڑھا غرض اس نام سے جو مصیبت آئی ا
انگیز کیا، صرف اس لئے کہ اقوال رسول مدون ہو جائیں ارشاد رسول منض
ہو جائیں اور سرکار رسالت کا کوئی فعل اور قول پردہ خفا میں نہ رہے
اور مولانا نے جو فرمایا کہ

---

[1] توجیہ النظر صفحہ ۱۲۔

من احد من اصحاب النبي
اكثر حديثا عنه مني الا ما
كان من عبد الله بن عمرو فانه
كان يكتب وانا لا اكتب

باعتبار علم حدیث کے کوئی
سے زیادہ نہیں ہے، سوا ابن
کے اس لئے کہ وہ لکھ لیتے تھے
سنتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا

اگر ایک حدیث کتابت حدیث کی مخالفت میں ہو تو ایک سے زائد ا
تائید میں ہیں، یہ تناقض اور تباین کیونکر رفع ہو؟ اور ان میں سے
پر صحیح سمجھا جائے، اور کسے ناقابل عمل، اس کا جواب بجائے اس کے کہ میں ا
طرف سے کچھ دوں مناسب ہوگا کہ اسی کتاب سے دوں، جس کی بعض با
سے "وضع حدیث" کے نتائج اخذ کئے گئے ہیں، کہ

قال ابو محمد ونحن نقول ان في
هذا معنيين احدهما ان يكون
من منسوخ السنة بالسنة
كانه نهى في اول الامر ان يكتب
قوله ثم رأى بعد لما علم ان
السنن تكثر وتفوت الحفظ
ان تكتب وتقيد والمعنى
الآخر ان يكون خص بهذا عبد
الله بن عمرو لانه كان قارئا
لكتب المتقدمة ويكتب
بالسريانية والعربية وكان
غيره من الصحابة اميين

ابو محمد کا اور خود ہمارا بھی یہی خیـ
ہے کہ اس باب میں جمع قول کی
رفع تناقض وتخالف کی دو صورتیں
ہیں پہلی تو یہ کہ سنت سنت سے منسو
ہو گویا یوں ہوا کہ پہلی بار رسول
اللہ نے اس سے منع فرمایا کہ آپ
کے اقوال ضبط تحریر میں آئیں، ا
کے بعد جب آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ
سنن کی کثرت ہو رہی ہے، ممکن
ہے یہ چیزیں حافظہ سے نکل جائیں
لہٰذا انہیں لکھ لیا جائے اور نقل کر
جائے اور دوسری صورت یہ ہے

يكتب منهم الا الواحد اذا كتب لم يتقن ولم يصب الهجى فلما خشى عليهم الغلط فيما يكتبون نهاهم ولما امن على عبد الله بن عمرو ذالك اذن له ۔[1]

کہ یہ حکم عبداللہ بن عمرو کے لئے مخصوص ہوا اس لئے کہ وہ کتب قدیمہ کے عالم تھے، سریانی اور عربی لکھنا جانتے تھے، ان کے علاوہ جو صحابہ تھے وہ باستثنا چند امی محض تھے، اس لئے ان کی کتابت میں یہ خطرہ ہوا کہ ممکن ہے کچھ غلطی ہو جائے، لہٰذا کتابت سے منع فرمایا، لیکن جب انہیں یقین ہو گیا۔ کہ اب ایسا نہیں ہو گا تو اجازت دے دی۔

اب آپ کے سامنے دونوں حدیثیں اور دونوں صورتیں آگئیں کہ اگر سرکار رسالت نے منع بھی فرمایا تو بہ مصالح اور جب وہ مصالح رفع ہو گئے تو خود ہی کتابت کی اجازت دیدی، اب اس میں نہ کوئی تناقض ہے نہ تباین نہ تخالف اور اس کی مزید توثیق حضرت ابوہریرہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے، جس میں انہوں نے عبداللہ بن عمر کو اپنے سے زیادہ عالم بالحدیث اس بنا پہ تسلیم کیا ہے، کہ وہ حدیث لکھ لیا کرتے تھے اور یہ نہیں لکھتے تھے، اور ظاہر ہے یہ فعل کتابت رسول اللہ کی زندگی ہی میں ہوتا تھا،

لہٰذا جب احادیث و سنن کی کثرت ہوئی اور یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ انسانی حافظہ میں محفوظ رہ سکیں، تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے (جن کا زہد و ورع، علم و دیانت، راستبازی، اور حق پسندی، انصاف و معدلت، خشیۃ فی اللہ، اور استقامت علی الحق، کا ہر فرد و بشر معترف ہے اور انہیں اسباب کی بنا پر دنیا انہیں ثانی "عمر بن الخطاب" کے نام سے یاد کرتی ہے) کتابت حدیث کا حکم

---

[1] توجیہ النظر

دیا، اس کی جمع وتدوین کی کوشش کی، اس کے ضبط واشاعت کے احکام صا
فرمائے، خدا ان پر اپنی بے شمار رحمت نازل فرمائے کہ ان کی ایک بدعت ح
امت اسلامیہ کو الیسا خیر کثیر دیا۔ کہ جب تک اس صفحۂ ارض پر مسلمانوں کا وجود ہے
وقت تک ہر مسلمان ان کی ان ساعی حسنہ کا مشکور ہوگا، کتابت حدیث کی تائی
ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں، لیکن قبل اس کے کہ میں اس پر کچھ گذا
کروں ایک بات پیش نظر رہنی ضروری، مولانا نے فرمایا ہے کہ

لا تکتبوا عنی غیر القرآن	مجھ سے سوائے قرآن کے اور
ومن کتب عنی شیئًا فلیمحہ	نہ لکھو، اور جو کسی نے قرآن
(حدیث)	سوا کچھ لکھا ہو تو مٹا ڈالے،

لیکن پوری حدیث یوں ہے، جسے مسلم نے تخریج کیا ہے کہ

لا تکتبوا عنی غیر القرآن	مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لک
ومن کتب عنی شیئا غیرہ	اور جو کسی نے قرآن کے سوا کچھ لکھا
فلیمحہ وحدثوا عنی	تو مٹا ڈالے، ہاں مجھ سے حدیث بیا
فلا حرج	کرو اس میں کوئی حرج نہیں،

اور اس کے معًا بعد ارشاد ہوا کہ

ومن کذب علی متعمدًا فلیتبوأ	جس نے جان بوجھ کر میرے متعلق غلط بیا
مقعدہ من النار	کی اسے چاہیے کہ وہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنا

اور اس کے بعد طاہر جزائری فرماتے ہیں کہ

قال کثیر من العلماء نهاهم عن	بہت سے علماء کا یہ خیال ہے کہ کتابت
کتابة الحدیث خشیة اختلاطه	حدیث سے اس لئے منع فرمایا، کہ
بالقرآن، وهذا الاینافی جوازہ	قرآن مجید اور حدیث میں اختلا

تابۃ اذا امن اللبس وبذا
ت یحصل الجمع بین ھذا
وبین قولہ علیہ الصلوٰۃ
والتسلیم فی مرضہ الذی
توفی فیہ ایتونی بکتاب اکتب
لکم کتابا لا تضلوا
بعدہٗ ۔

نہ ہو جائے اور یہ ممانعت جواز
کتابت کے منافی نہیں ہے جبکہ لبس
واختلاط کا اندیشہ نہ رہے اور اس خیال کو
مزید تقویت یوں ہوئی ہے کہ اپنے مرض
الموت میں خود رسول اللہ نے کاغذ منگایا
کہ میں تمہارے لئے ایسی چیز لکھدوں کہ
تم اس کے بعد گمراہ نہ ہو سکو،

طاہر جزائری کی ان تصریحات کے بعد یہ معاملہ اور زیادہ مستحکم ہو گیا ہے اور حالات و واقعات بھی اس کی تائید کرتے ہیں، کہ لبس فی القرآن کے خوف سے منع فرمایا گیا اور جب یہ اندیشہ رفع ہو گیا، تو ظاہر ہے پھر کسی قدغن کی ضرورت نہ تھی،

ایک جگہ مولانا نے فرمایا ہے کہ

"جملہ اصولیین اور محدثین نے صحیح سے صحیح حدیث کی صحت کو بھی ظنی مانا ہے، یقینی نہیں کہا ہے، بجز متواتر کے جس کے وجود ہی میں بحث ہے، انہوں نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں، مثلاً قوی، صحیح، حسن، مقبول، یا ضعیف، منکر، موضوع، اور مردود، ان سے خود ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے، ورنہ روایت کی دو ہی صورتیں ہیں، صحیح یا غلط" (جامعہ، صفحہ ۲۳۶)

میں مولانا کے اس قول سے بھی اختلاف کرنے کی جرأت کرتا ہوں، محدثین نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں، مثلاً ضعیف، موضوع، منکر، مردود، صحیح، حسن، مقبول، وغیرہ" ان سے خود" یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ" وہ کسی یقینی

ب وہی "زید"، جو نہایت کذاب، مفتری، دروغ گو، اور بد باطن شخص" ہے
پ کے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ" فلاں بزرگ فرماتے تھے کہ جب کھانا
یا کرو تو بسم اللہ کر لیا کرو" اب آپ اس کے بارے میں کیا ارشاد فرمائیں گے،
س کے اس قول کو جھوٹا سمجھیں گے یا سچا؟ لامحالا آپ کو زید کو نہیں بلکہ زید کی
س بات کو سچ سمجھنا پڑے گا بس یہی متابعات کی کیفیت ہے کہ چونکہ وہ متواتر
حدیث کی متابعت میں ہوتی ہیں، اس لئے انہیں صحیح سمجھا جاتا ہے،

یہ جھگڑا تو خیر رواۃ کے متعلق تھا کہ حدیث کی بعض کتابوں میں سلسلۂ
رواۃ ذرا طویل ہوتا ہے، لیکن ایسی کتابیں بھی ہیں جن میں اس قسم کا کوئی جھگڑا
ہی نہیں ہے، مثلاً موطا امام مالک اکثر و بیشتر وہ تین چار واسطوں سے رسول
اللہ تک پہنچتے ہیں، مثلاً مالک، عن نافع، عن ابن عمر، عن النبیؐ امام مالک کی
صداقت و دیانت میں جمہور امت کو اتفاق ہے، نافع ابن عمر کے مولیٰ ہیں،
ان پر کبھی زبان طعن دراز نہیں ہو سکتی، خود ابن عمرؓ وہ ہیں کہ جن کے زہد اور شغف
فی السنت کا سارا زمانہ قائل ہے، خود سرکار رسالتؐ کے دربار سے خوشنودی
مزاج کا تمغہ انہیں مل چکا ہے، ان کے بعد نبی کریمؐ ہیں، اس سلسلۂ رواۃ کو محدثین
کرام "سلسلۃ الذہب" کہتے ہیں، لہٰذا ان "سچائی کے قطروں" کو تو" اس
جھوٹ اور کذب کے سیلاب" سے الگ رکھنا ہی پڑے گا۔

(جامعہ - اگست ۳۱ء)

فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے" بلکہ ان سے "صرف یہ ظاہر ہوتا ہے" کہ مثلاً محدثین
حدیث متواتر کو قطعی اور یقینی مانتے ہیں تو ایک حدیث ہے جو اپنے شرائط کے
اعتبار سے متواتر ہے لیکن چند "موضوع، منکر اور ضعیف" حدیثیں بھی ہیں جو اس
حدیث متواتر کی تائید کرتی ہیں، تو ہم ان کو باصطلاح محدثین متابعات میں داخل
کریں گے، یعنی کسی "موضوع، منکر اور ضعیف" حدیث سے ہم استناد نہیں
کریں گے، لیکن اگر وہ کسی "صحیح، مشہور، اور متواتر" حدیث کی تائید کرتی ہوں
تو ان سچی حدیثوں کی صحت کی پایۂ یقین تک پہنچ جائے گی، چنانچہ بخاری کی بعض
بعض ضعیف رواۃ پائے جاتے ہیں، یا علامہ ابن جوزی نے "صحیحین" کی بعض
حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے" تو اس کا نہایت صاف واضح اور غیرمشتبہ
جواب یہی ہے کہ وہ حدیثیں، یا وہ رواۃ متابعات کے تحت ہیں ہیں نہ کہ
مسئلہ پر احتجاج کے لئے اور اس طریقہ پر ان رواۃ یا احادیث پر اعتماد کرنے میں
کوئی قباحت نہیں ہے، مثلاً زید ایک نہایت کذاب، مفتری، دروغ گو، اور
بدباطن شخص ہے، وہ آپ سے کہتا ہے کہ فلاں بزرگ فرماتے تھے کہ جب کھانا
کرو تو بسم اللہ کر لیا کرو، آپ بلاتامل کہہ سکتے ہیں، کہ تو دروغ گو ہے، ہمیں
تیرا اعتماد نہیں، لیکن عمرو، بکر، خالد، کی صداقت، دیانت، راست بازی
تقویٰ، پاکبازی آپ کے نزدیک مسلم ہے، غیر مشتبہ ہے، آپ نے انہیں محاسن
سوا معائب کبھی نہ دیکھے نہ سنے، سوا اللہ کے غیر اللہ سے انہیں مرعوب و مت
ہوتے آپ نے کبھی نہ دیکھا جھوٹ بولتے کبھی نہ سنا، غرض آپ کو ان پر پورا
اعتماد ہے وہ آپ سے کہتے ہیں کہ "فلاں بزرگ فرماتے تھے کہ جب کھانا کھایا کرو
بسم اللہ کر لیا کرو" اب آپ یقیناً بلا پس و پیش ان کی بات پر اعتماد کریں گے
اور تسلیم کریں گے، کہ انہوں نے جو کچھ کہا سچ کہا، ان لوگوں کے کہنے کے بعد

رسول کی اس کے حکم کے سبب کہ اللہ نے بجز قرآن
صرف رسول کی اتباع بتائی۔

اس رفع غلط فہمی کے بعد، منکرین حدیث کے خیالات و دلائل اور ان کے [جو]ابات بترتیب پیش کئے جاتے ہیں، پہلا اعتراض منکرین حدیث کا یہ ہے کہ

"سارے قرآن میں شروع سے آخر تک کتاب اللہ کے سوا کسی سنت اور اور کسی حدیث پر ایمان رکھنے کا مطلق حکم نہیں ہے، فبای حدیث بعدہ یومنون اس قرآن کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائیں گے؟ فبای حدیث بعد اللہ وآیاتہ یومنون، اللہ اور اسکی آیتوں کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائیں گے، زیادہ تصریح اس آیت میں ہے، ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ بغیر علم ویتخذھا ھزواً اولٓئک لھم عذاب مھین۔ بعض آدمی وہ ہیں، جو خریدار ہوتے ہیں، حدیث کے مشغلہ کے تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں بلا علم کے اور اس کو مذاق بنالیں، یہ لوگ ہیں جن کے لئے خوار کرنے والا عذاب ہے، اس آیت میں "لہو الحدیث" کی تفسیر ائمہ حدیث نے غنا کی ہے، مجھے تعجب ہے کہ پھر اللہ کو غنا کہنے میں کیا دشواری تھی"۔

یہ ہے پہلی دلیل کا خلاصہ، جسے میں نے بعینہٖ نقل کر دیا ہے، غالباً [محت]رم مقالہ نگار بھی اس باب میں متفق ہوں کہ اس دلیل میں منکرین حدیث [ن]ے حد درجہ تدلیس وتلبیس سے کام لیا ہے، پہلے یہ دعوی کرنا کہ قرآن کے [عل]اوہ کسی سنت اور کسی حدیث کی پیروی کا حکم نہیں ہے، بلکہ ممانعت ہے، [پھ]ر "فبای حدیث بعدہ یومنون" اور اسی قسم کی دوسری آیات میں

انکارِ حدیث

ستمبر کے جامعہ میں ایک مضمون "منکرین حدیث" کے عنوان سے شا
ہوا ہے، میں اپنے استاذ، پروفیسر سید عابد حسین صاحب مدیر جامعہ کا شکرگ
ہوں کہ انہوں نے مجھے موقع مرحمت فرمایا کہ میں بھی اس موضوع پر کچھ عر
کرسکوں،

لیکن قبل اس کے کہ اصل بحث پر گفتگو کا آغاز کیا جائے، یہ عرض کرد
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون میں مخاطب محترم مقالہ نگار نہیں ہیں، بلک
"منکرین حدیث" ہیں جن کی موصوف نے ترجمانی فرمائی ہے،

منکرین حدیث کا خیال ہے کہ

"جب سے حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی ہے، اسی وقت سے اہل
علم کی ایک جماعت ایسی ہوتی چلی آئی ہے، جو اس کی دینی حیثیت کی منکر
رہی،"

سب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ اس غلط فہمی کی تصحیح کردی جا
امام شافعی فرماتے ہیں کہ

لم أسمع احدا انسبه الناس	
اونسب نفسه الى علم يخالف	مجھے کسی ایسے شخص کا علم نہیں، ج
فى ان فرض الله عزوجل اتباع	لوگ اہل علم کہتے ہوں یا وہ خود اپنے
عزوجل لم يجعل لمن بعده	اہل علم سمجھتا ہو اور اس کی مخالفت کر
الا اتباعه۔[1]	کہ اللہ نے کہا ہے کہ اطاعت کی جائے

[1] کتاب الام ج ۷ ص ۲۵۰

معقول ہے کہ اگر اس جگہ حسب خیال مفسرین "غنا" مراد تھا تو اللہ کو غنا
کہنے میں کیا دشواری تھی؟ اس کا جواب بجائے اس کے کہ میں حدیث و
روایت سے دوں، بہتر ہے کہ قرآن مجید سے دوں آیت قرآنی ہے،

واعبد ربک حتیٰ یاتیک الیقین، — جب تک تمہیں موت نہ آجائے اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو،

اس جگہ "یقین" کے معنی "موت" کے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
زمانہ سے منکرین حدیث کے موجودہ زمانہ تک سب اس کے معنی یہی سمجھ
رہے ہیں، خود منکرین حدیث بھی، یہ کوئی نہیں کہتا کہ

واعبد ربک حتیٰ یاتیک الیقین، — جب تک تمہیں یقین نہ آجائے اس وقت تک عبادت کرو،

اور اس کے بعد چھوڑ دو، تو اگر اس جگہ یقین کے معنی "موت" کے ہیں،
تو آخر خدا کو کیا دشواری تھی کہ "موت" کہہ دیتا؟ "یقین" کہہ کے خواہ مخواہ
لوگوں کو شبہ میں ڈالنے کے کیا معنی؟

"جواب بالکل "ظاہر و باہر" ہے قرآن مجید کا ایک خاص پیرایہ بیان ہے۔
ادائیگی مفہوم کے لئے حسب موقع جو کنایہ، جو استعارہ، جو تشبیہ سب سے زیادہ بلیغ
اور مؤثر ہوتی ہے، وہ لائی جاتی ہے، اس پر اعتراض کرنا، کہ اس جگہ یہ کیوں ہے
اور وہ کیوں نہیں، کوئی بہتر طریق معارضہ نہیں،

آگے چل کر کہا گیا ہے کہ

"کیا جن حدیثوں کو تم نے تسلیم کیا ہے ان پر کوئی آسمانی مہر ہے یا خود
رسول اللہ کے سامنے پیش کر کے ان تصدیق کی ہے؟ پھر کسطرح انہیں
جزو ایمان یا واجب التسلیم کہنے کا حق رکھتے ہو"؟

"حدیث" کا ترجمہ "حدیث" کرنا اتنی بڑی بددیانتی ہے کہ علمائے جرح وتعدیل، اور ائمہ نقد وبحث نے ایسی تلبیس مبین کے لئے کوئی لفظ ہی وضع کیا،

عربی کا ہر ابجد خواں جانتا ہے، اور یقیناً منکرین حدیث کا ہر فرد جانتا ہے، کہ حدیث کے معنی "بات" کے ہیں اور اس جگہ یہی معنی مراد ہیں اگر فن حدیث مراد ہوتا تو اس کے ذکر کا اس جگہ موقع کیا تھا کیا جب حضور سرور کائنات قرآن مجید پیش فرماتے، تو لوگ یہ کہتے تھے کہ حدیث قرآن سے اولیٰ وافضل ہے، آپ قرآن کی دعوت کیوں دیتے ہیں "حدیث" کی دعوت دیجئے تو ہم قبول کریں؟

ہر شخص کو معلوم ہے کہ یہاں مخاطب کفار ومشرکین ہیں کہ خدا کی لا... ہوئی نشانیوں کے باوجود، قرآن کے اعجاز اور رسول کی غیر مشتبہ صدا... کے باوجود کفر وشرک کے معائب ونقائص معلوم کر لینے کے باوجود، اگر... پر نہیں، تو آخر

فبای حدیث بعدہ یومنون ‏ وہ لوگ اور کس بات پر ایمان لائیں

اور کہا یہ جا رہا ہے کہ اس آیت سے اتباع حدیث کی ممانعت ... ہے، محترم مقالہ نگار نے یقیناً بیجا رواداری سے کام لیا، کہ منکرین حدیث کی اس تلبیس کو یوں ہی درج مضمون فرما دیا، مولانا کو فٹ نوٹ میں اس دجل وفریب کا پردہ فاش کر دینا چاہئے تھا،

"لہو الحدیث" والی آیت کے ترجمہ میں بھی منکرین حدیث نے ا... طرح اپنے "فہم قرآن" کا نہایت نادر نمونہ پیش کیا ہے، جودت فہم اور سخن... عالم بالا کا منکرین اگر یہی ثبوت پیش کرتے رہے تو "معلوم شد" اور دلیل ک...

...د تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں، ہمارے لئے کتاب اللہ اور
...سنت رسول کافی ہے، حضور خاموش ہو جاتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ قرآن
...ہیں تھا، جس کے متعلق حضور کچھ تحریر فرماتے، اس لئے کہ اس کی تو آپ نے
...بھر تبلیغ کی تھی، اس کے تو حفاظ موجود تھے اور یہ پورے طور سے شائع
...ہو چکا تھا، اس لئے اس کے متعلق کسی ہدایت کی ضرورت نہ تھی، معلوم ہوتا
...ہے کوئی دوسری چیز بھی تھی، جس کے اوپر ہدایت کا انحصار تھا، قرآن سے
...ہدایت بے شبہ ہوتی تھی، لیکن اس ہدایت کا تکملہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا
...تھا جب تک حضور کوئی دوسری چیز تحریر نہ فرماتے، لیکن حضرت عمرؓ نے جب
...فرمایا کہ ہمارے لئے کتاب و سنت کافی ہے، تو حضور خاموش ہو رہے، گویا
...آپ نے اس سے اتفاق فرمایا، اس سے ثابت ہوا کہ جو چیز آپ تحریر فرمانا چاہتے
...تھے، وہ سنت نبویؐ ہی تھی، حضور انورؐ کی وفات کے بعد ہی جب انعقاد حکومت
...ہونے لگا، اور حضرت صدیقؓ نے انصار کے جواب میں حدیث پڑھی، کہ خلافت
...قریش کا حق ہے، تو ہزارہا صحابہ میں سے کسی کی زبان سے یہ نکلا، کہ حدیث
...کو احکام دین سے کیا تعلق؟

جس قرآن کی مقالہ نگار صاحب تلاوت کرتے ہیں، خدا معلوم اس میں آیات
...ذیل بھی ہیں یا نہیں؟ (ومن اصدق من اللہ حدیثا (اللہ سے بڑھ کر سچی
...حدیث "بیان کرنے والا اور کون ہے) واما بنعمۃ ربک فحدث
...(اپنے رب کی نعمتوں کی "حدیثیں" بیان کرتے رہو) افبھذا الحدیث
...انتم مدھنون (اے کافرو کیا تم اس "حدیث" کو سرسری بات سمجھتے ہو؟)
...فذرنی ومن یکذب بھذا الحدیث (اب چھوڑ دو ہم کو اور اس "حدیث"
...کے منکر کو) اللہ نزل احسن الحدیث (اللہ نے اپنی بہتر سے بہتر "حدیث

جواب اثبات میں ہے، جن حدیثوں کو ہم نے تسلیم کیا ہے، ان پر
یقیناً ہے، اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ رسول کے حکم کے مطابق ہم
عمل کرتے ہیں، آسمانی مہر نوشتہ ہے کہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ	تمہارے لیے رسول ایک اچھ
اسوۃ حسنۃ وما ینطق عن	ہے رسول اپنی طرف سے کچھ نہیں کہت
الھوی ان ھو الا وحی یوحی	وہ جو کہتا ہے وہ وحی کیا ہوا ہوتا

اور

ما اتاکم الرسول فخذوہ وما	رسول جو کچھ دے اس کو لے
نھاکم عنہ فانتھوا	سے منع کرے باز رہو،

وازیں قبیل بہت سی آیتیں ہیں جن میں حکم رسول کی اطاعت فرض
ہے۔ اور ظاہر ہے قرآن مجید کی تعبیر و تفسیر میں احکام رسول وارد ہیں، س
رسول موجود ہے، تو اسے ترک کیونکر کیا جا سکتا ہے جبکہ خود رسول اللہ
تاکید فرماتے ہیں، کہ میری سنت کو پکڑے رہنا کبھی گمراہ نہیں ہوگے، ح
راشدین میں جو شخص سریر آرائے خلافت ہوتا ہے جمہور امت کے سامنے اع
کرتا ہے، کہ میں کتاب اللہ کو دلیل راہ بناؤں گا، سنت رسول کو چراغ ہدا
سمجھوں گا، اگر اس میں کوتاہی کروں، تو مجھ سے مواخذہ کرنا، تو آخر وہ کونسی س
تھی جس کی پیروی کا اعلان ہو رہا ہے، جس کی اتباع کا دم بھرا جا رہا ہے لا مح
ماننا پڑے گا، کہ وہ ہی سنت، جو خلف سے سلف تک پہونچی ہے، جس کے متع
ثابت ہے کہ رسول اللہ نے ایسا کیا، جس کے متعلق خود رسول نے کہا،

علیکم بسنتی — تم پر میری سنت واجب ہے،

وقت آخر رسول اللہ قلم دوات مانگتے ہیں کہ تمہیں ایسی چیز لکھ دوں جس

وی ہے۔ اس پر ذہبی نے تذکرہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب قرآن میں حضرت ابوبکر نے کچھ نہیں پایا تو سنن کی جستجو فرمائی اور جب ثقہ سے خبر مل گئی، تو آپ نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک دوسرے ثقہ سے اس کی تصدیق کی اور نافذ کرایا، خوارج کی طرح یہ نہیں کہا کہ ہمارے لئے کتاب اللہ کافی ہے[1]

اسی طرح حضرت عمر بھی قلت روایت اور کثرت طرق کے حامی تھے چنانچہ حضرت عباس کی زمین والے واقعہ میں شہادت لی، ویسا ہی فیصلہ کیا، جیسا حدیث کے مطابق ہونا چاہیئے تھا، اور پھر خود ہی فرما دیا، کہ میں تمہیں جھوٹا نہیں سمجھتا ہوں، صرف تاکید مقصود تھی[2]

خود رسول اللہ کے زمانے میں بھی "حدیث" کی تاریخی "حیثیت" نہیں تھی، بلکہ "دینی" حیثیت تھی، رسول اللہ نے جب معاذ بن جبل کو یمن بھیجا ہے تو فرمایا کہ اگر تمہارے پاس کوئی مقدمہ آیا تو کس طرح فیصلہ کرو گے کہا، کتاب اللہ سے، فرمایا، اگر کتاب میں نہ ملے تو؟ کہا، سنت رسول سے، فرمایا، اگر اس میں بھی نہ ہو تب؟ کہا تب میں اپنی رائے سے کام لونگا[1]۔ اس پر رسول اللہ کے خوش ہونے کے کیا معنی؟

حضرت ابن عمر کا یہ واقعہ بھی خاصی حیثیت رکھتا ہے۔

حدثنا سلیمان بن حرب عن	سلیمان بن حرب ایوب سے وہ نافع سے
ایوب عن نافع عن ابن عمر	بیان کرتے ہیں، کہ ابن عمر اپنے
کان یکری مزارعه علی عهد	کھیت کرائے پر دیا کرتے تھے
النبی وابی بکر وعمر وعثمان	رسول اللہ کے عہد میں بھی، حضرت
وصدرا من امارة معاویة	ابوبکر، وعمر وعثمان کے عہد میں بھی
ثم حدث عن رافع بن خدیج	اور جناب معاویہ کے عہد میں بھی کچھ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، ذکر ابی بکر ۱۲ [2] تذکرۃ الحفاظ، ذکر عمر ۱۲

[1] اس حدیث کی مشکوٰۃ نے ترمذی، ابوداؤد اور دارمی کے حوالے سے تخریج کی ہے

آناری ہے) قال ھٰؤلاۤءِ القوم لا یکادون یفقھون حدیثا (ان
کی کیا شامت ہے کہ فہم "حدیث" کے قریب ہوکر بھی نہیں گزرے؟) اگر
نگار کے علم اللغات میں لفظ "حدیث" سے قرآن مجید میں حدیث نبوی
ہے، تو کیوں نہ آیات بالا سے "منکرین حدیث" اور "انکار حدیث" کے
سخت سے سخت عبارتیں قرآن مجید ہی سے سمجھی جائیں؟

اس کے علاوہ اس کا تو ہر شخص کو اعتراف ہے کہ صحابہ کرام نے
خود رسول اللہ سے سیکھا تھا، انہوں نے رسول اللہ کی زبان سے سنا تھا
کانوں سے رسول اللہ کو حرام وحلال کا فتویٰ دیتے، چیزوں کو اچھا برا کہتے
تھے، اگر کوئی شبہ ہوتا تھا، تو وہ رسول اللہ سے پوچھ لیتے تھے، اور وہ تبلا
تھے، لہٰذا ان کا مذہب، ان کا فہم، ان کا تفقہ فی القرآن، ان کا اعتصام بالکتاب
اور ان کی رائے ہمارے مقابلہ میں ارفع واعلیٰ ہے، خلفاء راشدین کا عہد
کہ ان حضرات کا مسلک کیا تھا، کیا وہ صرف تمسک بالکتاب کو کافی سمجھتے
کیا نہیں ہر چیز قرآن میں مل جاتی تھی، حضرت ابوبکر کا یہ واقعہ خاص طور سے
ذکر ہے، کہ ایک عورت جدّہ کا حق طلب کرتی ہوئی آئی آپ نے کہا میں کتاب
اللہ میں تیرا کوئی حق نہیں پاتا، تو مغیرہ اٹھے اور کہا کہ رسالت پناہ نے سدس
ہے حضرت ابوبکر نے پوچھا کوئی گواہ بھی ہے؟ محمد بن مسلمہ نے شہادت دی
حضرت ابوبکر نے بلا تامل اسے نافذ فرما دیا[1]، حضرت فاطمہ زہرا نے جب باغ
سے متعلق اپنا دعویٰ پیش کیا، تو اس کی تردید بھی حضرت صدیق نے ایک حدیث
پڑھ کر کی کہ نحن معاشر الانبیاء لا نرث ولا نورث۔ اس وقت نہ حضرت
صدیق کو یہ خیال آیا، نہ حضرت زہرا نے یہ سمجھا نہ صدہا صحابہ میں سے کسی کو یہ
دقیق یاد آیا، کہ حدیث کو احکام دینی سے کیا تعلق، حدیث کی حیثیت تو تمام تر تاریخ

[1] تذکرۃ الحفاظ، ذکر ابی بکر ۲۲

سوال کے لئے رافع کے ہاں پہونچتے ہیں، وہ وہی جواب دیتے ہیں، خود صحابی ہیں، رسول کے زمانہ سے اسوقت تک ایک کام کرتے آئے، کسی نے ٹوکا نہیں، پھر خیال آتا ہے کہ ممکن ہے رسول اللہ نے فرمایا ہو اور مجھے علم نہ ہو سکا ہو، لہٰذا اس کام کو چھوڑ دیتے ہیں، اگر احادیث صرف تاریخی درجہ رکھتی تھیں، دینی حیثیت کی مالک نہیں تھیں، تو عبداللہ ابن عمر باوجود جلیل القدر صحابی ہونے کے کیوں ایک پر منفعت کام چھوڑ دیتے ہیں اگر وہ حدیث کی دینی حیثیت کے قائل نہ ہوتے تو کیا قیامت تک وہ ایسا کر سکتے تھے، ؟ صرف یہی دینی حیثیت تھی، جس نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اسے چھوڑ دیں،

حضرت ابن عمر ہی کا ایک دوسرا واقعہ بھی قابل تامل ہے۔

قال ابن عمر لجابر بن زید انك من فقهاء البصرة فلا تفت الا بقران ناطق او سنة ماضية فانك ان فعلت غير ذالك هلكت واهلكت[1]

حضرت عبداللہ بن عمر نے جابر بن زید سے کہا کہ بیشک تم بصرہ کے فقہا میں سے ہو، لیکن اپنی رائے سے کبھی فتوے نہ دینا سوائے قرآن و سنت کے، اگر اس کے علاوہ تم نے کیا تو خود بھی ہلاک ہو گے، اور دوسروں کو بھی ہلاک کرو گے،

اس کے علاوہ

قال ابو النضر لما قدم ابو سلمة البصرة اتيته وانا والحسن فقال للحسن، انت الحسن ما كان احد بالبصرة احب الی لقاء

ابو النضر کہتے ہیں کہ جب ابو سلمہ بصرہ آئے تو، میں حسن کے ساتھ وہاں گیا، انہوں نے حسن سے کہا کہ بصرہ میں تم سے زیادہ ملاقات کا اشتیاق

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۷۵ بہ حوالہ دارمی

ان النبی نہی عن کراؤ من الزرع
فذھب ابن عمر الی رافع
وذھبت معہ فسالہ فقال
نہی النبی عن کراؤ المزارع
فقال بن عمر قد علمت انا
کن نکری مزارعنا علے عھد
رسول اللہ -

حدثنا طبی بن بکیر ثنا اللیث
عن عقیل عن ابن شہاب قال
اخبرنی سالم ان عبد اللہ بن
عمر قال کنت اعلم فی عھد
رسول اللہ ان الارض تکری
ثم خشی عبد اللہ ان یکون
النبی قد احدث فی ذالک شیئا
لم یکن علم فترک کراء الارض [۵۱]

عرصے تک ، پھر ان سے رافع
خدیج کی حدیث بیان کی گئی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کرایہ ارض سے منع فرمایا ہے
ابن عمر نے کہا تم جانتے ہو ہم رسو
اللہ کے زمانے میں بھی ایسا کر
رہے ہیں ،

ابن شہاب کہتے ہیں ، کہ مجھے سالم
خبر دی کہ عبد اللہ بن عمر نے کہا
میں رسول اللہ کے عہد میں یہ جا
تھا کہ زمین کرایہ پر دی جا سکتی
پھر عبد اللہ ابن عمر ڈرے کہ مبادا
اللہ نے کچھ اس باب میں فرمایا ہو
انہیں علم نہ ہو ، اس خیال کے آتے
انہوں نے زمین کرایہ پر دینی چھوڑ د

اس میں خاص طور سے غور طلب امر یہ ہے کہ عبد اللہ ابن عمر خود صحابی
حاضر باش بزم رسول ہیں ، ان کے زہد تقویٰ اور دیگر محامد و محاسن کی ایک
قائل ہے خود رسالت پناہ خوشنودی مزاج کا اظہار فرما چکے ہیں اور رسول اللہ
عہد میں حضرت ابو بکر کے عہد میں حضرت عمر کے عہد میں حضرت عثمان
عہد میں اور جناب معاویہ کے عہد امارت میں کچھ عرصہ تک وہ ایک کام کر
رہے ہیں ، اس کے بعد انہیں رافع بن خدیج کی حدیث پہنچتی ہے ، خود تحقیق

۵۱. بخاری صفحہ ۳۱۵

منک وذالک انہ بلغنی انک تفتی برائک فلاتفت برائک الاان یکون سنۃ عن رسول اللہ، وکتاب منزل[۱] | مجھے کسی اور سے نہیں تھا، لیکن معلوم ہوا اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہوا اپنی فتویٰ نہ دو یا سنت رسول صلی اللہ یا کتاب الٰہی سے۔

اگر سنت کی کوئی دینی حیثیت صحابہ کی نظروں میں نہیں تھی، تو عبد اللہ بن عمر، ابوسلمہ کو کیوں یہ نصیحت کر رہے ہیں، کہ اپنی رائے سے فتویٰ نہ دو بلکہ سنت سے دو، کتاب سے دو، اگر دینی حجت صرف کتاب تھی، تو صرف کتاب پر زور دینا چاہیئے تھا، لیکن صحابی ہونے کے باوجود وہ زور دے رہے ہیں، بلکہ ڈرا رہے ہیں کہ دیکھو اگر اپنی رائے سے فتویٰ دو گے ہلاک ہوئے، کتاب الٰہی اور سنت رسول دونوں کو اپنے سامنے رکھو اور فتویٰ دو، صرف تاریخی "چیز کی اتنی حیثیت نہیں ہو جاتی، کہ وہ چیز کے دوش بدوش، بہ ثبات "عقل و ہوش" رکھی جائے؟

علاوہ ازیں

قال الشعبی ماحدثوک من رسول اللہ فخذبہ وماقالوہ برائہم فالقہ فی الحش[۲] | شعبی کہتے ہیں اگر لوگ تم سے حدیث بیان کریں تو تم اسے لے لو، لیکن اگر اپنی رائے بیان کرنے لگیں تو اسے غلاظت میں پھینکدو،

یہ حدیث بھی قابل تامل ہے اسے بھی شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ایک خاص عنوان کے ماتحت ذکر کیا ہے اور شاہ صاحب کا پایہ علم حدیث میں جتنا ارفع واعلیٰ ہے اس سے سب واقف ہیں — وہ حدیث یہ ہے،

لاالفین احدکم متکئا علی | نہ ہو کہیں تم میں سے کسی کو ایسا

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۷۵ بحوالہ دارمی ۱۲ [۲] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۷۵ بحوالہ دارمی ۱۲

ریکتہ، یاتیہ الامر من امری
امرت بہ او نہیت عنہ
یقول لا ادری ما وجدنا ہ
فی کتاب اللہ اتبعنا۔

پاؤں کہ وہ ٹیک لگائے ہوئے تکیہ پر
بیٹھا ہو، اس کے پاس میری باتوں میں سے
کوئی ایسی بات آئے، جس کا میں نے حکم دیا ہو
یا منع کیا ہو اور وہ کہے کہ میں تو اسے نہیں
جانتا قرآن میں تو ہے نہیں کہ میں اس کی
پیروی کروں،

معلوم ہوتا ہے کہ سرکار رسالتؐ نے اپنی چشم بصیرت سے سب کچھ
لاحظہ فرما لیا تھا، ورنہ ایسی بات وہ کیوں فرماتے؟

شاہ ولی اللہ صاحب جو اسرار و رموز شریعت کے ماہر خصوصی ہیں
یک اور بات فرماتے ہیں، جو ہر منکر حدیث کے لئے سرمایۂ تفکر ہے یعنی
سول اللہ سے جو کچھ مروی ہے، اس کی دو صورتیں ہیں یا تو اس کا بعض حصہ

ستند الی الوحی و بعضہا
ستند الی الاجتہاد بمنزلۃ
وحی لان اللہ تعالیٰ عصمہ
ن ان لتتقرر رایہ علی الخطاء

وحی سے مستند ہوگا، یا حضورؐ کے
اجتہاد سے جو بمنزلہ وحی کے ہے کیونکہ
اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے محفوظ
و مامون کردیا ہے کہ آپ کی رائے
گرامی غلط واقع ہو،

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انبیاء معصوم ہیں، لہٰذا ہمارے رسول
ی غلطی اور غلط روی سے معصوم تھے، محفوظ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو
اص مرتبہ پر سرفراز فرمایا تھا، ان سے کسی غلطی کا صدور ناممکن تھا پھر
س کے تسلیم کرنے کے بعد فرمودۂ رسولؐ ظاہر ہے ریب و شک سے
اک، اور اسی طرح واجب العمل اور واجب التسلیم ہے، جس طرح کوئی

...نف علی الانقیاد للخلفاء — وانقیاد پر موقوف ہے۔

...جایاس دنھم۔[۱]

شاہ صاحب کا یہ قول اتنا مبرہن ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دین ...ایک اٹل اور نہ بدلنے والی چیز ہے اس لئے اس میں تو قرآن و سنت نبوی ہی ...یروی ہوگی، اور سیاست ایسی چیز ہے۔ جو مصالح کے لحاظ سے ہر وقت بدلتی رہتی ...، اس لئے امرا اور خلفا کی اطاعت وانقیاد کا حکم ہے، اس لئے کہ اسلام کے ...دیک۔

...فساد اکبر من القتل . فساد قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

اسلام جماعت انسانی کو ایک نظام اور ضابطہ کے اندر رکھنا چاہتا ہے، اسی ...ے اگر کوئی حبشی غلام بھی امیر ہو تو بھی اس کی اطاعت واجب ہے لیکن اگر وہ ...اب وسنت سے اعراض کرے تو خواہ وہ حبشی نہیں عمر فاروق ہو، ایک بدو اسے ...کے کی طرح سیدھا کرنے کی دھمکی دے سکتا ہے۔ خود قرآن اور حدیث میں جا بجا ...س کی تفصیل ملے گی، کہ امیر کی اطاعت اسی وقت تک فرض ہے، جب تک وہ ...بع کتاب وسنت ہے، اور جب اس سے اعراض کرے تو اس کی پیروی سا قط مسلمان ...پڑوسی کا حق ہے، دوستوں کا حق ہے والدین کا حق ہے، قرابت داروں کا حق ہے، ...میر وقت کا حق ہے، لیکن اگر کوئی بات خلاف سنت ہو، خلاف کتاب ہو، تو یہ تمام ...قوق ختم ہو جائیں گے مسلمان ان تمام بندشوں سے آزاد ہو جائے گا، اور وہ صرف ...خدا کی اطاعت کرے گا، ارشاد رسول کی پیروی کرے گا، لہذا ثابت ہو گیا کہ نظم و انتظام ...کے قائم رکھنے کے لئے امیر کی اطاعت واجب ہے، لیکن اسی وقت تک جب تک ...وہ کتاب وسنت پر چلے، میرے اس دعوے کی دلیل قرآن ہی میں اور اسی آیت

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ۱۲

منصوص امر جس پر نص وارد ہو۔ غرض اس قبیل کی بہت سی چ
ہیں، جن سے حدیث کی دینی حیثیت روز روشن کی طرح واضح
ہے اور ثابت ہوجاتا ہے کہ خود عہد صحابہ میں اس کی دینی حیثی
کی جا چکی ہے اور اس عہد سے آج تک امت اسے مانتی چلی آتی

پھر اب یہ دعویٰ کہاں تک قابل پذیرائی ہے؟

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اطاعت رسول قرآن میں مامور بہ ہے۔
اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منک
فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللّٰہ والرسول
اور اطاعت رسول فرض ہے تو لازم آتا ہے کہ اس کے اقوال
اعمال جمع کئے جائیں، تاکہ امت اس کی اطاعت کرے۔ اگر یہ استدلا
صحیح ہے تو اسلام میں جس قدر امراء ہوئے ہیں، ان میں سے بھی
ہر ایک کا مجموعہ حدیث ہونا چاہیئے، ورنہ ان کی اطاعت کیسے
ہوگی، کیونکہ ایک ہی لفظ "اطیعوا" ہے جس میں رسول اور امرا
داخل کئے گئے ہیں۔"

امعان نظر سے اگر اس دلیل کا مطالعہ کیا جائے، تو ظاہر ہو جائے گ
یوں نہیں ہے۔ قرآن نے یقیناً خدا، رسول اور اطاعت امیر کا حک
ہے، اور ہمیں اطاعت کرنی چاہیئے، لیکن کیا رسول اور امیر کا درجہ
ہے؟ شاہ ولی اللّٰہ صاحب فرماتے ہیں، اور کتنی معقول بات فرماتے ہ

اقول انتظام الدین یتوقف علیٰ اتباع سنن النبی و انتظام السیاسۃ الکبریٰ	میرا خیال یہ ہے کہ انتظام دین س نبوی کی پیروی پر منحصر ہے، اور ا سیاستہ کبریٰ خلفا اور امرا کی اط

ی لئے نہیں لایا گیا، کہ اس کا ہر وقت امکان ہے کہ کوئی امیر غاصب ہو،
رابی ہو، حکم خدا و رسول کی پروا نہ کرتا ہو، لہٰذا اگر ایسا ہی ہو تو آخری
صلہ اولوالامر" پر نہیں، بلکہ ان کے اولوالامر" یعنی خدا و رسول پر رکھا گیا مثلاً یوں
سمجھئے کہ مصطفےٰ کمال پاشا کی حکومت نے اگر بقول بعض مسجدیں مقفل کرا دیں، نماز
غیر ضروری قرار دی، پارلیمنٹ کا کوئی مذہب نہیں رکھا تو ابنِ اسلام پر عمل
رنا چھوڑ دیا، اور ایک دوسرا دستورِ حکومت وضع کر لیا۔ تو کیا انھیں کوئی منکر
دیث "جانشین رسول" مان لے گا، نہیں اور یقیناً نہیں، تو ایسی صورت میں چارہ
ر سوا اس کے اور کیا ہے کہ معاملہ خدا اور رسول کے سپرد کیا جائے اس لئے کہ
سول کے متعلق تو کبھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ "اینٹی نیشنلسٹ" ہو جائے گا۔ کہ
رآن کو چھوڑ کر یورپ اور اس کی دوسری نو آبادیوں کے اصول پر دستور
کومت وضع کرے، تبلایا جائے کہ ایسی صورت میں کیا جائے؟ کیا اس کی
تباع کی جائے، ؟ جواب اگر نفی میں ہے۔ اور یقیناً نفی میں ہے، تو پھر لامحالہ
یں رجعت قہقری کر کے اسی طرف لوٹنا ہو گا جس نے "اولوالامر" کی اطاعت
اجب کی ہے، اب یہ حکمت سمجھ میں آگئی ہو گی کہ "اطیعوا" میں امیر کا ذکر بقاء
ظم و انتظام کے لئے ہے، اور رد میں عمداً و مصلحتاً نہیں ہے کہ اگر ایسی صورت
یدا ہو تو اس کا تدارک کسی ایسے "جانشین رسول" سے نہیں ہو گا، بلکہ صرف
رآن و حدیث سے پہلی ہی دلیل کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ

"در اصل حکم کتاب اللہ ہے، رسول یا امیر اس سے اپنے فہم کے مطابق
یصلہ کرنے پر مجبور ہیں اسی لئے فرمایا وَمَا اختلفتم فی شیءٍ فحکمہ
ی اللہ۔

اور اسی لئے فرمایا" وان تنازعتم فی شیءٍ فردوہ الی اللہ

میں ملتی ہے کہ

وان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول — اگر کوئی متنازعہ فیہ مسئلہ درپیش ہو تو اور رسول کی طرف لوٹا دو۔

اس جگہ "امیر" کا لفظ "ردوہ" میں اسی لیے نہیں داخل کیا کہ اگر وہ کت
سنت کے خلاف کوئی کام کرتا ہے تو خدا اور رسول کی طرف لوٹاؤ یعنی قر
و حدیث میں اس کی جستجو کرو، لہذا اگر "ردوہ" میں امیر داخل ہوتا تو یقیناً امرا
اسلام کے مجموعۂ احادیث تیار کرنے کی ضرورت تھی، لیکن جب اس میں نہ
ہے، صرف "اطیعوا" میں ہے تو ہم اس کی اطاعت کریں گے اور جب کو
بات پیدا ہوگی، تو خدا اور رسول کی طرف لوٹائیں گے، اس وقت امیر کو پو
گے بھی نہیں، اور اسی کے مطابق عمل کریں گے، اب یقیناً یہ بات ثابت ہو
کہ امرا اسلام کے مجموعہ احادیث تیار کرنے کی ضرورت کیوں نہیں ہے
رسول اللہ کے مجموعۂ حدیث کی ضرورت کیوں ہے؟ اس کے علاوہ سوال یہ
کہ جس طرح رسول متعین ہوا ہے، کیا اولی الامر کی تعیین پر بھی وہی جزم و وثوق
جا سکتا ہے؟ کیا مقالہ نگار صاحب اس پر تیار ہیں، کہ جس طرح آنحضرت ص
کے رسول ہونے پر ان کا ایمان ہے، اسی طرح وہ اکبر و شاہجہاں یا اورنگزیب
و صلاح الدین کے اولوالامر ہونے پر حلف شرعی لے سکتے ہیں۔؟

آگے کہا ہے کہ

"یہ سوال کہ رسول کے بعد کس طرح اطاعت ہوگی، اولوالامر
کی اطاعت کے حکم سے حل ہو جاتا ہے کہ جو اس کی جانشینی
کریں گے۔"

اگر ایسا ہوتا تو "ردوہ" میں امیر کا لانا ضروری تھا، اور اس میں ا

اور اس کی پیروی ہے کیا؟ وہی جس کے متعلق اس نے حکم دیا، جس کے متعلق
نے فرمایا اور چونکہ رسول کی پیروی موجب رضامندی خدا ہے۔
وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی (فرمودۂ رسول وحی ہی ہے
ہے کیا؟) اس لئے کہ خدا نے اسے رسول بنایا، اس کی پیروی اپنی رضامندی
سبب بتائی تو پھر ظاہر ہے کہ اس کا قول کوئی معمولی قول نہیں ہو سکتا
وہ وحی ہے اور کچھ نہیں، آگے پھر کہا گیا ہے۔ کہ

"یہ خیال کہ رسول اللہ کی زبان سے جو کچھ نکلتا تھا، سب وحی تھا،
جس کے ثبوت میں آیت وما ینطق عن الھویٰ الخ پیش کی جاتی ہے۔
صحیح نہیں کیونکہ کفار کو جو انکار تھا وہ قرآن کے متعلق تھا[۱۵]، اسی کے
بارے میں اللہ نے فرمایا کہ وہ وحی ہے رسول اللہ کی عام گفتگو
جو گھر میں یا لوگوں کے ساتھ ہوتی تھی، اس کے متعلق نہ انکار تھا،
نہ بحث، قل انما انذرکم بالوحی"

چنانچہ پہلی ہی آیت میں تصریح ہے کہ "نطق رسول" وحی ہے، اور یہ ہم بھی مانتے
ہیں کہ وہی نطق رسول وحی ہے، جو امور دین میں ہو، اور وہی حدیثیں واجب
عمل ہیں جو امور دین میں ہوں" ورنہ رسول اللہ کی عام گفتگو جو گھر میں یا لوگوں
کے ساتھ ہوتی تھی، اس کے متعلق نہ اصرار ہے، نہ دعویٰ کہ وہ واجب العمل ہیں
یعنی اگر رسول اللہ نے حضرت عائشہ سے گھر میں کوئی بات کہی یا حضرت فاطمہ رض
سے کچھ فرمایا، تو امتیان محمد کے شوہر یا باپ پر یہ واجب نہیں ہے کہ وہ بھی اپنی

---

[۱۵] یہ دعویٰ بھی غلط تھا۔ کفار کو انکار محض وحی قرآنی ہی سے نہ تھا بلکہ مطلقاً وحی سے تھا، یعنی وہ آنحضرت صلعم کے کسی حیثیت سے بھی صاحب وحی ہونے کے قائل نہ تھے۔ خواہ وہ وحی بصورت قرآن ہو، یا کسی اور صورت میں۔ ۱۲

والرسول ۔ اگر صرف اللہ مقصود تھا، تو لفظ "رسول" کے نہ لانے میں
"دشواری" تھی، معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے بعد اگر کوئی چیز ماموربہ
رسول ہے، قرآن کے بعد اگر کوئی چیز واجب العمل ہے، تو وہ حدیث
ان کھلی ہوئی آیتوں اور نشانیوں کے بعد آخر منکرین حدیث
فبای حدیث بعدہ یومنون اور کس چیز پر ایمان لائیں گے۔

دوسری دلیل ہے کہ
کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں رسول کے حکم کے بھی اتباع کا تو حکم
موجود ہے۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی لیکن خود
رسول کو کس کی اتباع کا حکم دیا گیا، اس کی بھی تصریح قرآن
میں ہے، اتبع ما اوحی الیک من ربک پھر رسول کو اعلان
کر دینے کا حکم دیا گیا، قل انما اتبع ما اوحی الی من ربی
لہذا رسول بجز وحی کے کسی کا پیرو نہیں تھا، اس لئے اس کی
پیروی بعینہ قرآن کی پیروی ہے"

ثابت ہوا کہ حدیث کی پیروی بعینہ قرآن کی پیروی ہے۔ اس
احادیث بھی تو آخر امور دین ہی کے متعلق ہیں، اور "یہ تاریخی" طور
ثابت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ میری پیروی کرو، صحابہ کی
کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو ہدایت یاب ہوگے، لہذا رسول کی پیروی عین قرآن
پیروی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ رسول جو کچھ کہتا ہے وہ اس تفصیل
قرآن میں موجود بھی ہو، اس لئے قرآن نے کہلوایا،
قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی (اگر تم اللہ سے محبت کرتے
میری (رسول اللہ کی) پیروی کرو۔ اور اس کی پیروی موجب رضامندی

جائے، ۹؎اگر یہ منکرین حدیث سے اس قدر بیزار ہیں تو قرآن مجید
پورے طور سے وسعت نظر ہونی چاہیئے تھی، نہ یہ کہ ادھر ادھر کی
وں میں جو کچھ کسی نے لکھدیا، وہ صحیح سمجھ لیا گیا، دعوے اور دلیل سے
وم ہوتاہے کہ واقعی حدیث نے اتنا بڑا ظلم کیا ہے کہ لوگوں کو حق
ت سے محروم کر دیا، اب وہ بیچارے کیا کریں گے۔ واقعہ یہ ہے
آیت اس وقت اتری جب تک قرآن مجید میں اعزاو اقربا کے
مقرر نہیں ہوئے تھے، اس کے بعد یہ پورا رکوع نازل ہوا، جس
قاعدہ ہر شخص کے حصص مقرر کر دیئے گئے ہیں، تو اس کی ضرورت
رہی، اور بجزت واتفاق دیکھئے کہ اس میں بھی رسول کی پیروی فرض
ار ہی ہے۔

یکم اللہ فی اولادکم
ذکر مثل حظ الانثیین
ن کن نساء فوق اثنتین
ن ثلثا ماترك، وان
ت واحدۃ فلہا النصف
بویہ لکل واحد منہما
لس مماترك ان
لہ ولد، فان لم یکن
ولد وورثہ ابواہ
ومہ الثلث فان
لہ اخوۃ فلامہ

اللہ تم کو وصیت کرتا ہے کہ
تمہاری اولاد میں مرد کے لئے عورت
سے دوگنا حصہ ہے اور اگر عورتیں
دو سے زیادہ ہوں تو جو چیز وہ
چھوڑ گیا ہے تو دو تہائی اس چیز کا
ملے گا اور ایک ہے تو اس کے لئے
نصف ہے اور ماں باپ میں ہر
ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اس صورت
میں کہ اس کے اولاد ہو۔ اور
اگر نہ ہو تو والدین ہی وارث
ہوں گے، اور ماں کو تیسرا حصہ

لڑکی سے وہی کہے اور اسی طرح کہے، لیکن اگر رسول نے کہا کہ طواف کرو سعی یوں کرو، نماز میں یوں کھڑے ہو، یہ اور اسی قبیل کے اقوال جو دین سے متعلق ہیں دیئے، تو وہ ہمارے لئے بلاشبہ واجب العمل ان کی پیروی کی جائے گی، اور جو پیروی کرے گا، خدا اس سے ہو گا۔

تیسری دلیل میں احادیث کو ظنی بتلایا گیا ہے اور اس لئے ناقابل اس پر گفتگو بے کار ہے، اس لئے کہ اس مسئلہ پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے کہاں تک قابل عمل ہیں۔

چوتھی دلیل میں ایک بہت دلچسپ بات یہ کہی گئی ہے کہ تعارض یقینی حدیث ظنی، اور پھر اس کو محکم یوں کہا گیا ہے کہ

"بعض جگہ حدیثیں بالکل قرآن کے خلاف جاتی ہیں جن کی وجہ سے علماء قطعی اور حکمی آیات کو منسوخ کرنے لگتے ہیں مثلاً اللہ نے مالدار مسلمانوں پر مرنے سے پہلے والدین اور اقرباء کے لئے وصیت فرض کی ہے، کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرن الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین۔ مگر حدیث کہتی ہے "لا وصیۃ لوارث" علماء نے اس حدیث کی وجہ سے وہ یقینی وصیت جو اللہ نے مالکی مصالح کے لحاظ سے فرض کی ہے اور جس کو اہل تقویٰ پر ایک حق قرار دیا ہے منسوخ کر ڈالی۔

تعجب ہے کہ اس برہان قاطع پر جو منکرین حدیث نے پیش کی

فهم شركاء في الثلث من بعد وصية يوصى بها او دين غير مضار ـ وصية من الله والله عليم حكيم ه تلك حدود الله ومن يطع الله ورسوله يدخله جنت تجري من تحتها الانهار خلدين فيها وذالك الفوز العظيم ومن يعص الله ورسوله ويتعد حدوده يدخله نارا خالدا فيها وله عذاب مهين

(پ۴ ع)

حصہ ملے گا اور اگر اس سے بھی زیادہ ہوں تو وہ سب ثلث میں شریک ہوں گے۔ وصیت یا قرض کے بعد، اس میں کسی کو ضرر نہیں ہے، یہ اللہ کی طرف سے ہے اور وہ علیم و حکیم ہے، یہ اللہ کے حدود ہیں، جس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گا، جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اور ہمیشہ رہے گا۔ اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے اور جس نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی، حدود سے گزر گیا، تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں داخل ہو گا، اور اس کے واسطے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

اس پورے رکوع میں " عائلی مصالح کو مد نظر رکھتے ہوئے۔ اللہ تعالےٰ نے سابقہ آیت کریمہ " واذا حضر احدکم الموت ان ترك خيرا لوصية للوالدين والاقربين بالمعروف حقا على المتقين" کا اجمال کافی نہ سمجھ کر یہ پورا رکوع نازل فرمایا۔

السدس من بعد وصية
يوصي بها او دين، اٰباؤكم
وابناؤكم لا تدرون
ايهم اقرب لكم نفعا،
فريضة من الله، ان
الله كان عليما حكيما ﴿۱۱﴾
ولكم نصف ما ترك
ازواجكم ان لم يكن لهن
ولد فان كان لهن ولد
فلكم الربع مما تركن
من بعد وصية يوصين
بها او دين، ولهن الربع
مما تركتم ان لم يكن
لكم ولد فان كان لكم
ولد فلهن الثمن مما
تركتم من بعد وصية
توصون بها او دين وان
كان رجل يورث كلالة
او امراة وله اخ او اخت
فلكل واحد منهما السدس
فان كانوا اكثر من ذالك

ملے گا، اور اس کے
تو چھٹا حصہ ملے گا، اس
کے بعد جو دہ کر جا
کے دینے کے بعد تمہار
اور تمہاری اولاد اس
ہیں کہ کس میں زیادہ نفع
ہیں، یہ تمہارے واسطے
طرف سے فرض کیا گیا ہے
علیم وحکیم ہے، اور تم
جو چھوڑ کر مرے اس
نصف کا حصہ ہے
یا قرض کے دینے کے بعد
اگر تمہارے اولاد نہ ہو
جائیداد میں بی بی کا
حصہ ہے اور اگر ہو تو
حصہ ہے۔ بی بی کے لئے
اور قرض کے بعد اور اگر
کوئی آدمی ہو جس کی میر
کلالہ یا ایسی عورت کہ
کے واسطے بھائی یا بہن
دونوں میں سے ہر ایک

؎ اگر اس کے اولاد نہ ہو اور اگر ہو تو تمہارے لیے چوتھائی حصہ۔

کوئی صحابی اپنی سب سے زیادہ "عزیز و محبوب" چیز راہ خدا میں وقف کر دینا چاہتے ہیں، لیکن رسولِ خدا انہی "عائلی مصالح" کی بنا پر انہیں باز رکھتے ہیں اور اسے ان کے اقرباء میں بحصہ رسدی تقسیم کرا دیتے ہیں، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ حدیث پر یہ الزام کیسے لگ سکتا ہے؟

اب یہ مسئلہ صاف ہوگیا کہ جب تک ذوی القربیٰ کے حقوق کی باقاعدہ تعیین نہیں ہوئی تھی، اس وقت تک کے لئے وہ آیت کافی تھی جس میں والدین وغیرہ کے لئے وصیت کرنے کا حکم ہے، لیکن جب حقوق پر پورا ایک رکوع نازل ہوگیا، تو وہ اجمال اس تفصیل میں مدغم ہوگیا اور اب امت کا اسی پر عمل ہے، اور چونکہ سب کے حقوق خود قرآن نے متعین کر دیئے ہیں۔ اب ان میں کوئی کمی یا زیادتی نہیں ہوسکتی ہے لہذا وارث کے لئے وصیت کرنا ایک بے معنی سی بات ہے، البتہ اس ثلث میں جس پر وصیت کرنے والے کو پورا اختیار ہے ہر قسم کی وصیت کرسکتا ہے۔ اور وہ نافذ ہوگی، لیکن اس کے بعد وصیت کا دروازہ بند ہے، اور گویا حکم قرآن سے بند ہے۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ

"صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے حکم دے رکھا تھا۔ لاتکتبوا عنی غیر القرآن الخ"

یہ "الخ" کیا چیز ہے؟ محترم مقالہ نگار نے اس جگہ بھی بیجا دانستہ داری سے کام لے کر منکرین حدیث کو انتہائی تلبیس کا موقع دیا۔ پوری حدیث [illegible]ں ہے۔

لا تکتبوا عنی غیر القرآن — مجھ سے سوا قرآن کے کچھ نہ لکھو

اور اس میں باقاعدہ لڑکا، لڑکی، والدین، شوہر، بی بی، بھائی
سب کے حقوق متعین کر دیئے، اب ہر مسلمان ان کی تعمیل پر مجبور
ہے دوسرے ورثاء کو بھی حصے از روئے شرع شریف ملیں گے،
اس صورت میں وارث کے لئے وصیت کی ضرورت ہی کیا باقی
جاتی ہے۔؟ وصیت تو اس وقت کی جاتی ہے، جب آدمی مر رہا
اسے یقین ہو کہ میرے مرنے کے بعد یہ کام ایسا نہیں ہوگا، تو
وصیت کر کے اپنی آرزو محکم کر جاتا ہے اور پھر وہ پوری ہوتی
لیکن جب اس کا اندیشہ ہی نہیں، وارث کو حق بہر حال ملے گا، چاہے
وہ دینا چاہے، چاہے نہ دینا چاہے، تو پھر وارث کے لئے وصیت
کی کیا حاجت رہ گئی۔؟ لیکن اگر وصیت کرنے والا اپنی جائیداد سے
کار خیر کے لئے غریبوں اور یتیموں کے لئے کچھ وصیت کرنا چاہتا ہے
کہ بطور صدقۂ جاریہ کے وہ کام آئے، تو اس کا حق بھی شرع نے
باقی رکھا ہے، وہ اپنی جائیداد کے ثلث حصہ میں جس قسم کی جس کو
چاہے وصیت کر سکتا ہے اور وہ اس کی وفات کے بعد نافذ ہوگی
لیکن ثلث سے زیادہ کی وصیت نہیں کر سکتا، اور اگر وہ کر بھی دے
تو قاضی اسے منسوخ کر دے گا۔ اس لئے کہ حقوق اقربا باقی رہ
جائیں گے، اور پامالی حقوق مقصد خداوندی نہیں، وصیت ثلث
میں نافذ رہے گی، اور یہ جو کچھ ہوگا قرآن مجید کے اس رکوع کو پیش نظر
رکھ کے ہوگا۔

اور حدیث کے اوپر یہ الزام لگانا کہ وہ عائلی مصالح کو تباہ کرتی
ہے بڑی زیادتی ہے، احادیث وسنن میں اکثر ایسے واقعے ملتے ہیں کہ

اس لئے کہ اختلاف کا اندیشہ تھا، انہوں نے تقریباً پانسو حدیثوں کا ایک مجموعہ بھی لکھ رکھا تھا اِسے بھی جلا دیا۔"

یہ بھی غلط ہے۔ یہ قول تذکرۃ الحفاظ سے لیا گیا ہے اور خود صاحب تذکرۃ الحفاظ، علامہ ذہبی نے ان دونوں واقعات کو "مراسیل" میں شمار کیا ہے۔ اور مراسیل کا پایہ استناد قطعاً ساقط ہے۔ مراسیل ہمارے لئے حجت نہیں بن سکتے۔ نہ ہم ان سے احتجاج کر سکتے ہیں، یہ جاننے کے بعد تعجب ہے کہ منکرین حدیث اسے کیسے پیش کرتے ہیں، یہ واقعہ تو خیر مراسیل میں سے ہے، لیکن صاحب تذکرۃ الحفاظ نے بڑے زور و شور سے حضرت ابوبکر کا وہ واقعہ نقل کیا ہے، جب آپ نے جدہ کا حق حدیث سے دلوایا ہے، اور اس کے بعد لکھا ہے، کہ دیکھو حضرت ابوبکر کو جب قرآن میں ایک چیز نہیں ملی، تو سنن کی جستجو کی اور جب سنن میں مل گئی تو اسے نافذ کر دیا، اور خوارج کی طرح یہ نہیں کہہ دیا کہ ہمارے لئے تو کتاب اللہ کافی ہے[1]

خود حضرت عمر کا یہ عالم تھا کہ وہ قلت روایت اور کثرت طرق کے حامی تھے۔ اس قلت روایت اور کثرت طرق کا مطلب سمجھ لینا چاہیئے۔ قلت روایت کے معنی یہ ہیں، کہ رسول اللہ سے یونہی اندھا دھند روایت نہ کر دی جائے، بلکہ خوب سمجھ بوجھ کر، حزم و احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیئے اور کثرت طرق کا مطلب یہ ہے کہ ایک حدیث متعدد راویوں سے اور متعدد طرق سے روایت کی جائے، تاکہ اس کی صداقت اور حقیقت غیر مشتبہ

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ ذکر ابی بکر

وحدثوا عنی فلاحرج۔ حدیث بیان کرو۔

"حدثوا عنی فلاحرج" کو نہ لکھنا صرف" الخ" لکھ کے ٹال دینا بہ
بڑی زیادتی ہے، جب پوری حدیث اس طرح سامنے آجاتی ہے
اعتراض کی صورت ہی بدل جاتی ہے، یعنی رسالت پناہ نے اس اند
سے کہ قرآن وحدیث خلط ملط نہ ہو جائیں، کتابت سے تو منع فرمایا
حدیث بیان کرنے کی اجازت دیدی، اور بعد کو جب یہ اندیشہ
ہوگیا، تو آپ نے کتابت کی اجازت بھی عبداللہ بن عمرو کو دیدی
جیسا کہ خود حضرت ابوہریرہ نے ایک مقام پر اعتراف فرمایا
کہ مجھ سے زیادہ عالم بالحدیث سوا عبداللہ بن عمروکے کوئی نہیں
لئے کہ وہ لکھ لیتے تھے، اور میں نہیں لکھتا تھا[1]۔ کتابت کا یہ فعل ظاہر
آنحضرت کے زمانہ میں ہی ہوتا تھا، خود طاہر جزائری نے اس کی توجیہ بھی ک
کہ جب لبس واختلاف کا اندیشہ رفع ہوگیا تو آپ نے کتابت کی اجاز
دیدی[2]، ورنہ حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسا زبردست زاہد و عابد شخص
حدیث کا حکم اپنے عہد خلافت میں کیسے دے سکتا تھا، اور صحابہ اور تا
اس کی پیروی کیسے کرسکتے تھے؟

اس کے بعد کہا گیا ہے کہ

"حضرت ابوبکر نے اپنے عہد میں روایت سے بھی منع کر دیا

---

[1] توجیہ النظر[2] تذکرۃ الحفاظ، ذکر ابی بکر۔ یہاں ایک بات اور عرض کردی جا
کہ بعض لوگ مراسیل کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں، لیکن جمہور محدثین کرام قطعاً اسے ساقط
سمجھتے ہیں اور کبھی اس سے احتجاج نہیں کرتے ہمیں جمہور محدثین کا مسلک پیش
رکھنا چاہیئے۔ (رئیس احمد جعفری)

م ہوتا ہے کہ آخر میں رسول اللہ نے اسے ترک فرما دیا تھا،
نے گوشت نوش فرمایا اور بلا وضو کے نماز پڑھی اور خود جابر
حدیث ہے کہ رسول اللہ نے آخر میں "تمامست النار" سے
و ترک کر دیا تھا، اور اسی پر امت کا عمل یا "تواتر" چلا آرہا
، تو اسے حضرت ابن عباس نے بہت اچھا کیا نہیں مانا، اس
کہ یہ ماننے کی چیز ہی نہیں تھی، رہی دوسری حدیث "نہی عن
..." سے انکار کی، تو ممکن ہے حضرت علی کی اس حدیث میں انہیں
شبہ ہوا ہو، اس لئے اس کے تسلیم کرنے سے انکار کیا، لیکن
کے اس انکار کو خود صحابہ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے، حضرت
اللہ بن زبیر کو حضرت ابن عباس کے اس مسلک کا جب علم ہوا،
نہوں نے نہایت سخت الفاظ میں تنقید کی کہ جس طرح وہ بصارت
سے محروم ہیں اسی طرح بصیرت سے بھی، ذرا متعہ کر کے وہ دیکھیں
، پھر دیکھو میں کیا کرتا ہوں، اور تیسری حدیث جس کا حضرت ابن
باس نے انکار فرمایا ہے، اسے بیان کرنا چاہیئے تھا، کہ وہ کیا تھی،
ں تو اس کے متعلق کچھ نہیں عرض کیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ

"عہد صحابہ کے بعد عینی شہادت کا ملنا ناممکن ہو گیا، اور
شہادت در شہادت، در شہادت، در شہادت، عقلاً، عرفاً
یا قانوناً کسی لحاظ سے قابل سماعت نہیں":

حیرت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ناممکن کونسی چیز ہو گئی؟ صحابہ سے
تابعین روایت کرتے ہیں، تابعین سے تبع تابعین روایت کرتے ہیں ان سے

ہو جائے، چنانچہ حضرت عمر نے "املاص" کے متعلق
میں کچھ نہیں پایا، تو حدیث کی طرف رجوع کیا، اور جب
مل گئی تو قبول کیا، اسی طرح حضرت عباس کے واقعہ میں
آچکا ہے، جب آپ کو شہادت مل گئی تو آپ نے قبول
طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی، جب حدیث ملتی تھی
لے کے اسے قبول فرمالیتے تھے[2] یہ کبھی نہیں فرماتے
تو صرف "تاریخی" حیثیت ہے، دینی حیثیت سے ہم نہیں
نیز حضرت علی منکر حدیث کی روایت سے منع فرما
اور مشہور حدیث کی ترغیب دیتے تھے[3] ان باتوں کو پیش
بعد ایک دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ

"حضرت ابن عباس نے بھی حضرت ابو ہریرہ کی حد
"الوضوء مما مست النار" اور حضرت علی کی نہی ع
المتعۃ" اور حضرت ابو سعید خدری کی حدیث
قبول کرنے سے انکار کیا!"

اس سے گویا یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس
کے قائل نہیں تھے، حالانکہ یہ کہیں سے بھی ثابت نہیں
اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس
حدیثوں کو قبول نہیں فرماتے تھے، جو ان کے نزدیک
تک نہیں پہنچتی تھیں، اور ان تین حدیثوں میں بھی پہلی
منسوخ ہے، حدیث کی کتابوں میں متعدد روائتیں ہیں، ج

---

[1] تذکرۃ الحفاظ، ذکر عمر، [2] و [3] تذکرۃ الحفاظ حضرت علی

ولا نترك لرسول الله حديثا أبدا الا حديثا وجد عن رسول الله حديث يخالفه وإذا اختلف الاحاديث عنه فالاختلاف فيها وجهان احدهما ان يكون بها ناسخ ومنسوخ فنعمل بالناسخ ونترك المنسوخ والآخر ان تختلف ولا دلالة على ايها الناسخ فنذهب الى اثبت الروايتين ـ الخ[1]

ہو جائے کہ کوئی دوسری حدیث اس کی مخالف ہے، اور مخالفت کی بھی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ ایک ناسخ اور دوسری منسوخ ہو، اگر ایسا ہوا تو ہم ناسخ پر عمل کریں گے، اور منسوخ کو ترک کر دینگے اور اگر احادیث میں اختلاف ہو اور اس پر کوئی دلیل نہ ہو کہ کون ناسخ ہے اور کون منسوخ تو ہم دونوں روایتوں میں سے جو روایت سب سے زیادہ اثبت ہوگی اسے تسلیم کریں گے۔

امام صاحب نے اس موضوع پر اپنے اور خیالات بھی ظاہر فرمائے ہیں، لیکن ان کا اس بحث سے زیادہ تعلق نہیں، اس لئے انہیں چھوڑتے ہیں، مذکورۂ بالا اقوال میں امام صاحب نے قبول حدیث کا معیار روشن کر دیا ہے، اور یہ بھی واضح فرما دیا ہے کہ اگر احادیث میں اختلاف ہو تو ہمیں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

غرض کہنا یہی ہے کہ اگرچہ "شہادت در شہادت" چار بار نہیں لاکھ بار ہو، لیکن اگر رواۃ ثابت ہوں، ثقہ ہوں، عدول ہوں تو وہ بلا تامل و بلا تذبذب قبول کی جائیں گی، لیکن اگر حقیقۃً منکرین حدیث اس "شہادت در شہادت در شہادت" سے گھبراتے ہیں، تو ایک دوسری

---
[1] کتاب الام جز سابع صفحہ ۱۷۷

اور ثقہ لوگ، اگر ایک بات ایک سچا آدمی کہے تب تو وہ قابل قبول
اور اگر دس سچے آدمی اسی بات کو کہیں تو وہ ناقابل قبول؟ یہ بات
بدیہی طور پر یقیناً ناقابل فہم ہے، ہمارے پاس روایت کرنے والوں کی زند
ایک ایک صفحہ محفوظ ہے، ان کے کردار، ان کی گفتار، ان کے عادا
اطوار سب ہمارے سامنے ہیں، ان کا بیٹھنا، اٹھنا، ان کا کھانا، پینا
بات چیت، ان کے عیوب و فضائل، ان کے محامد و معائب سب
نظر میں ہیں، تو آخر وہ کون سی دلیل ہے جس کی بنا پر ہم انہیں س
الاعتبار سمجھ لیں، آخر شہادت، در شہادت، در شہادت، در شہا
عقلاً، عرفاً، یا قانوناً کس اعتبار سے قابل سماعت نہیں امام شافعی
بتایا ہے، کہ قبول حدیث کا معیار کیا ہے۔

اخبرنا ابو محمد الربیع بن
سلیمان المرادی المؤذن
صاحب الشافعی بای شئ
تثبت معجز عن رسول اللہ
فقال قد کتبت هذه الحجة
فی کتاب جماع العلم فقلت اعد
من هذا مذهبك ولا تبال
ان یکون فیه فی هذا الموضع
فقال الشافعی اذا حدث
ثقة حتی ینتهی الی الرسول
فهو ثابت عن رسول اللہ

ابو محمد کہتے ہیں کہ میں نے امام
سے دریافت کیا کہ رسول اللہ
حدیث ثابت کس طرح ہوتی ہے
فرمایا میں اس بحث پر جماع ا
میں کافی لکھ چکا ہوں، میں نے
کہا، کچھ یہاں بھی دہرا دیجئے، تو ا
نے فرمایا کہ جب ثقہ، ثقہ سے
روایت کرکے رسول اللہ تک پہ
تو وہ حدیث رسول ہے، پھر
کسی حدیث کو اس وقت تک نہیں
چھوڑیں گے، جب تک ہمیں یہ نہ معلو

ہوتی ہے، اسے جب یقین ہوجاتا ہے کہ جس کی ثقاہت کی میں تصدیق و توثیق کررہا ہوں، وہ وہ ہے جس نے کبھی عمر بھر جھوٹ نہیں کہا۔ دروغ بیانی سے کام نہیں لیا، کذب ودجل اپنا پیشہ نہیں بنایا، اس کی ساری عمر حق پژوہی اور راست گوئی میں گذری۔ اس کی زندگی کا ایک ایک صفحہ، اس کی دیانت، راست بازی، اور صداقت شعاری کا، زبان حال سے ترجمان ہے۔ تب اس نے شہادت دی، کہ ہاں یہ ثقہ ہے۔ اگر اس کے بعد بھی وہ ثقہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا، تو آخر اور معیار صداقت ہے کیا؟ رہا یہ سوال کہ اب خود اس توثیق کرنے والے کی ثقاہت معرض بحث میں آتی ہے، تو اس کا جواب بھی وہی ہے، تا آنکہ یہ سلسلہ صحابہ تک پہنچ جائے، جو سب کے سب عدول تھے، اور ان سے رسولؐ تک۔ جس نے ان صحابہ کی توثیق کی، انھیں ستارہ بتایا کہ جو اس کی رہنمائی قبول کرے گا، ہدایت پائے گا اس طرح یہاں اگرچہ یہ مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔ لیکن؟

"رواۃ میں طبقہ اوّل صحابہ کا ہے، ائمہ حدیث نے یہ طے کردیا ہے کہ جملہ صحابہ ثقہ ہیں، صحابہؓ کرام کی عظمت اور جلالت شان کی وجہ سے، ہم اس اصول پر جو غیر صحیح، قرآن کے خلاف اور محض عقیدت مندی کا فیصلہ ہے، بحث کرنا پسند نہیں کرتے، لیکن اس امر پر اپنی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ حالانکہ اس عہد کے منافقین بھی جن کی بابت قرآن میں ہے، ومن اھل المدینۃ مردوا علی النفاق لا تعلمھم نحن نعلمھم، مسلمان کہلاتے تھے، رسول اللہ تک کو ان کے نفاق کا علم نہ تھا، نیز واقعہ افک میں

کتاب بھی ہے جس میں صرف "شہادت در شہادت ہے" اور بس یعنی موطا
مالک - امام مالک تبع تابعی ہیں، وہ زہری سے روایت کرتے ہیں
تابعی ہیں وہ صحابہ سے روایت کرتے ہیں جو بلا ریب و شک عدول ہیں
امام مالک کی ثقاہت میں کسی کو شبہ ہی نہیں، اسی طرح زہری بھی
ہیں اور صحابہ پر زبانِ طعن دراز نہیں ہو سکتی، غرض موطا کے جتنے بھی
ہیں وہ تین یا چار سے نہیں بڑھتے، اور وہ سرچشمہ نبوت کے ایسے قطرے ہیں جن کی
لطافت و پاکیزگی میں کون ہے جو شک کرے؟ موطا امام مالک کی یہی خصو
ہے جس کی بنا پر شاہ ولی اللہ صاحبؒ اصح کتاب بعد کتاب اللہ، موطا امام
ہی کو مانتے ہیں، پھر بخاری کو، پھر مسلم کو[1] لیکن اس کا کیا علاج کہ منکر
موطا کو بھی نہیں مانتے۔ آخر

فبای حدیث بعد اللّٰہ و — اللہ اور اس کی نشانیوں کے
اٰیاتہ یؤمنون۔ — وہ اور کس بات پر ایمان لائیں گے

چھٹا اعتراض نہایت سنگین اور بہت زبردست ہے،
"ثقاہت کو تولنے کی کون سی میزان ہو سکتی ہے؟ کیا یہی کہ ثقہ
ان کو ثقہ کہیں، پھر ان ثقہ کہنے والوں کی ثقاہت کا سوال آتا ہے
کے اوپر سوائے ظن اور تخمین کے کوئی اور شہادت نہیں ہو سکتی، لہٰذا
حدیث کا سارا دار و مدار شروع سے آخر تک ظن پر ہے"
آخر اس کے علاوہ اور میزان ہو کیا سکتی ہے کہ ثقہ کو ثقہ، ثقہ کہ
لیکن اس کے اس قول کی بنیاد ظن اور تخمین پر نہیں، بلکہ مشاہدہ اور تج

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، باب طبقات الحدیث ۱۲

خود قرآن نے کی اور حضرت علیؓ جن کو رسالت پناہؐ نے بمنزلۂ ہارونؑ کے کہا کیونکر ایسی غلطی فرما سکتے تھے، کیا قرآن اس ہستی کی برأت کر سکتا تھا؟ جو فتنہ و فساد میں ملوث ہونے والی ہو؟ کیا رسول اللہؐ اسے بمنزلۂ ہارون علیہ السلام کہہ سکتے تھے، جو جنگ و جدل کرے، نہیں اور یقیناً نہیں یہ صرف ان بزرگان امت کی اجتہادی غلطی تھی، جس کا بعد میں ہر ایک کو اعتراف بھی تھا اور ثبوت یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کو، اور حضرت عائشہؓ نے حضرت علیؓ کو کبھی بُرا بھلا نہیں کہا، بلکہ آپنے اپنے ذمہ سے درگذر فرمایا - اور اگر اسے فتنہ تسلیم کر لیا جائے، تو معاذ اللہ قرآن نے غلطی کی کہ برات کی رسولؐ نے (نعوذ باللہ) بیجا کیا، کہ حضرت علیؑ کو بمنزلۂ ہارون سمجھا۔ خدا ہم پر رحم کرے - ہماری لغزشوں کو معاف کرے، حالانکہ ایسا نہیں تھا قرآن کو تمام باتوں کا علم تھا - سرکار رسالتؐ کی چشم بصیرت ہر چیز کا مطالعہ کر رہی تھی، قرآن نے جو کچھ کہا سچ کہا، رسولؐ نے جو کچھ فرمایا، صحیح فرمایا، وَالذی جاء بالصدق وصدق به اولئك هم المتقون -

اب صحابہ کی عدالت پر گفتگو آتی ہے امت کا صحابۂ کرام کی عدالت و ثقاہت پر جو اجماع ہے، اور ان کو نقد و بحث اور جرح و تعدیل سے جو ماوراء تصوّر کیا جاتا ہے، اس کی وجہ "محض عقیدت مندی" نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے علامہ ابن حجر نے اس پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی پیش نظر رہے۔

جو لوگ شریک تھے، جن پر حد قذف پڑی، جن کی نسبت قرآن میں
دیا گیا، لا تقبلوا لھم شھادۃ ابدا، وہ بھی مسلمان کہے جا
تھے، علاوہ بریں ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہؐ نے حجۃ الو
کے خطبہ میں فرمایا تھا، لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعض
رقاب بعض" دوسری طرف جن لوگوں نے فتنوں میں پڑکر با
لڑائیوں میں ایک دوسرے کا گلا کاٹا، ان کو بھی ابوبکرؓ و عمرؓ کے س
ثقاہت کے پلے میں ہم وزن رکھ دیا جاتا ہے"۔

مقالہ نگار صاحب کا "اجتہاد" ان بزرگ کے متعلق کیا ہے ج
نے حسب بیان قرآن ایک نبی حضرت ہارون پر غصہ کیا، انہیں داڑھی
گھسیٹا اور ان کے تھپڑ مارا!

پہلے اس "فتنہ" کے مسئلہ کو بھی صاف ہو جانا چاہئے۔ پھر
صحابہ پر گفتگو ہوگی صحابہ کی باہمی لڑائیاں، مثلاً حضرت علیؓ اور حضرت
کی جنگ درحقیقت کسی نفسانی جذبہ کے ماتحت نہیں تھی، بلکہ "حسن
کے ساتھ غلط" فہمی کا نتیجہ تھی اور

الاعمال بالنیات اعمال کا مدار نیت پر ہے

اس لئے ان بزرگان امت کی یہ اجتہادی غلطی نہ فتنہ تھی، نہ
دوسرے کا گلا کاٹنے" کے مترادف، یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ حضرت
عائشہؓ کا ہمیشہ احترام فرماتے رہے۔ کبھی آپؓ نے ان کے
کوئی بدسلوکی نہیں کی۔ بلکہ ام المومنین ام المومنین کہتے رہے
اگر نفسیات کی خاطر ہوتی، کسی مقصد نفس کے ماتحت ہوتی، تو
صحابہ اس میں کیوں آلودہ ہوتے۔ اور خود حضرت عائشہؓ جن کی

باحسان رضی اللہ عنہم
ورضوا عنہ اور یاایہا النبی
حسبک اللہ ومن اتبعک
من المومنین اور للفقراء
المہاجرین الذین اخرجوا

من دیارہم واموالہم
یبتغون فضلاً من اللہ و
رضواناً وینصرون اللہ و
رسولہ اولئک ہم الصادقون ط

الی قولہ انک
رؤف رحیم فی آیات کثیرۃ
یطول ذکرہا واحادیث کثیرۃ
یکثر تعدادہا وجمیع
ذلک یقتضی القطع بتعدیلہم
ولایحتاج احد منہم مع تعدیل
اللہ لہ الی تعدیل احد من
الخلق علیٰ انہ لولم یرد من
اللہ ورسولہ فیہم شی مما
ذکرناہ لاوجبت الحال التی
کانوا علیہا من الہجرۃ والجہاد
ونصرۃ الاسلام، وبذل المہج
والاموال وقتل الآباء و
الاولاد والمناصحۃ فی الدین
وقوۃ الایمان والیقین القطع

غرض بہت سی آیتوں میں یہ ذکر موجود
ہے کہ صحابہ عادل ہیں، ثقہ ہیں ان
سب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی
تعدیل کے بعد اب وہ کسی تعدیل
کے محتاج نہیں ہیں۔ اور اگر خدا
ورسول کی طرف سے یہ کچھ نہ وارد
ہوتا جو ہم نے ذکر کیا ہے پھر بھی ان
کے گراں قدر خدمات، ہجرت
جہاد، اسلام کی مدد، جان کی قربانی
مال کی قربانی آباؤ واولاد کا قتل
راہ اسلام میں مناصحۃ فی الدین.
قوت ایمان، اور عزم وثبات، یہ
سب اس پر شاہد عادل ہیں کہ وہ عادل
ہیں اور وہ اپنے تمام مخالفین سے
اعلیٰ وافضل ہیں

اتفق اهل السنة على ان
الجميع عدول ولم يخالف
فى ذالك الا شذ وذ من
المبتدعة وقد ذكر الخطيب
فى الكفاية فصلہ نفيس
فى ذالك فقال عدالة الصحابة
ثابتة معلومة بتعديل الله
لهم واخباره عن طهارتهم
واختياره لهم فمن ذالك

حضرات اہل سنت اس پر متفق ہیں
تمام صحابہ عدول ہیں، اس باب میں
کوئی اختلاف نہیں ہے سوا مبتد
کی ایک مختصری ٹولی کے خطیب
نے کفایہ میں نہایت نفیس بحث
اس موضوع پر کی ہے، وہ کہتے ہیں
کہ صحابہ کی عدالت وثقاہت توخو
خدا کی تعدیل کے بموجب ہم مانتے
ہیں، مثلاً کنتم خیر امة اخرجت

قوله تعالیٰ كنتم خير امة
اخرجت للناس، وقوله و
وكذلك جعلناكم امة وسطاً
وقوله لقد رضى الله عن
المومنين اذ يبايعونك تحت
الشجرة نعلم ما فى قلوبهم
وقوله، السابقون الاولون
من المهاجرين والانصار و
الذين اتبعوهم باحسان
رضى الله عنهم ورضوا عنه
وقوله يا ايها النبى حسبك الله
ومن اتبعك من المومنين

رقوله للفقراء المهاجرين
الذين اخرجوا من ديارهم
واموالهم يبتغون فضلاً
من الله ورضوانًا وينصرون
الله ورسوله اولٓئك هم
للناس اور كذالك جعلناكم
امة وسطاً اور لقد رضى الله
عن المومنين اذ يبايعونك
تحت الشجرة نعلم ما فى
قلوبهم اور السابقون
الاولون من المهاجرين و
الانصار والذين اتبعوهم

صحیحة من حدیث عبداللہ
بن مغفل قال رسول اللہ
اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذن و
هم غرضاً فمن احبهم فبحبی
احبهم، ومن ابغضهم فببغضی
ابغضهم ومن اذاهم فقد
اذانی ومن اذانی فقد اذی
اللہ ومن اذی اللہ فلا یوشک
ان یاخذہ قال عبداللہ بن
هاشم الطوسی حدثنا وکیع
قال سمعت سفیان یقول
فی قولہ تعالی قل الحمد للہ
وسلام علی عبادہ الذین
اصطفیٰ قال هم اصحاب محمد
والاخبار فی هذہ کثیرة
فلنقتصر علی هذا
القدر ففیه مقنع[1]

سے بغض رکھتا ہے، جس نے ان کو
تکلیف پہنچائی اس نے مجھے تکلیف
پہونچائی اور جس نے مجھے تکلیف پہنچائی
اس نے اللہ کو اذیت دی، تو اس سے
بلاشبہ مواخذہ کیا جائے گا، عبداللہ
بن ہاشم طوسی کہتے ہیں، کہ مجھ سے
وکیع نے کہا کہ میں نے سفیان سے
سنا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ "اے
رسول کہدے کہ ان بندوں پر سلامتی
ہو جو پاک وصاف کئے گئے"، تو کہا کہ
وہ اصحاب محمد ہیں، جن کو اللہ نے
پاک وصاف کیا، اور اس جگہ
وہی مراد ہیں، اس موضوع
پر اور احادیث بھی بہت
زیادہ مروی ہیں، لیکن اس
جگہ اتنا کافی ہے۔

ابن حجر کی یہ بات بہت زیادہ وزن رکھتی ہے کہ اگر قرآن وحدیث
میں یہ کچھ نہ بھی وارد ہوتا تو بھی ان کی عدالت وثقاہت غیر مشتبہ اور شک
وشبہات سے پاک تھی، اس لئے کہ جس جماعت نے ہجرت کے مصائب
برداشت کئے ہوں، وطن عزیز کو چھوڑا ہو، عزیز واقربا کو چھوڑا ہو،

[1] مقدمۃ الاصابہ فی تمییز الصحابہ صفحہ ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵،

على تعديهم والاعتقاد
ولتزامتهم وانهم افضل
من جميع المخالفين بعدهم
والمعدلين الذين يجيئون من
بعدهم، هذا مذهب كافة
العلماء ومن يعتمد قوله ثم
روى بسنده الى أبي زرعة
الرازي قال اذا رأيت الرجل
ينتقص احدا من اصحاب
رسول الله فاعلم انه زنديق
وذالك ان رسول الله حق
والقرآن حق وما جاء به حق
وانما ادى الينا ذالك كله
الصحابة وهؤلاء يريدون
ان يجرحوا شهودنا ليبطلوا
الكتاب والسنة والجرح
بهم اولى وهم زنادقة
والاحاديث الواردة في
تفضيل الصحابة كثيرة
من اولها على المقصود ما رواه
الترمذي وابن حبان في

یہی تمام علماء کا مسلک ہے
زرعہ رازی کہتے ہیں کہ جب تم
ایسے آدمی کو دیکھو جو صحابہ میں
کسی کی تنقیص کر رہا ہو تو سمجھ
وہ زندیق ہے اور اسپر اپنا ایمان
رسول حق ہے، قرآن حق ہے او
کچھ وہ لایا ہے برحق ہے اور یہ
تمام لوگ جو ان پر جرح کرنا چا
ہیں، وہ کتاب و سنت کو باطل کرنا
ہیں، اور بہتر یہ ہے کہ خود ان پر جر
جائے، وہ سب کے سب زنادقہ ہیں
اور صحابہ کی تفضیل میں احادیث بھی
کثرت سے وارد ہیں، مثلاً ترمذی
حبان نے اپنے "صحیح" میں عبد
بن مغفل کی حدیث ذکر کی
میرے اصحاب کو اپنے خرافات
آڑ نہ بناؤ، جو ان سے محبت
ہے وہ میری وجہ سے ان سے مح
کرتا ہے جو ان سے بغض رکھتا
وہ مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ

…يبانی قال کنت احليل
…ابن مسعود لا يقول
…رسول الله ، فاذا قال
…رسول الله استقلته
…عدة وقال هكذا ،
او قريب من ذا ، او
…له

رسول اللہؐ کبھی نہیں کہتے تھے، اور
جب "قال رسول اللہؐ" کہتے تھے تو
مارے ڈر کے کانپنے لگتے تھے، اور
کہتے تھے کہ رسول اللہؐ نے "اس طرح
فرمایا" یا "ایسا ہی فرمایا" یا "تقریباً
ایسا ہی فرمایا، یا، یا، یا

…ڈر کا یہ عالم تھا، اپنی ذمہ داری کا یہ احساس تھا، رسول اکرمؐ پر غلط
…سے بچنے کی اس درجہ احتیاط تھی لیکن کرتے کیا؟ امت تک رسولؐ
…وۂ حسنہ" بھی پیش کرنا ضروری تھا، اس لئے حدیث بیان کرتے
… لیکن پورے حزم و احتیاط کے ساتھ۔ اب اگر اس کے بعد بھی
…کی عدالت و ثقاہت غیر مشتبہ ہے تو مجھے نہیں معلوم دنیا میں عدالت و
…ت کا معیار کیا ہے۔

اس جگہ ایک اور خیال کی تصحیح بھی ازبس ضروری ہے کہ احادیث
…دوین و اشاعت اور ضبط و کتابت کا سلسلہ بہت بعد میں شروع
…یہ سلسلہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ سے ہی شروع ہو گیا تھا چنانچہ
…جزائری کہتے ہیں کہ لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں کہ عصر صحابہ اور اوائل
…تابعین میں سوائے قرآن کے اور کچھ ضبط کتابت میں نہیں آیا تھا
…ثبوت اس کا بھی موجود ہے کہ کتابت کا کام خود عہد نبوی اور عصر صحابہ

تذکرۃ الحافظ، ذکر ابن مسعود الامام ربانی ۱۲

جہاد کیا ہو، اپنی جانیں قربان کی ہو، اپنا مال راہ خدا میں لٹایا
طرح طرح کے آفات و مصائب کا مقابلہ کیا ہو اور یہ سب
کے لئے کیا ہو، تو ان کو اگر عادل نہیں مانیے گا، تو کسے مانیے گا
یوں سمجھئے کہ مہاتما گاندھی جی کے حالات "نیشلسٹ" اور کانگ
کے سامنے ہیں۔ ان کی بنا پر کون ہے جو انھیں غیر عادل قرار
اور اگر ایسا کرے، تو یقیناً وہ نیشلسٹ نہیں، کانگریسی نہیں
طرح بلا تمثیل صحابہ کے حالات و واقعات کی موجودگی میں کو
جو ان پر زبان طعن دراز کرے اور اگر کرے تو وہ مسلمان
بقول ابن حجر کے زندیق ہے اور پھر قرآن و حدیث کی توثیق
نرا ظن نہیں، بلکہ آسمانی مہر ہے اور اس پر نظر ڈالیے کہ صحابہ
کرتے تھے، تو اپنی ذمہ داری کا وہ کس قدر خیال رکھتے تھے،
ان کے سامنے یہ وعید بھی تھی کہ

من کذب علی متعمداً فلیتبوا مقعدہ من النار — مجھ پر جو دیدہ و دانستہ در... کرے اسے چاہیئے کہ جہنم... بنائے۔

چنانچہ اس حدیث کے پیش نظر وہ حدیث بیان کرتے ...
تھے اور جب بیان کرتے تھے تو اس خیال سے کہ مبادا کوئی غلط...
ہیں ہو جائے، وہ لرزنے لگتے تھے، ان کی گھگھی بندھ جاتی تھی،
ابن مسعود صحابی جلیل القدر کا یہ واقعہ خاص طور سے غور طلب

عن ابی العمیس عن مسلم البطین عن ابن عمرو — عمرو بن الشیبانی کہتے ہیں ... مسعود کے پاس بیٹھا کرتا ...

کے سلسلے میں لائے جاتے ہیں ۔ اور ان کی پوست کشی کی جاتی ہے،
ت سے خبیث، کذاب اور دجال وغیرہ قرار دیئے جاتے ہیں،
ور بہتوں پر مہر توثیق ثبت ہوتی ہے، اور یہ سب کچھ محض ظن نری
تخمین "

اگر منکرین حدیث اس جرح وتعدیل کے نتائج کو جو قانون شہادت
سخت سے سخت شرائط کو پوری کرتے ہیں، محض ظن نری تخمین، قرار دیتے ہیں
پھر منکرین، قرآن کی زبان کیسے بند کریں گے ۔ شک جب بڑھتا ہے
مرض بن جاتا ہے اور وہم کہلاتا ہے، جس کا علاج لقمان کے پاس
بھی نہیں ۔

مقالہ نگار صاحب "ظن"، سے بہت خفا ہیں، فرماتے ہیں" حدیثیں بالاتفاق
حدیث تمام تر ظنی ہیں ... اور اللہ تعالے ظن کا روادار نہیں ....
ن یتبعون الا الظن ... وما یتبع اکثرھم الا ظنا ان الظن لا
غنی من الحق شیئا " صفہ ۱۷ اجامعہ ماہ ستمبر ۔ اگر ہر ظن قابل نفرت
ور ظن مطلقاً ممنوع وملعون ہے تو خدا معلوم آیات ذیل کی جبرا جبوری
تفسیر کیا ہوگی ۔

وقال للذی ظن انہ ناج منھما	یہاں حضرت یوسف کے "ظن" کا ذکر ہے
ستایس الرسل وظنوا انھم قد کذبوا ۔	یہاں عموماً حضرات انبیاء کے "ظن" کا بیان ہے ۔
ظن داؤد انما فتناہ ۔	یہاں حضرت داؤد کے "ظن" کا تذکرہ ہے
فظن ان لن نقدر علیہ احد	یہاں "ظن" کی نسبت حضرت یونس کی جانب کی گئی ہے
انی ظننت انی ملاق حسابیہ	یہاں ظن کو ایک مومن جنتی کی جانب منسوب کیا ہے

میں شروع ہوگیا تھا، چنانچہ زیدبن ثابت نے "علم الفرائض
کتاب تالیف کی تھی، اور بخاری نے اپنی "صحیح" میں وہ واقعہ
ہے کہ ابوہریرہ نے عبداللہ بن عمرو کو اپنے سے افضل بالحدیث
تسلیم کیا کہ وہ لکھ لیتے تھے[۱]، چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے
جو حکم ابوبکر بن حزم کو دیا تھا، وہ خود جلیل القدر تابعی تھے،
میں کسے سائب بن یزید، عباد بن تمیم، اور عمر بن سلیم الزرقی
اور خالدہ بنت انس سے حدیث روایت کرتے تھے۔ اور
بعد انھوں نے اسے لکھ لیا[۲]، اسی طرح زہری بھی جلیل القدر تابعی
انھوں نے بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے حدیث لکھی
مدون کی، زہری صحابہ میں سے ابن عمر، سہل بن سعد، انس بن
محمود بن الربیع، سعید بن المسیب اور ابامتہ ابن سہل سے
اور کبار تابعین سے روایت کرتے ہیں۔ ان کے شاگردوں میں
بڑے اساطین علم وفضل نظر آتے ہیں، مثلاً معمر، اوزاعی،
مالک اور ابن ابی ذئب وغیرہ[۳]، غرض یہ معاملہ تو بالکل صاف
کہ حدیث کی اشاعت اور کتابت کا کام عہد نبوی میں کچھ کچھ
صحابہ اور عصر تابعین میں باقاعدہ شروع ہوگیا تھا۔ آگے
نہایت دردناک منظر پیش کیا ہے، جس کے تصور سے رونگٹے
ہوتے ہیں کہ

صحابہ کے بعد ہر ہر طبقہ کے رواۃ ایک ایک کر کے جرح

---

[۱] و [۲] و [۳] توجیہ النظر ۱۲

عربوں کے آثار

دُنیائے علم و عمران میں

دنیا میں عرب نامی ایک قوم نمودار ہوئی، علم و اخلاق سے تہی مایہ۔ تہذیب و تمدن سے عاری، اور فنون و صنائع سے ناواقف۔

پاس ہی روم و ایران کے قصر فلک بوس اپنی عظمت و ہیبت کا اعلان کر رہے تھے، ان کی تہذیب و تمدن کا خورشید جہانتاب ایک عالم پر ضیا بار و کرم گستر تھا، لیکن عرب کا کاشانہ محروم تھا، وہ جاہل تھے بدخو تھے،

لیکن دیکھتے دیکھتے! وہ قوم ایک عالم پر چھا گئی، کشور کشائی اور ملک گیری میں کوئی اس کا ہم نبرد نہ رہا، علم و حکمت کی طرف جب متوجہ ہوئی تو یونان کے اسفار و اوراق کو کھنگال کر نئے علم، نئے فلسفے اور نئے نظریات سے علم و حکمت کی دنیا میں تہلکہ ڈال دیا، تعمیر و صنعت کی طرف توجہ مبذول ہوئی، تو الحمرا اور قصر زہرا کی بنیادیں پڑ گئیں، غرض عرصۂ حیات کے جس گوشہ میں داخل ہوئی، مظفر و منصور، دنیا کے جس چپہ پر قدم رکھا، فاتح و کشور کشا کی حیثیت سے علم و فن کی جس محفل میں داخلہ ہوا تو مسند علم و فن کے امتیاز خصوصی سے ؎

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرف غلط
لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

لولا اذ سمعتموہ ظن المومنون والمومنات۔	یہاں "ظن" کا انتساب مو… مومنات کی طرف ہے
خاشعین الذین یظنون انھم ملاقوا ربھم۔	یہاں مومنین خاشعین کے … حکایت کی گئی ہے

مقالہ نگار صاحب کے اصول پر تو یہ تمام ظنون وظنیات … نفرین ہونے چاہئیں۔

ساتواں اعتراض اور زیادہ اہم ہے "کہ قرآن اتحاد پیدا … اور حدیث تفریق۔

منکرین حدیث سے گذارش یہ ہے کہ ممکن ہے ایسا ہو، لیکن … زمانہ میں تو "اہل قرآن" برعکس معاملہ پیش کررہے ہیں۔ اچھا خا… تھا، اطمینان تھا، سب لوگ حدیث کو مانتے چلے آرہے تھے … ان ارشادِ عالیہ نے تفریق پیدا کردی ہے، اور یہ بڑھتی جائے گی … یہ سلسلہ جاری رہا۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا … من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب، والسلام … علیٰ من اتبع الھدیٰ

(جامعہ۔ اپریل …

آج تک مایۂ حیرت و استعجاب ہے، دوسری اقوام و امم کے مقابلہ میں عربوں کے مؤلفات کو جو ترجیح حاصل ہے وہ ہر شخص کو معلوم ہے مثلاً کشف الظنون کو لیجیے جس میں کتب و فنون کے اسماء سے متعلق مفصل معلومات پیش کئے گئے ہیں، ان کی تعداد جن کا کتاب میں ذکر ہے، ۱۲۰۰ تک پہنچتی ہے اور پھر شروح و اختصارات وغیرہ مستزاد، اور وہ تاریخی کتابیں جو سال و سنین کی حسن ترتیب کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں، مثلاً طبری، ابن اثیر، ابو الفدا، یا جو اقوام و ممالک کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئیں، مثلاً مسعودی، مقریزی، ابن خلدون، وغیرہ اس قبیل کی کتابیں تو حد شمار سے خارج ہیں ایسے ایسے مؤلف و مصنف بھی تھے، جو اپنی عبارت کی روانی و شگفتگی اور حسن استدلال کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ اکثر عرب مورخوں کو علماء مغرب نے "جگت گرو" تسلیم کیا ہے، یورپ کے علمی حلقے اس وقت تک ان کتابوں سے مستفید ہو رہے ہیں ابن خلدون ہی کو لیجئے اس نے اپنی مشہور تاریخ کی تالیف میں اور ترتیب میں ممالک و مساکن کا خاص طور سے خیال رکھا ہے، مغرب اور اندلس کے متعلق اس نے ایسے ایسے معلومات پیش کیے ہیں، جہاں تک کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔ تاریخ ابن خلدون کا مقدمہ خاص اہمیت رکھتا ہے، یورپ کے ایک مشہور عالم کا قول ہے کہ "ابن خلدون کا مقدمہ فلسفۂ تاریخ سے لبریز ہے کوئی بھی وہاں تک نہ پہنچ سکا، جہاں تک ابن خلدون کی طبع بلند پہنچی ہے، بلکہ میں تو کہتا ہوں روم و یونان کے علماء بھی اس گرد کو نہیں پہنچتے۔" فن جغرافیہ میں بھی عربوں کو تقدم کا شرف حاصل ہے، پہلے انھوں نے یونان وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا، ترجمے کے بعد انھوں نے اس فن کو اور بھی وسیع کیا، اپنے مشاہدات و تجربات سے اضافہ کیا، اس لئے کہ یہ قوم

ل زیدان تاریخ التمدن الاسلامی ج ۲۔ ص ۹۲

دنیا زود فراموش ہے، عربوں کے ملکات وفضائل لوگوں کے ذہن و
محو ہوتے جارہے ہیں، لہٰذا "یاد دہانی" کے طور پر اگر کبھی کبھی وہ داستان
زیب قرطاس وقلم ہوتی رہے، تو مضائقہ کیا ہے؟

صفحات ذیل مصر کے مشہور علمی رسالہ "المقتطف" کے ایک مقالہ کا
یہ پیش نظر رہے کہ رسالہ کا ایڈیٹر مسلمان نہیں عیسائی ہے،

ایک صدی کے اندر ہی اندر عربوں نے متعدد ممالک پر قبضہ کر لیا
کہ چین جیسے دور دراز مقام پر بھی ان کی فوجیں نظر آنے لگیں نتیجہ یہ ہوا
ہی دیکھتے ان کے نام سے دنیا کی قومیں لرزہ براندام ہو گئیں۔

ملک گیری سے جب ان کی طبیعت سیر ہو گئی، تو انھوں نے علم وفن کی
توجہ کی اور تھوڑے عرصہ میں اس میدان میں بھی وہ سب سے آگے نظر آنے
ایک طرف سلطنت عباسیہ کا آفتاب نصفت واقبال مائل بہ غروب تھا
طرف علم وحکمت کا مہر درخشاں طلوع ہو رہا تھا، اور آگے چل کر حکومت
ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی، بہت سے خود مختار عناصر پیدا ہو گئے، مگر علمی ترقی
جب بھی فروغ حاصل رہا پہلے اگر ایک مرکز تھا، تو اب علم وفن کی سرپرستی
مراکز ہو گئے۔

عربوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ مختصر مدت میں یونان، فارس اور
کے مختلف علوم وفنون کا عربی میں ترجمہ کر لیا ہو، بلکہ انھوں نے ان میں
پیدا کی، جدید اضافے کئے، اور نئے نئے نظریات قائم کئے، جو آج تک
فرنگ کے لیے اساس کا کام دے رہے ہیں۔

فن تاریخ میں عربوں نے ایسا امتیاز حاصل کیا تھا، کہ علماء مغرب کے

سے اپنے تمام اقران و اماثل میں ممتاز تھے۔"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عرب بس نقل و ترجمے کے ماہر تھے، علوم و فنون میں انھیں براہ راست کوئی دسترس نہیں حاصل تھی، بہ تحقیق انیق انہی "یورپ" زدہ حضرات سے ظہور میں آتی ہے جن کا سارا علم و فن رہین منت ہوتا ہے، استادان فرنگ کا یا ہمارے وہ نوجوان اس قسم کے اقوال کا اظہار کرتے ہیں، جو فرنگیت سے مرعوب و متاثر ہیں، ورنہ اس قول کا مہمل ہونا بالکل واضح و ظاہر و باہر ہے، وہ فرنگی علماء جن کو خدا نے عدل و انصاف کا مادہ دیا ہے، اس کے علی الاعلان معترف ہیں کہ عربوں نے نقل و ترجمے میں اپنی مہارت کا جو ثبوت دیا ہے اس سے کہیں زیادہ خود انھیں علوم و فنون میں دستگاہ تھی،

یونانی، سریانی، کلدانی وغیرہ میں طب پر جو رسالہ تھا، پہلے تو عربوں نے اسے حاصل کیا، پھر اس فن میں انھوں نے تغیر و تبدل کیا، اور حک و اصلاح سے کام لیا، بلکہ اضافہ و ایزاد کرکے بھی نہایت بیش بہا نمونے چھوڑے (کتاب تراث الاسلام میں ہے۔

"عربوں نے طب یونانی میں کافی اضافہ کیا، اور ان کا یہ اضافہ تجربہ پر مبنی تھا جو اس کا ثبوت ہے کہ وہ طب سے رسمی اور نظری طور سے ہی نہیں واقف تھے بلکہ عملی حیثیت سے بھی اس میں کافی ممتاز تھے۔"

اس بیان سے ان لوگوں کی تسکین ہوجانی چاہئے، جن کے خیال میں عربوں کا علم طب نظری تھا، اس فن میں ان کے بڑے قیمتی مؤلفات بھی ہیں، مثلاً ابن سینا کا قانون اور ابو القاسم خلف ابن عباس زہراوی اندلسی کی کتاب التصریف وغیرہ ان کتابوں سے فرنگیوں نے اپنی نہضت جدیدہ میں بڑے بڑے فائدہ اٹھائے ہیں، اٹھارویں صدی عیسوی تک عربوں کی بعض کتابیں یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں

خود ایک جہانگیر قوم تھی، الطلیموس کی بہت سی غلطیوں کی تصحیح عربوں ہی نے
اور یہ عرب ہی تھے جو صحرائے افریقہ تک پہنچ گئے، اور بلاد سوڈان میں
اپنے جھنڈے گاڑ آئے۔ گذشتہ اقوام سے عرب اس باب میں بھی ممتاز ہیں
نے فن جغرافیہ میں بہت سی کتابیں اپنے مشاہدات و تجربات سیاحت سے
تالیف کیں، زمین کے جو نقشے بنائے ان میں بھی ایک اسلوب بدیع کے
ہوئے ان کے لئے یہ فخر کافی ہے کہ کرہ پر نقشہ کھینچنے کا اصول سب سے
انھیں نے معلوم کیا، خط نصف النہار کا طول درجہ معلوم کرنے میں بھی عرب
سے اول رہے، مشہور عرب جغرافیہ دانوں میں مسعودی۔ بیرونی، ادریسی، یاقوت
مقریزی، قزوینی، اور ابن بطوطہ سے ہر شخص واقف ہے، ان سب میں ادریسی
کی وہ شخصیت تھی، کہ بارہویں صدی عیسوی میں تو اس کا کوئی ہمپایہ پیدا نہیں
ادریسی ہی نے روجر بادشاہ صقلیہ کی فرمائش سے ایک کتاب "نزہتہ المشتاق
فی اختراق الآفاق" تالیف کی جس میں بلاد و ممالک کا نہایت تفصیلی تذکرہ
اس کے علاوہ اس نے روجر کے لئے ایک نقشہ بھی تیار کیا تھا، جس میں اس زمانے
کے تمام قابل ذکر اقالیم کو دکھایا گیا تھا، ادریسی کی وہ شخصیت ہے کہ جو جغرافیہ
اور جغرافیۂ فرنگ کے درمیان سلسلۂ اتصال کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب تراث
میں ہے کہ

"بادشاہ روجر کا ایک مسلمان عالم سے جغرافیہ پر کتاب لکھانا اور نقشہ
بنوانا، اس بات کا ثبوت ہے، کہ مسلمان اس زمانے میں علمی اعتبار

---

۱ زیدان تاریخ التمدن الاسلامی ج ۲ ص ۱۸۱ ۲ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا ادو
۳ کتاب تراث الاسلام Legacy of Islam

بھی عربوں ہی کا رہین منت ہے، ترلیف (بہتے ہوئے خون کو روکنے) کے لئے ٹھنڈے پانی کا تریڑا دینا بھی عربوں ہی کی ایجاد ہے۔ شانہ اتر جانے کی صورت میں اسے بٹھانے کے لئے وہ بھی وہی طریقہ استعمال کرتے تھے جو آج کل رائج ہے۔ اسی طرح جذام، چیچک، کھسرا، وغیرہ کی شکل وصورت اور خصائص وغیرہ کے متعلق عربوں نے تحریری سرمایہ پیدا کیا۔

طب کے درس اور مریضوں کے علاج کے لئے ایک خاص عمارت مخصوص ہوتی تھی جس کو وہ "بیمارستان" کہتے تھے، اور جس طرح آج کل طبی درسگاہوں سے لوگ سند فراغت حاصل کرکے نکلتے ہیں، وہاں سے بھی وہ طبابت کی سند لے کر نکلا کرتے تھے، علاج کے لئے جو عمارت مخصوص ہوتی تھی، اس میں ہر قسم کا ضروری سامان اور آلات موجود رکھنے کا کافی انتظام تھا، "نرسنگ" کے لئے ملازم تیمارداروں (خدام) کی ایک جماعت ہر وقت موجود رہتی تھی، جو امراض ان کے زمانہ میں معروف تھے، ان کے علاج کے لئے الگ الگ وارڈ (غرفہ) تھے[۱]

علم الجراحت سے متعلق تحقیق و انکشاف کا سہرا زکریا رازی کے سر ہے، اور ان لوگوں میں جنہوں نے عمل بالید، سرجری، اور آلات وغیرہ کے استعمال میں خاص مہارت حاصل کرلی تھی، ابوالقاسم خلف بن عباس الزہراوی کو خاص امتیاز حاصل ہے۔[۲]

صیدلة (دوا سازی)، اور جڑی بوٹی کی تحقیق و تفتیش پر بھی عربوں نے خاص طور سے اپنی توجہ مبذول کی، چنانچہ ہندوستان اور دوسرے ممالک سے اس باب میں نہایت

[۱] زیدان تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۱۸۰

[۲] ابن ابی اصیبعہ طبقات الاطباء ج، ص ۱۸۳

[۳] ڈاکٹر احمد عیسیٰ۔ آلات الطب والجراحت عند العرب ص ۴-۵

داخل رہیں، عربوں میں جن لوگوں نے فن طب میں غیر معمولی مہارت حاصل کی، بھ
جسے تفصیل مطلوب ہو، طبقات الحکماء، تراجم الحکماء اور کشف الظنون وغیرہ کی
رجوع کرے، یہ بات بہر حال ثابت ہے کہ طب اور صیدلتہ میں عربوں نے
حیثیت حاصل کر لی تھی،

اس طب کو ایک باقاعدہ نظام کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، ایک افسر
کا امتحان لیتا تھا، ممتاز طالب علموں کو بھی انعام ملتا تھا، چنانچہ صرف بغد
بزمانہ خلیفہ مقتدر باللہ ان کی تعداد آٹھ سو تک پہنچ گئی تھی، اور ان میں
افراد مستثنیٰ تھے جو خدمت سلطانی کے لئے مامور تھے۔

اس فن میں صرف مردوں ہی کو کمال نہیں تھا، بلکہ عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش
تھیں، مثلاً اخت حفید اور اکی دونوں بیٹیاں، ان عورتوں کو خاص طور پر امراض نسوانی کی معا

موجودہ زمانہ میں جو طریقہ رائج ہے، عرب اس سے بے خبر نہ تھے، ان
ہاں بھی باقاعدہ نبض دیکھی جاتی تھی، پیشاب کا معائنہ کیا جاتا تھا اور وہ لوگ
یونان کے افکار و آرا پر داد تحقیق و تنقید بھی دیتے تھے یونانی کتابوں پر انھوں
جو حاشئے لکھے تعلیقیں تیار کیں، مفید اور مناسب اصلاحات کیں، ان کے
اور متعدد طریقوں سے وہ اس فن کو جلا دیتے رہتے تھے، وہ عرب ہی تھے
نے طب میں کلوروفارم جیسی چیزوں کو معالجہ کے لئے ضروری قرار دیا،
آج کل جراحت کے لئے داغ دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، اسی طرح وہ بھی
تھے، عربوں ہی نے سب سے پہلے مرض سل میں ناخونوں کے ٹیڑھا ہوجانے کو
ایک علامت کی صورت میں معلوم کیا، یرقان اور ہیضہ کا علاج دریافت کرنے
ہی کو شرف اولیت حاصل ہے، جنون کے مرض میں افیون کے فوائد کا انکشا

۱؎ ابن ابی اصیبعہ طبقات الاطباء، ص ۲۲۲۔ ۲؎ ابن ابی اصیبعہ۔ طبقات الاطبا۔

تھے، مصور اس کے رنگ پتیوں کی تعداد، شاخوں اور جڑوں کا پورا پورا اندازہ کرکے بالکل اسی طرح اس درخت کی تصویر کھینچتا تھا، اور ہوبہو اس کی نقل اتار کے رکھ دیتا تھا، اس سلسلہ میں رشید الدین نے نہایت دلچسپ طریقہ اختیار کیا تھا، یہ ر وہ پہلے مصور کو پودے کی بالکل ابتدائی شکل دکھلاتے تھے، اس کی تر و تازہ صورت کی طرف متوجہ کرتے تھے، اور مصور اس کی تصویر لے لیتا تھا، پھر جب وہ پودا بڑھ جاتا تھا، اس میں دانے آجاتے تھے، تو پھر اس کی تصویر لی جاتی تھی، پھر جب وہ پودا خشک ہو جاتا تھا، اور گرنے کے قریب ہوتا تھا تو پھر اس کی تصویر لی جاتی تھی، اس تحقیق کا یہ نتیجہ ہوتا تھا، کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا کہ گویا وہ بچشم خود پودے کی اس نشو و نما، اور تغیر و تبدل کا معائنہ کر رہا ہے، ظاہر ہے یہ تحقیق کتنی کامیاب اور مکمل ہوتی ہوگی [1] "

میں نہیں سمجھتا کہ آج کل کے ماہرین علم نباتات ابن الصوری سے زیادہ تحقیق و تدقیق کا ثبوت دے سکتے ہیں؛

روں نے طبیعات (فزکس) پر بھی اپنی محنت و کوشش صرف کی چنانچہ اس ب میں بھی نئی نئی بحثیں ان کی بدولت ہمیں نظر آتی ہیں، پہلے تو انھوں نے یونانی بوں کا ترجمہ کیا، اور ترجمے کے بعد اس فن میں انھوں نے حسب عادت عت کی، بہت سے مسائل کا اضافہ کیا، ان کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ روز بروز نے لئے وہ نئی راہیں پیدا کرتے رہے انھوں نے ایسے آلات بنائے تھے کہ جن کے ذریعہ سے وہ ثقل نوعی تک کا حساب رکھتے تھے، ایسے ایسے لے انھوں نے تیار کئے تھے کہ ایک گرام کے ۴۰۰ر حصہ سے کم وزن فرق تک وہ معلوم کر لیتے تھے، نظریہ جذب کے متعلق بھی ان کے

---

[1] ابن ابی اصیبعہ طبقات الاطباء ج ۲ ص ۲۱۹

وسعت قلب سے انھوں نے فائدہ اٹھایا، یورپ تک کو اس کا اعتراف ہے
دوا سازی کے بانی ہونے کا فخر عربوں ہی کو حاصل ہے[1] یورپ میں آج بھی
سی جڑی بوٹیاں انھیں ناموں سے معروف ہیں، جو عربوں کے رکھے ہوئے
فن کیمیا کے بہت سے مرکبات عربوں ہی کی بدولت عالم وجود میں آ
عمل تقطیر، عمل ترشیح، عمل تذویب، بخارات بناکے عرقوں کی کشید قلمیں
الکحل تیار کرنا، یہ سب وہ چیزیں ہیں، جنہیں پہلے پہل عربوں ہی نے جا
بہت سے معدنی تیزاب اور نباتاتی قلویات (کھاری چیزیں) اور معدنی
عربوں نے معلوم کیں، ان تمام چیزوں میں ایسی مجتہدانہ نظر رکھتے تھے کہ بہت
قدیم کیمیاوی نظریات کو انھوں نے باطل کر دکھایا،

ارباب نظر سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ بارود کو مرکب کی
میں عربوں ہی نے پیش کیا، ابن اثیر کا قول ہے کہ عربوں نے بعض ایسی
ایجاد کی تھیں، کہ اگر وہ لکڑی پر مل دی جائیں تو آگ ان پر اثر نہیں کرتی
کی صنعت میں بھی عربوں نے اپنے کمال کا سب سے اعتراف کرایا، ہمیں یہ
نہیں کرنا چاہیے، کہ علم نباتات میں بھی عربوں نے ایک استاد کی حیثیت اختیار
تھی، اس علم میں ابن بیطار، اور رشید الدین ابن الصدری غیر فانی شہرت
ہیں۔ موخر الذکر کو اس فن کی تحقیق و تجسس کا یہاں تک سودا تھا کہ:

"ان کے ساتھ ہمیشہ ایک مصور رہتا تھا، (جب وہ گھاس پات
بوٹی کی تحقیق کے لیے نکلتے تھے، مصور کے پاس ہر طرح کے رنگ اور سامان
رہتے تھے، جب رشید الدین ایسے مقام پر پہنچتے تھے جہاں نباتات کی
ہوتی تھی، تو وہ اس کا مشاہدہ کرتے تھے، تحقیق کرتے تھے، پھر مصور کو

[1] زیدان تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۱۸۱

کی مجلس پر راگ کے اثر سے گریہ طاری ہو گیا، اور ہر شخص بے حال ہو گیا، اس کے بعد اس نے پھر اپنی لکڑیوں میں ایک خفیف سا تغیر کیا، اور بجانے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ حضارِ محفل پر غنودگی طاری ہوئی، اور دربان تک خراٹے لینے لگا، فارابی نے لکڑیاں جیب میں رکھیں اور یہ جا وہ جا غائب ہو گیا۔[1] فضاءِ آسمانی میں پرواز کا خیال بھی سب سے پہلے عربوں کو آیا، سب سے پیشتر اس معاملہ کی طرف جس کا ذہن منتقل ہوا، وہ عباس ابن فرناس تھا، نفح الطیب میں ہے کہ

عباس نے اپنے جسم کو فضا میں اڑانے کی کوشش کی، پہلے تو اس نے اپنے بدن پر پَر جوڑے پھر دو بازو تیار کئے، جیسے چڑیوں کے ہوتے ہیں، اس کے بعد اس نے فضا میں کافی عرصہ تک پرواز کی، لیکن یہ پہلا تجربہ اس کے لئے ایک حد تک تکلیف دہ ثابت ہوا، اترتے وقت اس کے جسم کے پچھلے حصہ میں کچھ چوٹ آئی، اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ پرندہ اترتے وقت اپنے پچھلے حصہ سے زیادہ مدد لیتا ہے، عباس نے یہ غلطی کی کہ دُم نہیں بنائی۔[2]

اب ہمیں چاہیے کہ عربوں نے فنِ ریاضیات اور فلکیات میں جو ترقی کی تھی، ایک نظر اس پر بھی ڈال لیں، ان دونوں مسئلوں پر علماءِ یونان اور ہندوستان کا جو تحریری مواد تھا، اس سے استفادہ کے بعد عربوں نے ان مسائل میں بھی قابلِ قدر اضافہ کیا، حساب میں عدد کے خواص اور دوسرے متعلقات پر انھوں نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں، لفظ صفر بھی سب سے پہلے عربوں کے قلم سے نکلا، کسرِ عشری بھی عربوں ہی کا وضع کیا ہوا ہے، نو کا عدد گرا کے جمع کرنے کا اصول بھی عربوں ہی کی جانب

---

[1] ۔ ابن خلکان۔ ج ۲ ص ۷۷

[2] ۔ المقری، نفح الطیب ج ۲ ص ۲۳۱

بہت سے اقوال ملتے ہیں[1] روشنی کے متعلق بھی ان کے مستقل نظریات ہیں
سے پہلے کسی کی رسائی ذہن وہاں تک نہ ہوئی تھی، بلکہ اس مسئلے میں انھوں
بہت سے اضافے کیے، یونانیوں کی صحت طلب آرا و افکار کی تصحیح کی،
مسئے پر اگر آج عربوں کے اضافے نہ ہوتے تو یہ مسئلہ اس منزل تک نہ
جہاں آج نظر آرہا ہے، بعض ارباب نظر کا خیال ہے کہ اس مسئلے پر عربوں
مقالات و نظریات ہی کی بدولت دور بین کی ایجاد عمل میں آئی ہے[2] امراض چشم
ان کی تشریح سے متعلق بھی عربوں کا بہت سا تحریری رسالہ موجود ہے[3]

موسیقی میں وتر خامس عربوں ہی کی ایجاد ہے، جسے زریاب نے اندلس
کیا تھا، قانون بھی عربوں ہی کا ایجاد کردہ ہے، اس کی موجودہ ترکیب (ساخت
کی دی ہوئی ہے[4] یہ مشہور قصہ تو اکثر کو معلوم ہے کہ فارابی نے ایک باجہ ایجاد
جو صرف دو لکڑیوں سے بنا تھا ان لکڑیوں کی ترتیب میں جب ذرا سا تغیر
تو مختلف قسم کے راگ نکلنے لگتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ وہ سیف الدولہ
میں حاضر تھا، اس سے سوال کیا گیا کیا تم گانے بجانے سے کچھ ذوق رکھتے
فارابی نے اثبات میں جواب دیا، پھر اپنی جیب سے ایک خریطہ نکالا، اسے کھو
اس میں سے دو لکڑیاں نکالیں، انھیں ایک خاص انداز میں ترتیب دیا، اور
شروع کیا، تو یہ حال ہوا کہ مجلس میں جتنے لوگ تھے سب کا ہنستے ہنستے
ہو گیا، پھر ان لکڑیوں کی ترکیب میں ایک خاص تغیر کیا، اور بجانا شروع کیا

---

[1] - ڈاکٹر صروف، بسائط علم الفلک ص ۲۲
[2] - انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔
[3] - کاجوری۔ تاریخ الفزکس، ص ۲۳
[4] - ابن خلکان ج ۲ ص ۷۸

ایک مدت دراز تک یہ لوگ اس سے استفادہ کرتے رہے، مثلثات میں بھی عربوں نے بہت جدت سے کام لیا، نسب مثلثہ کے عدادیں، عربوں ہی نے سب سے پہلے مماس کو داخل کیا[1] تناسب جیوب کا قانون بھی عربوں ہی کے انکشاف کا نتیجہ ہے، اور ان کے فخر کو یہ کافی ہے کہ کروی مثلثات کے حل کا عام قاعدہ انھیں نے بنایا، نظیر مماس، اور قاطع اور اس کی نظیر، ان چیزوں کے لئے جدولیں بھی سب سے پہلے عربوں نے تیار کیں اور واقعہ تو یہ ہے کہ علم المثلثات میں عربوں نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی کہ پھر اس پر خاص طور سے کوئی اضافہ کیا جاتا، چنانچہ علماء فرنگ کو بھی اس کا اعتراف ہے،

فلکیات میں بھی عربوں نے اپنی ذہانت و قابلیت، اور ایجاد و اختراع کا ایک زمانے سے لوہا منوا لیا، انھوں نے سابق فلکی علماء کی طرح یہ نہیں کیا کہ نظریات ہی قائم کر کے رہ گئے ہوں، بلکہ انھوں نے اس فن کو عملیات میں داخل کر لیا، رصد وغیرہ کا قائم کرنا بعض نہایت اہم نظریات فلکی عربوں ہی کے جد و قاد کا نتیجہ ہیں، انھوں نے بہت سے رصد خانے قائم کئے، اور ان میں منفعت بخش ارصاد کا انتظام کیا، اس فن میں انھوں نے ایسی مہارت کا ثبوت دیا، کہ علماء فلکیین دنگ رہ گئے، کوئی ان کی برابری نہیں کر سکا، مغرب نے بھی عربوں کے تفوق کو تسلیم کیا ہے، یہاں تک کہ لالاند، مشہور فرانسیسی عالم فلکی بتانی کو ان بیس علماء فلکیین میں شمار کرتا ہے، جو اپنی مہارت و خصوصیات کے اعتبار سے ساری دنیا میں فرد ہیں[2] زمین کی کرویت پر بھی عربوں کے بہت

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا، مادہ مثلثات و نصیر الدین طوسی، شکل القطاع۔ ص ۱۲۶

[2]۔ ملاحظہ ہو مقتطف، بابت ماہ جنوری ۱۹۳۰ء

منسوب ہے[1] ہندی ہندسوں کو انھیں نے نقل کر کے رواج دیا۔ خوارزمی
ایک تالیف میں لکھا ہے کہ موجودہ ہندسے ہم کو ہندیوں سے پہنچے ہیں[2]
سے انگریزوں نے لئے ہیں،

فن جبر و مقابلہ میں اگر یونانیوں کو کچھ درک تھا بھی تو بہت ناقص،
تردید یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ فن بھی عربوں ہی کے وضع کردہ فنون میں
ایک ہے، کاجوری کا قول ہے کہ جب اس پر نظر جاتی ہے کہ عربوں
جبر و مقابلہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، تو عقل حیران رہ جاتی ہے،
پہلے لفظ جبر کا استعمال بھی عربوں نے کیا اور ان سے انگریزوں نے
اس فن پر انھوں نے مستقل نظریات بھی قائم کئے تھے، جو اس وقت تک
ہیں، معادلات کے لئے حلول جبری و ہندسی بھی، انھیں نے ایجاد کئے
ثانیہ اور ثالثہ کے لئے معادلات سے بھی انھوں نے سب سے پہلے دنیا کو
کرایا، اس فن میں عربوں نے ایسی ایسی ایجادیں کیں کہ علماء فرنگ آج تک
بدنداں ہیں، کاجوری کا قول ہے کہ معادلات تکعیبی کا حل جو قطوع مخروط
واسطے سے ہوتا تھا، عربوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہے،[3] درجہ رابعہ کے معادلات
کے بعض اوضاع بھی انھوں نے حل کئے ہیں[4] مامون کے حکم سے محمد بن
نے اس علم پر ایک کتاب شائع کی، جس نے بڑی شہرت حاصل کی جس سے
دنیا میں خوارزمی کا نام پھیل گیا، علماء فرنگ نے فن جبر پر جتنی کتابیں
وہ اسی کتاب پر مبنی تھیں، یہ کتاب فرنگیوں کے کورس میں بھی داخل رہی

[1] - کتاب تراث الاسلام ص ۳۹۴
[2] - سمث کارپنکی - الارقام الہندیہ العربیہ ص ۵
[3] و [4] کاجوری تاریخ الریاضیات، ص ۱۰۷

و فاکا ہے لیکن اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ انکشاف کا سہرا البوالونا
ے علاوہ کسی اور کے سر نہیں ہے[۲]

جب عربوں نے علیش و عشرت کے میدان میں قدم رکھا، تو اس میں بھی وہ سب
ی لے گئے، ایک طرف اگر علوم و فنون میں انھوں نے اپنی نظریات و خیالات
ندرت کاریوں سے ایک عالم کو محو حیرت بنا رکھا تھا، تو دوسری طرف
م و انجمن میں بھی وہ سب سے پیش پیش تھے، ان کی بزم آرائیاں آج تک
ں کی زبانوں پر اور کتابوں کے اوراق پر محفوظ ہیں، انھوں نے جب شعر و
عری کی طرف توجہ کی تو اس میں ایسا کمال پیدا کیا کہ میدان میں کوئی حریف
ں رہ گیا، جب موسیقی کی طرف ان کی نظر متوجہ ہوئی، تو ایسے راگ اور باجے
دکے کہ مرور ایام کے باوجود آج تک وہ باقی ہیں، جب انھوں نے تعمیر
طرف عنایت کی تو ایسے ایسے قصور و محلات تیار کر کے کھڑے کر دیئے، کہ
یں جنت کا نمونہ قائم کر دیا، ان کی عمارتوں کی خوبی و خوشنمائی، سنگینی و استحکام
ناسب و تناسق پر جب نظر پڑتی ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے، ایک نظر
کی عمارت، دمشق کی جامع اموی، اور اندلس کے قصور و معبد پر ڈالو، تو
ت اب بھی وہاں سجدہ ریز نظر آئے گی،

الحمراء کی قرار واقعی خصوصیات میں بیان کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا،
ت میں نے اس کے متعدد اوصاف مقالات کتب میں پڑھے ہیں، جو مشاہدہ
ی ہیں اور ہر وصف ایک دوسرے سے علیحدہ، یہ نتیجہ ہے الحمراء کی عجوبہ
وں اور حیرت فروشیوں کا اس کی عظمت و جلال ہندسی دنجنیرنگ، اکا کون

- کاجوری - تاریخ الریاضیات ص ۱۰۵ -
- کتاب تراث السلام ص ۲۹۵ -

سے اقوال ملتے ہیں، ان کا یہ خیال بھی تھا، کہ زمین ایک محور پر گردش
ہے، بڑی منفعت بخش زیجیں بھی انھوں نے ایجاد کیں، زمین کے
کی حرکت عربوں نے بیان کی، گرمائی اور سرمائی اعتدالوں کی قیمت میں
نے اصلاحیں کیں، فلک معدل النہار پر فلک بروج کے میل کی قیمت
بھی عربوں نے ہی کیا، اور تعجب خیز امر یہ ہے کہ اس میل کا حساب
ہے، اپنی رصد میں انھوں نے ایک دقیقہ تک کا حساب رکھا تھا
زمین سے کتنا بلند ہے ؟ اس سوال کا جواب جو انھوں نے دیا تھا
وہی ہے جو آج کل کے علماء فلکیات دیا کرتے ہیں[1] آلات رصد میں
بھی عربوں کی ایجاد ہے، غرض اس فن میں انھوں نے غیر معمولی اضافے
ہیں تے "وسائط علم الفلک" میں دیکھا ہے کہ پچاس فیصدی ستاروں
نام وہی ہیں جو عربوں نے رکھے تھے[2] اور آج تک وہ فرنگی زبانوں
استعمال ہو رہے ہیں اس فن میں ان کی مہارت اور کمال کا اندازہ اس
کیا جا سکتا ہے، کہ بعض فلکی علماء نے ایسے مکانات بنائے تھے
آسمان تھا، آسمان پر تارے تھے، بادل تھے، بجلیاں تھیں، سب
اور دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ سچ مچ آسمان کے
ہوا ہے[3] علمائے مغرب کا اس میں اختلاف ہے کہ حرکت قمر میں انواع
اکتشاف کا سہرا کس کے سر ہے ؟ بعض لوگ تیخو براہی کا نام لیتے ہیں

---

۱ ۔ اسماعیل مظہر ۔ تاریخ الفلک العربی، ص ۴۵، ۶۶
۲ ۔ اسماعیل مظہر ۔ " " ص ۴۶
۳ ۔ نالینو کتاب علم الہیئۃ ص ۱۳۷
۴ ۔ المقری، نفح الطیب ج ۲ ص ۲۳۱

پین کے ایک بہت بڑے انجنیر کا بیان ہے کہ "جب میں مسجد قرطبہ کو دیکھتا ہوں تو
وس کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں سب سے بڑا اور اہم اور قابل ذکر تحفہ جو ہے
ہی مسجد ہے، میرا خیال تو یہ ہے کہ دنیا اب تک اس مسجد کی نظیر نہیں پیش کر سکی۔"
ے چل کے وہ کہتا ہے، کہ مختلف قسم کی صناعات ہیں اور پانی کو طرح طرح کاٹ
ے نکالنے میں عربوں نے جو طریقے اختیار کئے تھے، عہد حاضر کا فن اب تک
ہاں نہیں پہنچ سکا۔ فلسفہ میں عربوں نے جو کمال حاصل کیا تھا، اس سے ایک
نیا واقف ہے، کندی، ابن سینا، ابن ہیثم، اور ابن رشد وغیرہ ان اساطین میں
یں کہ اب تک بہت سے دانشوران مغرب ان کی خوشہ چینی کو اپنے لئے باعث
سمجھتے ہیں۔

عربی حضارت و تمدن کے بحر بے پایاں کے یہ چند قطرے تھے، جو اس صحبت میں
یش کئے گئے، مغربی علماء نے عربوں کے عمران و تمدن پر بہت سیر حاصل بحثیں
ہیں، جن میں سے ہر ہر گوشہ ایک دفتر کی حیثیت رکھتا ہے فرنگی علماء نے
ب کبھی عربوں کے آثار کی جستجو کی، تو ان پر یہ حقیقت روشن ہو گئی، کہ عرب ہر
یز میں سبقت لے چکے ہیں، ایک بڑے مغربی دانشور کا قول ہے۔ "بہت سی
یجادات و اختراعات کو ہم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ یہ ہمارے مساعی کا نتیجہ ہیں،
ن تھوڑے ہی عرصہ کی کاوش کے بعد ثابت ہو گیا، کہ ہمارا خیال غلط تھا،
ب ان چیزوں میں ہم سے مدت ہوئی بازی لے جا چکے ہیں۔"

پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو ایسے قدرشناس مغربی علماء
ں جو قدم قدم پر عربوں کی رہنمائی، اور دستگیری کے قائل ہیں، اور دوسری
ف ایسے حق ناشناس بھی جو اپنے زعم علم میں اس کی ضرورت کبھی محسوس

مقری۔ نفح الطیب، ج ۱، ص ۲۲۰،

انکار کر سکتا ہے؟ مغربی علماء نے بھی الحمرا کے گن گائے ہیں، اور اس کی
صنعت اور استحکام عمارت کا اعتراف و اقرار کیا ہے، فرنگیوں نے محلات
کے نام "حمراء" اور "گزار" (یعنی حمرا اور قصر) رکھنا شروع کئے حمرا (ح
ہی ان کے یہاں قصر کے پڑ گئے، جو خوب صورت ہو مضبوط ہو، اس کے
ہو، طرح طرح کے پھول ہوں، غرض ہر چیز سے آراستہ و پیراستہ
قصر حمراء عربوں کی جاہ و حشم اور عیش و تنعم کی ایک زندہ یادگار ہے
کے خیال سے اشبیلیہ کے قصر کبیر اور اندلس کے قصر زہرا اور قصر ز
کا ذکر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ قصر زہرا میں سنگ مرمر اور دوسرے
کے نادر پتھروں کو اس حسن و خوبی سے استعمال کیا گیا تھا کہ قوت بیان ا
سے عاجز ہے اس میں سیکڑوں طلاء سرخ کی مورتیں تھیں، مثلاً عق
گھڑیال، شاہین وغیرہ ان میں سے ہر مورت ہیرے جواہرات سے م
فوارے کی طرح اس کے منہ سے پانی نکلتا رہتا تھا۔[2]
یہ عمارتیں کیا نہیں ہمارے شعرا اور ادبا کے لیے ایک اچھا خا
ہاتھ آگیا، مختلف شعراء نے اپنے اشعار میں اور ادبا نے اپنی نثر
کے کمالات و خصوصیات، حسن و جمال تشریح و تعبیر اور اصلی تصو
اپنا پورا زور قلم صرف کر دیا،
سطور بالا میں فن تعمیر کی چند نادر مثالیں پیش کی گئیں، ان کے علا
اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں حضارت و تمدن کے جو نمونے نمو
گئے وہ ایسے ہیں کہ عصر حاضر کے بڑے بڑے علما بھی ان کا اعتراف

---

[1] ۔ مجلۃ الکلیۃ جلد ۱۵ ص ۲۳۰
[2] مجلۃ الکلیۃ " " "

صرف کردیں اور بالآخر انھوں نے وہ میراث عہد حاضر کو سپرد کر دی۔"

ڈاکٹر سارطون نے جامع امریکہ، بیروت میں ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

"بعض مغربی علما، خواہ مخواہ عربوں کی جلالت علمی کا اعتراف نہیں کرتے، قرون وسطیٰ میں عربوں نے علم و فن کو جو فروغ دیا اس کا اقرار کرتے ہوئے وہ ہچکچاتے ہیں، کہتے ہیں عربوں نے یونانی علوم و فنون کو نقل و ترجمہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا، یہ ایک بہت بڑی غلط بیانی ہے اگر ہم اسے فرض بھی کرلیں کہ نقل و ترجمے کے علاوہ انھوں نے کچھ اضافے نہیں کئے، تب بھی کیا یہ دنیا کی ایک عظیم الشان خدمت نہیں تھی؟ اگر ان کے "ترجمے" آج نہ ہوتے تو ہم ترقی کی اس منزل پر نہ ہوتے بلکہ اب تک ہم قرون وسطیٰ ہی میں نظر آتے۔"

ڈاکٹر سارطون کا یہ خیال بھی ہے کہ انکشاف سے اگر فائدہ نہ اٹھایا جائے تو اس کی حیثیت کچھ نہیں رہ جاتی، لیکن جو انکشاف سے فائدہ اٹھائے، اس کو برتنا سیکھے وہ بھی ڈاکٹر صاحب کی نظر میں اس کا مستحق ہے کہ اسے موجد مانا جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں،

"قرون وسطیٰ میں عرب دنیا کے سب سے بڑے معلم تھے، عربوں کے نقل و ترجمہ کی حیثیت میکانکی نہیں تھی کہ نقطہ پر نقطہ رکھ دیا، یا ہو بہو چربہ اتار دیا، بلکہ ان کی چیزوں میں روح تھی، زندگی تھی، انھوں نے یونان سے علوم و فنون

نہیں کرتے کہ اپنے مآخذ و مصادر کا تذکرہ کردیں اس لئے کہ اس
ذکر آجائے گا، اور اسے وہ پسند نہیں کرتے لیکن ایسے انصاف
بہرحال موجود ہیں، جو نہایت فراخدلی سے عربوں کی علمی وعمرانی خد
خندہ جبینی کے ساتھ کرتے ہیں۔

فلوریان کا قول ہے کہ " اپنے زمانے میں عربوں نے علوم و فن
میں جو کچھ کیا، ویسا کوئی نہیں کرسکا، اگر ہم یہ کہیں کہ یورپ ان کے
کی بنا پر ہمیشہ ان کا رہین منت رہا (اور شاید رہے گا۔ ؟ مترجم) تو
ہے، بالخصوص تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کی نہضت
یہ خدمت ایک بہت بڑی عامل تھی۔"

بلاشبہ حضارت عرب ایک حلقۂ انصال ہے، ایران ویونان
روما وغیرہ یعنی حضارت قدیم اور حضارت جدید کے درمیان، وہ
تھے، جنہوں نے یونان وغیرہ کے علوم کو ضائع ہونے سے بچایا
جنہوں نے ان علوم وفنون کو عربی میں منتقل کیا، وہی تھے جنہوں نے
فنون پر اضافے کئے، اور بالآخر اسپین کی راہ سے یہ سارا سرمایہ
دیا، کا جوری اور سمت اعتراف کرتے ہیں کہ ریاضیات اور فلکیات
سب کے استاد تھے، یاردن وی فو کہتا ہے،

" یونان نے جو علمی ورثہ چھوڑا، رومی اسے نہ قائم رکھ سکے
اس کی قدر کرسکے، لیکن عربوں نے اس میراث کی حفاظت کی
اسے درجۂ کمال تک پہنچادیا، یعنی یہی نہیں کہ انھوں نے اس
کو جوں کا توں باقی رکھا ہو، بلکہ اسے ترقی کے سب سے بڑے
پر پہنچا دیا، انھوں نے اسے پروان چڑھانے میں اپنی پوری

عربوں کی فکری تاریخ پر ایک نظر

عہد جاہلیت میں عربوں کی فکری تاریخ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی، اس دور میں نہ وہ کسی نظریۂ حیات کے حامل تھے نہ کوئی خاص فلسفیانہ مذہب انھوں نے ایجاد کیا تھا۔ ان کے روایات اور خیالات، تخلیقات ذہنی اور فکری کا جو ذخیرہ موجود ہے، وہ صرف کہانیوں، شاعروں، قافیہ پیماؤں اور نقیبوں پر مشتمل ہے۔

چراغ سے چراغ!

دنیا میں کوئی قوم بھی ایسی نہیں ہے جو دوسروں سے الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کر سکے۔ ممکن نہیں کہ کوئی قوم دوسری قوموں اور ملتوں سے ذہن و فکر کے معاملات و مسائل میں کسی نہ کسی حد تک متاثر نہ ہو۔ ملک عرب کے آس پاس جو قومیں آباد تھیں وہ ایک خاص حضارت جداگانہ تہذیب، ممتاز ثقافت اور خاص طرز فکر کی مالک تھیں، ایران، ہندوستان اور روم کے سب کچھ خاص صلاحیتیں تھے۔ جو قائم ہوئے اور قائم رہے، پھر بعد عرب

حاصل کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں کیا، اور ہندوؤں سے بھی بلا تامل انھوں نے قابل اخذ چیزیں حاصل کیں۔"

یہ ہے ایک مختصر سی داستان ایک گذری ہوئی قوم کی جو اگر ہے، لیکن مرچکی ہے۔

بعد کی زندگی کو مانتے تھے۔ ان کا قول تھا زمانہ ہی ہمیں زندہ رکھتا ہے وہی ہمیں ہلاک کرتا ہے۔ بعث و نشور کوئی چیز نہیں ہے۔ ایسے لوگ بھی موجود تھے۔ جو ثواب وعقاب کے قائل تھے۔ جن کا یہ عقیدہ تھا۔ کہ مرنے کے بعد پھر زندگی سے دوچار ہونگے۔ اپنے اعمال کے لحاظ سے جزا و سزا پائیں گے۔

عربوں کی محرومی

دین بہت بڑی اجتماعی طاقت ہوتا ہے۔ عرب جاہلیت اس طاقت سے محروم تھے اس لئے وہ قبائل میں بٹ گئے تھے۔ قبائل کی صورت میں جو اجتماعیت انہیں حاصل تھی وہ اگرچہ محدود تھی لیکن اس سے وہ وہی فائدہ کسی نہ کسی طرح حاصل کر لیتے تھے۔ جو دینی اجتماعیت کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔

اسلام کا لایا ہوا انقلاب

یہ قبائل ایک ایسی "وحدت" کے ضرورت مند تھے جو امتوں اور ملتوں کی تخلیق کا سبب اور باعث ہوتی ہے۔ چنانچہ جب اسلام آیا اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ قبائل کی محدود اجتماعیت کو ختم کر دیا، عربوں کے انتشار اور پراگندگی کو دور کر دیا ان کے متفرق منتشر اور بکھرے ہوئے حلقوں اور گروہوں کو ایک لڑی میں پرو کر انہیں ایک ایسی واحد قوم بنا دیا جو غایات دینی اور اغراض دنیوی میں بالکل متحد و متفق تھی۔

اسلام کا نظام عقلی

اس طرح اسلام نے عربوں کو، اور عربوں کے واسطہ سے دنیا کو ایک مستقل نظام عقلی سکھایا۔ اس نظام نے خدا کی ذات کو روشناس کرایا

میں داخل ہوئے اور ہر چہار طرف پھیل گئے نصرانی یعنی عیسائی بھی عرب
موجود تھے۔ اور نجران کے علاقہ پر تو حکومت ہی ان کے ہاتھ میں تھی۔ عر
کا ان سے ربط ہوا تو افکار وخیالات میں بھی ارتباط کے آثار پیدا ہوئے
اس ارتباط کے باوجود وثنیت یعنی بت پرستی ان پر غالب رہی۔ یہودیوں
عیسائیوں سے فکری اور ذہنی ارتباط و امتزاج کے باوجود وہ مجموعی حیثیت
سے بت پرست ہی رہے چنانچہ ان کے معبود سورج، چاند، لات، عزیٰ او
مناۃ ہی رہے۔

انتشار ذہنی

یہ بت پرستی اگرچہ عربوں کا مذہب بن چکی تھی، پھر بھی اس نے کوئی باقاعدہ
مرتب اور منظم صورت اختیار نہیں کی تھی۔ ایک قسم کا ذہنی اور عقلی اضطراب
بہر حال موجود تھا۔ چنانچہ ان کے مختلف اور متضاد اقوال سے اندازہ ہوتا ہے
کہ ایک خدا کے ماننے والے بھی ان میں موجود تھے۔ اور بہت سے خداؤں کی
عبودیت کا دعوی کرنے والے بھی بہت سے لوگ تھے اور ان بہت سے
خداؤں میں سے ہر ایک بجائے خود خاص قسم کے نفوذ اور اثر کا حامل سمجھا جاتا
تھا۔

معاد کا مسئلہ

معاد کا مسئلہ عربوں میں کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جو یکسر متفق علیہ ہو
بارے میں بھی خیالات یکسو نہیں تھے۔ بلکہ ان میں انتشار پایا جاتا تھا۔ وہ
جو "دہر" ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ یہ نہ حشر و نشر کے قائل تھے نہ موت

ور دورہ شروع ہوا یہیں سے علم فقہ کی بنیاد پڑی۔

ونکہ رائے اور قیاس میں اختلاف ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اس اختلاف کی بنیاد
نقہی مذاہب قائم ہو گئے۔ فقہ کا تعلق صرف معاملات و مسائل سے تھا عقاید
یالات سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ پھر جب عقائد اور خیالات میں گرہ
نے لگی تو اس کی کشود کے لئے ایک دوسرا علم عالم وجود میں آیا۔ یعنی علم کلام
لم توحید۔ جس طرح فقہ میں متعدد مذاہب و مسالک پیدا ہو گئے اسی
ح علم کلام میں بھی اختلاف فکر و نظر نے متکلمین کے متعدد مکاتب خیال قائم
نے

جدل عقائد کا سلسلہ سب سے پہلے سیاسیات میں شروع ہوا جو ایک
درازتک اپنے اثرات و نتائج پیدا کرتا رہا۔ مسلمانوں کے علم میں سب
پہلے اس ذیل میں جو اختلافی چیز آئی وہ امامت کا سوال تھا۔ اس سوال
یسی نازک اور خطرناک صورت اختیار کر لی کہ تلواریں نیام سے باہر
یں۔ اور کشت و خون کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ غور کیجئے
س حقیقت کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ کسی دینی اور خالص مذہبی مسئلہ پر اتنا کشت
ون نہیں ہوا جتنا امامت کے مسئلہ پر ہوا اور ایک عرصہ درازتک یہ سلسلہ
ری رہا۔

رسول اللہ صلعم نے وفات کے وقت کسی کو اپنا جانشین نہیں مقرر فرمایا
سی کے لئے وصیت اور ہدایت فرمائی یہیں سے جدل بین المسلمین کا سلسلہ
روع ہوا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ رسول اللہ کا جانشین کون ہو؟ خلافت رسول
س کے حوالہ کی جائے؟ انصار اس بار امانت کے مستحق ہیں۔ یا مہاجر؟ یا،

اس کے صفات معین کئے، اس کی وحدت و انفرادیت کو تسلیم کر
عبادات کے حدود قائم کئے۔ ثواب وعقاب کا فلسفہ اور نظریہ
اور دارالفناکی ماہیت بیان کی زمین وآسمان کے ملکوت پر نظر ا
دی۔

مسلمانوں کا فکری انتشار!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ
عہد گرامی میں ذہن کے
جدل ونزاع مسلمانوں کی سرشت سے دور تھی وہ تنزیل
قرآن پر ٹھوس اعتقاد رکھتے تھے۔ اگر کوئی بات سمجھ
تھی آنحضرتؐ سے دریافت کرکے اپنی تشفی کر لیتے
آنحضرت خود قرآن ناطق تھے۔ آپ جو کچھ ارشاد فرما
وہ بغیر کسی قیل وقال اور شک وشبہ کے قبول کر لیا جا
ذات، صفات، نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ جنت، دوزخ ان
کا ذکر قرآن میں آتا تھا۔ عرب اس ذکر کو سنتے تھے اگر کوئی بات
کھٹکتی تھی رسول اللہ سے اس کے بارے میں سوال کرکے
کو مطمئن کر لیتے تھے۔

رسول اللہ نے جب اس دنیا سے پردہ فرمایا تو مسلمانوں نے آپ کی
سے پکڑ لیا۔ جو بات نص سے یعنی قرآن سے نہیں معلوم ہوتی تھی
تلاش سنت رسول میں کی جاتی تھی۔ اور جب وہ مل جاتی تھی تو اس پر عمل
کر دیا جاتا تھا۔ پھر وہ دور آیا کہ سنت میں اگر کوئی چیز نہ ملی تو اجماع امت
قرار دیا۔ اجماع کے بعد اجتہاد ———— یعنی رائے

علی کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ امیر معاویہ رضؓ نے جب اپنا پہلو کمزور دیکھا تو حضرت علی کو تحکیم کی دعوت دی۔ یہ دعوت آپ نے قبول کر لی۔ طائفۂ علی کے بعض لوگوں کو تحکیم کا قبول کر لینا پسند نہ آیا چنانچہ انھوں نے حضرت علی کے خلاف خروج کیا۔ (اسی لئے یہ فرقہ اب تک خارجی کے نام سے مشہور ہے) اس فرقہ نے کہنا شروع کیا۔

"خدا کے سوا کسی کا حکم نہیں چل سکتا۔ خدا کا حکم اس معاملہ میں بھی ظاہر اور واضح تھا۔ حضرت علی کا تحکیم کو قبول کر لینا غلطی پر مبنی تھا۔ اس لئے کہ تحکیم کے قبول کر لینے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکم الٰہی واضح نہیں بلکہ مشکوک ہے!"

خوارج

خوارج کے نزدیک خطا کا مرتکب کافر ہوتا تھا۔ جس سے قتال کرنا، اور جس کے خلاف جہاد کرنا واجب اور فرض تھا، لہذا انھوں نے حضرت علی کو خاطی سمجھ کر ان کے خلاف خروج کیا اور انھیں شہید کر دیا۔ یہی لوگ خوارج کے نام سے مشہور ہیں۔

شیعیانِ علی!

حضرت علی کے پاس بھی ایک جماعت تھی، یہ خوارج کے برعکس آپ کی جاں نثار تھی اس نے آپ کے حق میں پروپیگنڈہ شروع کر دیا اس عقیدہ نے بہت جلد مذہب کی صورت اختیار کر لی اور "مذہب امامیہ" وجود میں آگیا

لے یہ دعویٰ تاریخی اعتبار سے محل نظر ہے کیونکہ حضرت علی کے ہاتھ پر حجاز نے بیعت کر لی تھی، یہی ارباب حل وعقد کا مرکز تھا اور اسی کی بیعت عالم اسلام کی بیعت سمجھی جاتی تھی۔ (مترجم)

یا خاندانِ رسول میں سے کوئی شخص، اس کارِ اہم کا اہل قرار دیا جائے؟ یا
مہاجر، اور خاندانِ رسول کا سوال نظر انداز کر کے عامۂ مسلمین میں سے کوئی
خلیفہ بنالیا جائے؟

ایک اور سوال

ساتھ ہی ساتھ فوراً ہی ایک دوسرا سوال بھی اٹھ کھڑا ہوا؟
وہ سوال یہ تھا کہ امامت کی صورت کیا ہو؟
انتخاب یا اختیار؟
نص یا تعین؟ —— ؟
ساتھ ہی ساتھ ایک اور سوال بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
یہ کہ امامت کے شرائط کیا ہیں؟ —— ؟

اسی کیفیت میں حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کی خلافت کا دور گزرا
پھر حضرت عثمانؓ کا حادثۂ قتل رونما ہوا۔ اور ایک نئے فتنہ کی گرم بازاری
ہوگئی۔ اب ان لوگوں کے بازو قوی ہوگئے۔ جو بیتِ رسول میں سے
کے اختیار کر لینے کے قائل تھے۔ چنانچہ حضرت علی بن ابی طالب
مبارک پر بیعت کر لی گئی۔

معاویہؓ اور علیؑ

لیکن یہ بیعت ویسی متفقہ نہیں تھی۔ جیسے پہلے خلفا کی تھی یعنی تمام
کی تائید خلافت کو حاصل نہیں تھی، اسی دور میں امیر معاویہؓ خونِ عثمانؓ
لے کر اٹھے، اس مطالبہ نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ امیر معاویہؓ اور

ــــــــــــ
ؔ مصنف کا یہ دعویٰ تاریخی اعتبار سے سقیم ہے (مترجم)

یار کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔

انسان مجبور ہے یا مختار؟

ہم اپنے ارادہ یا عمل میں آزاد ہیں یا پابند؟ ہم جو چاہیں کریں اور جو
یں نہ کریں کیا ہمیں اس کا اختیار ہے ؟ کیا ہمارے
ل، ہمارے ارادے کے خارجی علل و اسباب کے آثار

؟

اگر واقعی یہی بات ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دارالبقا میں
اور عقاب کی حکمت و مصلحت کیا ہو سکتی ہے؟

جبر و اختیار کے فلسفہ نے انسانی عقل کو سرگشتۂ حیرت کر دیا۔ پھر
مسلمانوں نے ملک شام فتح کیا اور اس طرح عیسائیوں سے ان کا خلا ملا
و عقائد میں مناقشات نے تنازعات کی صورت اختیار کی اور یہ نزاع
پر جاکر ختم ہوئی۔

ب مناظرہ! دمشق کا ایک شخص یوحنا تھا، یہ عیسائی تھا، کلیسا کے
اہل ذکر و نظر اصحاب میں اس کا شمار ہوتا تھا۔
ہ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس حرکت فکری میں اس کی
و شخصیت کافی حد تک کار فرما ہے۔ اس نے ایک
تصنیف کی ہے۔ جس نے مسلمانوں اور نصرانیوں میں
مناظرہ کی حیثیت اختیار کی۔ اس کتاب میں اس نے
یحیت کے مبادی بھی درج کر دیے مثلاً ارادۂ الٰہی رحمت
و غیرہ۔

تھے۔ وہ خیال کرتے تھے۔ جو کچھ ہوا وہ حکم خدا سے ہوا۔ رہا غلطی اور ز
کا معاملہ تو یہ معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو چاہے فیصلہ کرے

فرقہ مرجیہ

مسلمانوں کا ایک اور گروہ تھا جو کلام میں بھی دینی مذہب رکھتا ت
سیاست میں اس کے نزدیک ایمان نام ہے خدا کے دل سے پہچاننے کا۔ ا
کا یہ خیال بھی ہے کہ معصیت سے ایمان کو کوئی ضرر نہیں پہونچتا۔ اور ا
طاعت کوئی نفع نہیں پہونچا سکتی یہی لوگ ہیں جو "مرجیہ" کہلاتے ہیں۔

جبر و اختیار

پھر کفر کیا ہے؟
ایمان کی تعریف کیا ہے؟
کیا ایمان صرف اقرار باللسان یعنی زبان سے اعتراف کا نام
یا اعتقاد بالقلب یعنی دل سے اعتقاد رکھنے کا نام ہے؟
یا اقرار باللسان اور اعتقاد بالقلب کے ساتھ ساتھ عمل بال
یعنی اس پر عمل بھی ضروری ہے؟
پھر ایک سوال اور بھی ہے؟
یہ کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کے بارے میں کیا فیصلہ ہے!
آیا وہ مومن ہے یا کافر؟ —— اس کا انجام کیا ہوگا! اس ک
طرح ہوگا؟ اسے ثواب و عقاب کی منزل سے کس طرح گذرنا پڑے گ
یہی سوالات رفتہ رفتہ ایک مستقل مسلک اور مذہب بن گئے

ین آپ کے ایک شاگرد واصل بن عطا نے جواب دیا انھوں نے کہا،
"گناہ کبیرہ کا مرتکب، دو منزلوں کے بیچ کی منزل میں ہے!"
پھر واصل بن عطا اپنے استاد حسن بصری کی مجلس درس و فیض سے
یدہ ہو گئے، اور اپنے گھر پر بیٹھ کر لوگوں کو درس دینے لگے۔ جب
ت حسن بصری کو یہ خبر پہنچی تو انھوں نے فرمایا۔

"لقد اعتزلنا واصل!"

یعنی،

"واصل نے ہم کو چھوڑ دیا"!

حضرت حسن بصری کے اس لفظ نے واصل بن عطا اور ان کے
اگردوں کو "معتزلہ" کے نام سے مشہور کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ معتزلہ
ک فرقہ بن گیا۔

کلمین کا اختلاف

گناہ کبیرہ کے مرتکب کے بارے میں خود متکلمین کے درمیان کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔
ض تکفیر کے قائل ہیں اور بعض تکفیر کے قائل نہیں ہیں، معتزلہ کا مسلک
س باب میں یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ مومن ہے نہ کافر بلکہ
ہ فاسق ہے یعنی کفر اور اسلام کی منزلوں کے درمیان جو منزل فسق کی
ے اس میں ٹھہرا ہوا ہے۔

سی طرح جبر و اختیار کے معاملہ میں بھی اختلاف فکر و نظر موجود ہے
معتزلہ کا مسلک اس بارے میں یہ ہے کہ انسان اپنے افعال کا خالق ہے وہ
پنی عقل و بصیرت کی روشنی میں اچھے اور برے کی تمیز کر سکتا ہے لہٰذا وہ
پنے اعمال کا مسئول یعنی ذمہ دار اور جواب دہ ہے اس لئے اگر وہ اچھا کام

فرقہ معتزلہ

یوحنا کی اس تصنیف نے شام میں کافی ہلچل پیدا کردی، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا کہ کافی بار آور ہوئی لیکن عراق میں اس نے شدید رد عمل کی صورت اختیار کر لی، شام میں کوئی مرد میدان ایسا نہ تھا جو ان ایرادات اور اعتراضات اور مزخرفات کا جواب باصواب دیتا۔ عراق میں حضرت امام حسن بصری موجود تھے۔ حضرت امام حسن بصری کا مسلک تھا کہ وہ معاملات دین میں عقل کی کارفرمائی اور مداخلت کو ناپسندیدگی سے دیکھتے تھے، کتاب وسنت سے تمسک کو کافی سمجھتے تھے۔

لیکن حضرت امام حسن بصری کے اس مسلک کو خود ان کے شاگرد قبول نہیں کرتے تھے، وہ اس بارے میں اپنے استاد سے بالکل مختلف رائے رکھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ عقائد کے معاملات میں بھی عقل کو دخل رکھنا چاہیے۔ بلکہ اس سے کام لینا چاہیے۔ اور اس کی روشنی میں راہ روی کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔

حضرت حسن بصریؒ سے ایک سوال

ایک مرتبہ ایک شخص حضرت امام حسن بصری کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے سوال کیا۔

"یا امام گناہ کبیرہ کے مرتکب کے بارے میں آپکی رائے کیا ہے؟ کیا وہ کافر ہے؟ جیسا کہ خوارج سمجھتے ہیں یا مسلمان ہے جیسا کہ مرجیہ کا خیال ہے؟"

حضرت حسن بصری نے یہ سن کر اپنا سر مبارک جھکا لیا، اور

ایک نہایت رکھتا ہے۔

جماعت اشاعرہ

اب اشاعرہ کو لیجئے،
اشاعرہ کے نزدیک صفات کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ ذاتی۔
۲۔ معنوی۔
۳۔ فعلی۔

ذاتی صفت ــــــ ذات پر دلالت کرتی ہے، جیسے ایک ہونا بے نیاز ہونا۔ اول و آخر ہونا۔

معنوی صفت، ان معنی پر دلالت کرتی ہے، جو ذات کے ساتھ قائم اور موجود ہیں ــــ جیسے اللہ تعالیٰ کا زندہ ہونا۔ قادر ہونا۔ عالم ہونا اور سمیع ہونا۔

یہ دونوں قسمیں صفات ازلی یعنی صفات قدیمہ پر مشتمل ہیں، لیکن تیسری قسم ــــ فعلی ــــ مشتمل ہے ان صفات پر جو صدور، آثار و نتائج کو ــــ قدرت خداوندی کے باعث ــــ سبب ہیں ــــ مثلاً اللہ تعالیٰ کا خالق ہونا، رازق ہونا وغیرہ وغیرہ ــــ اور ہر وہ اسم جو فعل سے مشتق ہوگا۔ وجود فعل سے پیشتر موجود نہیں ہو سکتا۔

دورِ تاویل

معتزلہ، خوارج اور حضرات مرجیہ کا عقیدہ ہے کہ قِدم، یعنی قدامت ایسا وصف ہے۔ جو صرف خدا کی ذات ہی سے مخصوص اور وابستہ ہے اس

کرے گا تو ثواب پائے گا، اور فعل بد کا مرتکب ہوگا تو سزا ملے گی۔

اہل سنت

ایک اور گروہ کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم رکھتا ہے، انہی کی وہ آیتیں اور حدیث کے وہ ٹکڑے پیش کرتا ہے جن میں خدا کی باتیں کرنے قدرت رکھنے زندہ ہونے، علم رکھنے وغیرہ کا تذکرہ ... کے بعض اعضا مثلاً ہاتھ آنکھ اور چہرے وغیرہ کا ذکر ہے ... جب خدا کے اعضاء ہیں تو لامحالہ وہ جسم بھی رکھتا ہوگا۔

ان آیتوں اور حدیثوں کے فہم و معنی میں مسلمانوں کے اندر ... رہا ہے۔ ان آیتوں اور حدیثوں کی کوئی تاویل بھی ایسی نہیں ہے ... ہو یعنی جس پر سب کا اتفاق ہو۔ بلکہ ہر تاویل ایک نئے مکتب خیال ... اور موجد ہے۔

اہلسنت کا یعنی سنی حضرات کا مسلک اس باب میں یہ ہے کہ وہ ... کے ظاہر معنی ہی مراد لیتے ہیں اور کسی قسم کی تاویل یا رائے زنی ... کرتے ہیں۔ یعنی الفاظ کو قبول کرتے ہیں۔ معنی کی تشریح اور تفسیر ... میں سکوت کو ترجیح دیتے ہیں۔

فرقہ کرامیہ

حضرات اہل سنت کے برعکس فرقہ کرامیہ کے حضرات خدا ... کے غیر مشکوک اور واضح طور پر قائل ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا کے ... ہیں اس کا جسم ہے۔ اور یہ جسم دوسرے جسموں کی طرح اپنی ایک

یہ سلسلہ بھی جاری رہا، یہاں قیل و قال کی بحثیں تھیں وہاں جنگ کے نوے تھے فتوحات کی وسعت نے عہد عباسی میں اُوج کمال پر پہنچ کر دم لیا، اس عہد میں خلفا، امرا، حکام، سب ہی علم و ادب کے رسیا تھے۔ چنانچہ فکر پر سے پابندیوں کا پہرہ ہٹا لیا گیا اور دھڑلّے سے یونانی، فارسی، سریانی اور ہندی علوم کے تراجم عربی زبان میں ہونے لگے۔ اور اس طرح نئے افکار، نئے خیالات اور نئے معتقدات عربوں تک پہونچنے لگے۔

علوم غیر کا ترجمہ

عباسی عہد میں غیر زبانوں سے جو علوم عربی میں منتقل ہوئے ان میں فلسفہ بھی تھا، ریاضی بھی منطق بھی۔ مسلمانوں نے منطق اور الہیات کو تو اپنا لیا، اب انہیں جدل اور مناظرہ کے لئے اصول اور نئے ضابطے نظر آئے، ان کو انہوں نے پرکھا، جانچا اور اپنایا انہوں نے فلسفہ پر بھی عبور حاصل کیا، یہ وہ علم تھا کہ اس دور سے پہلے عرب فلسفہ تو بڑی چیز ہے اس کے نام سے بھی آشنا اور واقف نہیں تھے۔

علم کلام کا کارنامہ

علمائے علم کلام نے محسوس کیا کہ ان نئے علوم اور مذاہب میں جن سے اب ترجمہ و تدوین کے ذریعہ ہماری قوم روشناس ہو رہی ہے ایسے امور بھی ہیں جو ہمارے دین و مذہب سے ٹکراتے ہیں۔

چنانچہ فوراً ہی متکلمین اسلام لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں اتر آئے اور انہوں نے علمی، عقلی اور استدلالی طور پر اپنے دین و مذہب کی تائید

باب میں یعنی قدامت میں کوئی دوسری ذات اور صفت اس کی شریک دسہیم نہ
ہے لہٰذا اللہ کی ذات کے لیۓ صفت قدامت تسلیم کرنے کے معنی یہ ہو
کہ قدامت اپنے قدم یعنی ازلی ہونے میں خدا کی "شریک" ہے
مشکل میں اپنے آپ کو گھرا ہوا دیکھ کر ان حضرات نے سرے سے صفا
ہی کا انکار کر دیا۔ لیکن اس انکار سے یہ خدا کے لئے نفی قدرت، یا
علم یا نفی حیات کا اعتراف نہیں کرتے، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ بے شک
تعالیٰ قادر ہے، عالم ہے، زندہ ہے، لیکن "بنفسہ" نہ کہ "بہ علم، حیات
لوگ ان آیتوں اور حدیثوں کی تاویل بھی کرتے ہیں جو صفات الٰہی کے با
میں وارد ہوئی، چنانچہ یہ کہتے ہیں کہ جہاں خدا کے ہاتھ کا ذکر کیا گیا
وہاں مراد قوت طاقت ہے، جہاں خدا کی آنکھ کا ذکر کیا گیا ہے وہاں
سے مراد علم الٰہی ہے، جہاں خدا کے چہرے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں
سے مراد ذات خداوندی ہے۔

جدل وپیکار کا سلسلہ! یہ وہ مسائل و عقائد ہیں جنھوں نے اسلامی فرقوں کے درمیان جدل
کا ایک زبردست سلسلہ شروع کر دیا، یہ سلسلہ گھٹنے کے بجائے بڑ
ہی رہا اس خلیج اختلاف کو جب پاٹنے کی کوشش کی گئی تو کچھ اور زیادہ
لطف کی بات یہ ہے کہ اپنی رائے کو موکد اور مضبوط ثابت کرنے
لیۓ اور حریف کی رائے کو لازمۂ فساد قرار دینے کے لیۓ سہارا بھی
دلیل نقلی —— یعنی آیات و احادیث —— کا لیا گیا۔

عہد عباسی یہ معاملات اسی طرح چلتے رہے ساتھ ہی مسلمانوں کی کشور کشائی

پھر وہ ثابت کریں گے کہ جزئیات میں حس، کس طرح، غلط کار ثابت ہوتی ہے؛ پھر بدیہیات کے سلسلہ میں وہ معترضین کے اقوال پیش کر کے ثابت کریں گے کہ،

«عقل صحت دلیل پر بھروسہ کرتی ہے اور جو نتیجہ اس سے مرتب ہوتا ہے اُسے مانتی ہے لیکن اس کلیہ کو وہ اپنے دلائل سے غلط ثابت کریں گے وہ کہیں گے "نظر" کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔

۱۔ نظر صحیح،

۲۔ نظر فاسد،

پھر وہ سوال کریں گے،

«کیا نظر صحیح، ہر معاملہ میں افادۂ علم کا سبب ہوتی ہے؟ کیا وہ مفید ظن ہوتی ہے؟

وجود اور ماہیت

اس کے بعد وہ وجود اور ماہیت کے بارے میں بحث کریں گے پھر وجوب اور امکان کو زیر بحث لائیں گے اس کے قدم اور حدوث پر بات چیت کریں گے پھر وحدت اور کثرت پر گفتگو کریں گے، پھر علت و معلول کا مسئلہ چھیڑیں گے، پھر جسم اور جوہر حرکت اور سکون زمان اور مکان، خلا اور جوہر فرد صورت اور ہیولیٰ اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے خالص فلسفیانہ مسائل کی وقت نظر سے جرح و تعدیل کریں گے، اور اس طرح حریف کو اچھی طرح سے ہر طرف سے عاجز کر کے تھکا کے لاجواب کر کے اپنا مقصد اور مدعا ثابت کریں گے۔ غرض کہیں بھی وہ خود بے بس نہیں ہوں گے، ہاں حریف کو ضرور قدم قدم پر زچ کر دیں گے۔

اور حمایت اور علوم جدیدہ کے مزعومات کا رد نہایت قابلیت اور مہارت کے ساتھ شروع کر دیا۔ انہوں نے ان علوم سے وہ تمام چیزیں لے کر اپنا لیں جو دین کی حمایت و نصرت کے سلسلہ میں کام آ سکتی تھیں۔ انہوں نے یہ نہیں کیا کہ نئے علمی حریف کے سامنے سپر انداز ہو گئے ہوں بلکہ انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ خود حریف کے ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا اور اپنی اسلحہ سے حریف پر ایسے وار کئے کہ وہ دنگ اور ششدر رہ گیا۔ انہوں نے فلسفہ اور منطق کو اس طرح اپنایا کہ ان علوم کے امام بن گئے۔ انہوں نے ان علوم کو اس طرح ہضم کیا کہ وہ ان کے آلۂ کار بن گئے۔ انہوں نے دین میں فلسفہ کی نہایت اعلیٰ کے ساتھ آمیزش کی اور فلسفہ کو بھی بے دینی کی سرحد سے نکال کر دین کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ انہوں نے فلسفہ میں دین کا اور دین میں فلسفہ کا اس خوبی کے ساتھ پیوند لگایا کہ کہیں سے بھی کمزوری اور بے بسی کا ثبوت نہیں ملتا۔

نظریۂ معرفت

مثلاً آپ دیکھیں گے کہ نظریۂ موفت کے سلسلہ میں جب وہ آغاز کلام کریں گے تو سب سے پہلے علم کی تعریف کریں گے، وہ بتائیں گے کہ یہ علم

۱. ضروری ہے۔

۲. یا مکتسب؟

پھر وہ ضروری کی حسب ذیل قسمیں قرار دیں گے۔

۱۔ وجدانیات۔

۲. حسیّات۔

۳. بدیہیّات۔

سب کو چھوڑ کر صرف خدا کا ہو رہنا، عبادت اور ریاضت کے لیے اپنے تئیں وقف کر دینا، زخارف دنیا سے اعراض اور دنیا کی زیب و زینت سے اجتناب ان چیزوں سے نفرت جن کی طرف دنیا بے تحاشہ لپکتی ہے یعنی مال اور جاہ کی لذت۔

صوفیہ کے نزدیک معرفت نتیجہ ہوتی ہے، طاعت اور اخلاص کا اور یہ طاعت و اخلاص، نظریات عقلی اور مناقشات کلامی کے پابند نہیں ہوتے۔ ان کا قول ہے کہ انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز صرف ادراک ہے اور ادراک کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ علوم اور معارف کا ادراک۔

۲۔ ان احوال کا ادراک جو نفس کے ساتھ قائم رہتے ہیں مثلاً حزن اور الم راحت اور مسرت وغیرہ۔

ان ادراک کی نشوونما منحصر ہوتی ہے حسب ذیل چیزوں پر:

۱۔ مجاہدہ۔

۲۔ عبادت۔

۳۔ محاسبۂ نفس

احوال و مقامات کا نشوونما صرف مجاہدات اور عبادت ہی کے ذریعہ ممکن ہے اور مجاہدہ کرنے والا برابر مقامات معرفت طے کرتا رہتا ہے عبادت و ریاضت کے بل پر مسلسل ایک مقام سے دوسرے مقام پر فائز ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مقام توحید اور مقام عرفان پر پہونچ جاتا ہے۔ وہاں پہونچ کر اس کی نظر سے ایسے حقائق و جود گذرتے ہیں۔ جن پر کسی دوسرے کی نظر نہیں جا سکتی۔ جہاں تک کوئی اور نہیں پہونچ سکتا۔

معاملہ یہیں پر آکر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ ———
جیسا کہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں وضاحت کے ساتھ
ہے ——— حریف کے انکار و اقرار پیش کر کے
دلیلوں سے اپنی دلیل ثابت کریں گے اور اپنا لوہا اس سے
لیں گے۔

دلیل اور اطمینان! دین کا معاملہ ایسا ہے کہ اس کا
دلیل سے اتنا نہیں جتنا اطمینان
ہے، نفس انسانی کی یہ کچھ سرشت سی ہے کہ جس چیز میں اسے
ملتی ہے اس سے وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ادلّہ اور مناقشات کی
زیادہ متوجہ نہیں ہوتا وہ ایسے احوال کا لذت چشیدہ ہو جاتا ہے
صرف علم و نظر کے سہارے رہنمائی نہیں ہو سکتی۔

دلائل عقلی و نقلی! یہی وجہ ہے کہ متکلمین اسلام
ہی پر سارا دارومدار نہیں
بلکہ وہ جتنی اہمیت دلائل نقلی کو دیتے ہیں اتنی ہی
ان کی نظر میں دلائل عقلی کی بھی ہے۔ تاکہ ہر طبقہ
کے لوگ ان کے مافی الضمیر کو سمجھ سکیں ان کے علم سے
فائدہ اٹھا سکیں، اور ان کی بات کی ماہیت اور حقیقت
غور کر سکیں۔ خاص طور پر اہل تقویٰ اور اہل صلاح
فکر و نظر سے جب "مطمئن" ہوتے ہیں تو زہد و تصوف
اختیار کر لیتے ہیں۔

تصوف کی اصل کیا ہے؟

غیر مسلم رعایا سے ترکوں کا روادارانہ برتاؤ!

تاریخ خلافت عثمانیہ کے دوران مطالعہ میں خیال پیدا ہوا کہ ترکوں کی رواداری کی داستان مربوط طور پر مرتب کروں، چنانچہ آغاز سے انجام تک کا یہ مرقع حاضر ہے۔

(م-۱-ج)

سلاطین عثمانیہ جہاں اور خوبیوں اور خصوصیتوں کے اعتبار سے یگانہ تھے، وہاں ان میں ایک اور صفت بھی تھی، وہ تھی رواداری وہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے ہرگز اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ دین و مذہب کے معاملہ میں کسی پر جبر کریں وہ اس قرآنی ارشاد کے رمز آشنا تھے کہ

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (دین کے معاملہ میں جبر و زور روا نہیں (کیونکہ) ہدایت گمراہی سے ممیز ہو چکی ہے) اب یہ ہر شخص کا خود کا معاملہ ہے کہ وہ جو راستہ چاہے اختیار کرے خواہ گمراہی خواہ ہدایت!

صوفیا کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ فاعل حقیقی سوا خدا کے

صوفیا کا عقیدہ ہے۔ اس گروہ میں جو لوگ زیادہ غالی ہیں وہ یہاں تک

ہیں کہ :۔ "لا موجود فی کل شئٍ الا اللّٰہ" !

یعنی ۔ ہر چیز میں سوائے خدا کے کوئی موجود نہیں ہے ۔

یہیں سے صوفیا کے ایک مشہور مسلک "وحدت الوجود" کا آغاز ہو

اس مسلک کی رو سے یہ سارا عالم صرف خیال ہی خیال ہے حقی

اس مسلک کے اعتبار سے انسان اور خدا ایک ہیں، یعنی جب خدا ہر چیز میں

تو انسان میں بھی موجود ہے اور جب خدا انسان میں موجود ہے تو انسان خدا میں پایا

میں فرق کیا رہا ——— (نعوذ باللّٰہ) جو خدا وہ انسان جو انسان وہ خدا

چنانچہ منصور حلاج کہا کرتا تھا، ——" میرے جبہ میں سوا خدا کے کچھ نہیں

منصور حلاج اسی خیال کو اپنے دو شعروں میں اس طرح بیان کرتا ہے

"میں ہوں جو محبت کرتا ہے اور جو محبت کرتا ہے میں ہوں

ہم دو روحیں ہیں جنھوں نے ایک بدن میں حلول کر لیا ہے"

"جب وہ مجھے دیکھتا ہے میں اسے دیکھتا ہوں

جب میں اسے دیکھتا ہوں وہ مجھے دیکھتا ہے"

صوفیا اور ذات الٰہی ! صوفیا ذات الٰہی کے بعد کسی شے کا وجود

سوا نفس کے احوال شوق اور وجد کے جو صرف اللّٰہ تعالیٰ کے لئے مخصو

نفس کی حقیقت صوفیا کے نزدیک صرف حالات ہیں یا لذت

شعور کی مختلف کیفیتیں اور قسمیں ۔ ان سب سے زیادہ حُب

خدا ہی کے لئے ہو۔ (عباس محمود عقاد کی عربی

کوشش کی ترک یورپ سے نکال دیئے جائیں۔ انہوں نے اندرونی سازشوں اور علانیہ جنگوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا لیکن ۱۴۵۳ء میں جب بے انتہا جانی و مالی قربانی کے بعد محمد خاں نے قسطنطیہ کو فتح کیا تو اس نے عیسائیوں سے کوئی انتقام نہیں لیا۔

داخلہ کے وقت تھوڑا بہت کشت و خون ضرور ہوا۔ لیکن داخلہ کے بعد ترکوں کی تلوار نیام میں پہنچ گئی حالانکہ عیسائی فاتح مسلمانوں کو کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ ڈالنے کے عادی تھے ـــــ داخلہ کے انتہائی چند گھنٹوں کے بعد کوئی قتل عام نہیں ہوا آتش زنی بھی زیادہ نہیں ہوئی۔ سلطان نے گرجاؤں اور دوسری عمارتوں کو محفوظ رکھنے میں پوری کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب رہا۔[1]

امن عام قسطنطنیہ میں فاتحانہ داخلہ کے بعد محمد نے امن عام کا اعلان کردیا۔ جو عیسائی خوف و دہشت کے باعث شہر سے فرار ہوگئے تھے ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ اور ترغیب دی کہ آئیں بسیں اور اپنے اپنے کام میں لگ جائیں ۔ اس نے یونانی کلیسا کے بطریق کو پھر سے اس کے متبعین پر بحال کیا اور کلیسا کی سرپرستی قبول کرنے کا اعلان کیا اور ایک خاص فرمان کے ذریعہ یونانی بطریق کی ذات محترم قرار دی گئی نیز کلیسا کے عہدہ دار تمام محاصل سے مستثنیٰ کردیئے گئے اسی فرمان کی رو سے عیسائیوں کو مذہبی رسوم ادا کرنے کی

---

[1] لارڈ ایورسلے ص۸۸ بحوالہ دولت عثمانیہ

مرادخان کی عیسائی بیوی ۱۳۴۵ء میں مراد خاں نے بازنطینی سلطنت ایک امیر الامرا کنٹا کوزین کی بغیر کسی ... حملہ کے مدد کی اس نے اپنی حسین وجمیل لڑکی شہزادی تھیوڈورا کی ... اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق مراد خاں سے شادی کردی مراد خاں نے شادی کے بعد شہزادی سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اپنے آبائی مذہب پر قایم رہ سکتی ہے کیونکہ ازروئے مذہب مسلمان اہل کتاب عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں چنانچہ مراد خاں نے شہزادی تھیوڈورا سے کبھی یہ فرمائش نہیں کی کہ وہ اسلام قبول کرے۔

دشمنوں کی شہادت مراد اول کی ساری زندگی عیسائیوں سے لڑتے عیسائی فرمارواؤں سے جنگ کرتے گذری لیکن اس نے عام عیسائیوں پر کبھی کسی قسم کی زیادتی روا نہیں رکھی، ان کے مذہبی معاملات میں کبھی کسی قسم کی مداخلت نہیں کی انھیں اپنے مذہب پر قائم رہنے کے سلسلہ میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں ۱۳۸۵ء میں یونانی کلیسا کے بطریق اعظم نے پوپ اربن ششم کو ایک خط میں لکھا تھا کہ مراد نے کلیسا کو کامل آزادی عطا کردی تھی اور شاید یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ۱۳۶۰ء اور ۱۳۸۹ء کے درمیان بطریق اعظم کے دور میں کوئی ایک شکایت بھی عثمانیوں کے ہاتھوں ارباب کلیسا کی بدسلوکی کی درج نہیں ملتی[1]

فتح قسطنطنیہ کے بعد عثمانی ترکوں کو بازنطینی حکومت سے مسلسل آویزش ... قسطنطنیہ کے بادشاہوں نے ہمیشہ ...

---

[1] ہربرٹ گبن صفحہ ۱۸۷ بحوالہ دولت عثمانیہ جلد اول،

صلیبی کی یادگار تھے۔ اور مسلمانوں کو ہمیشہ تنگ کیا کرتے تھے۔ اجازت دیدی کہ وہ بارہ روز کے اندر اپنے تمام اسلحہ اور ہر قسم کے سامان کو لے کر جہاں چاہیں چلے جائیں۔ جاتے وقت اپنے ہی جہاز استعمال کریں۔ اگر جہازوں کی قلت محسوس کریں تو عثمانی سلطنت کے جہازوں کو بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

یہ تو ہوا جنگ کرنے والوں کا حال، عام باشندوں کو سلطان نے کامل مذہبی آزادی عطا کر دی اعلان کیا کہ ان کے کلیساؤں سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے۔ اور ــــــ پانچ سال تک ان سے کسی قسم کا محصول (ٹیکس) بھی نہیں لیا جائے گا۔

اسلام کے دامن میں پناہ

سلطان سلیمان اعظم (۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء) نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ اتنی زیادہ رعایت برتی اور ایسے حسن سلوک کا مظاہرہ کیا کہ عیسائی فرماں رواؤں کی عیسائی رعایا بھاگ بھاگ کر مسلمانوں کے دامن میں آکر پناہ ڈھونڈتی تھی، خلفاء عثمانیہ کی غیر مسلم رعایا اور عیسائی یورپ کے زرعی غلاموں (SERFS) کے فرق مراتب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سرحدی عیسائی ممالک کے باشندے بھاگ بھاگ کر سلطنت عثمانیہ میں پناہ لیتے تھے اور اپنے ہم مذہب عیسائی آقاؤں کے جور و تعدی پر ترکوں کی حکومت کو ترجیح دیتے تھے۔ لارڈ کریسی سلیمان اعظم کے ہم عصر مصنف کا قول نقل کرتا ہے:۔

”میں نے گروہ در گروہ ہنگری دہقانوں کو اپنے جھونپڑوں میں آگ لگا کر اور اپنے بیوی بچوں اور سامان کاشت لے کر ترکی علاقوں میں بھاگ کر جاتے ہوئے دیکھا ہے، جہاں وہ جانتے تھے کہ عشر کے علاوہ ان پر اور کسی قسم کا محصول یا تکلیف دہ بار رعاید نہیں کیا

مکمل آزادی دی گئی۔ نیز یہ اجازت بھی دی گئی کہ وہ اپنے قومی معاملات
ومسائل اپنی قومی عدالتوں کے ذریعے طے کر لیا کریں۔ علاوہ ازیں عیسائیوں
کے قانون نکاح اور قانون وراثت میں کوئی مداخلت نہیں کی۔

دو اور شہادتیں مسٹر آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام (دعوت اسلام) میں فتح قسطنطنیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"ترکوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ بطریق کی عزت قائم رکھی بلکہ ان
کے (جس میں فریقین عیسائی ہوں) اختیار بھی دے دیئے!"

اسی طرح لارڈ ایورسلے نے بھی اعتراف کیا ہے کہ:۔

"محمد کی یہ عظیم الشان رواداری اس عہد کی مسیحی یورپین حکومتوں
کی سیاسی اخلاقیات سے بہت آگے تھی —!

ڈیوک نوٹاراس — ڈیوک نوٹاراس جو افواج قسطنطنیہ کا سپہ سالار اعظم تھا۔ جب گرفتار کر کے لایا گیا تو محمد نے
اسے معاف کر دیا بلکہ یہاں تک نوازش کی کہ اس کی بیوی کی عیادت کے
لئے گیا۔ جو علالت اور غم شکست) کے باعث پریشان تھی، نہایت نرمی و
احترام سے جس طرح کوئی لڑکا ماں کو سمجھاتا ہے اسے تسلی تشفی دی۔
اسیر جنگ افسروں کا زر فدیہ اس نے خود ادا کیا[۳]

روڈس کے صلیبی سورما ۹۲۹ھ ۱۵۲۲ء میں سلیمان اعظم نے روڈس کو فتح کیا یہاں کے عیسائی جنگ جوؤں کو ...

گبن ج ۳ صـ ۵۰۱ بحوالہ دولت عثمانیہ

یونانیوں کے ساتھ مراعات یونانی عیسائیوں کے ساتھ ترکوں کا برتاؤ سراسر رفق و محبت، رواداری اور عالی ظرفی کا تھا۔ ترکی حکومت کے ترجمان نے "باب عالی" کے نام سے ایک بہت با اختیار اور معزز منصب قائم کیا۔ اور اس پر ۱۶۶۹ء میں یونانی عیسائی کو فائز کیا۔ یہ بڑا اہم سیاسی منصب تھا۔ رفتہ رفتہ یہ منصب وزارت خارجہ کا اہم ترین منصب بن گیا اور ہمیشہ اس عہدہ عالی پر یونانی ہی مقرر ہوتے رہے۔ اس طرح سلطنت عثمانیہ کے معاملات کی کنجی ان ہی عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی پھر کچھ مدت بعد ایک اور منصب اسی طرح کا محکمہ بحریہ میں قائم کیا گیا اور یہ بھی ایک یونانی ہی کو تفویض ہوا۔

رعایا یا معاون؟ ترک عیسائیوں کے جذبات کا بہت زیادہ پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ رعایا کا لفظ ایک حد تک حقارت آمیز سمجھا جاتا تھا۔ لہذا انہوں نے اس لفظ ہی کو بدل دیا اور ان عیسائیوں یونانیوں کو رعایا کے بجائے معاون کہنے اور لکھنے لگے۔

غلط اور مہلک رواداری ترک اپنی رواداری اور عالی ظرفی میں حد اعتدال سے تجاوز کر گئے تھے۔ انہوں نے اپنی عیسائی رعایا کو اجازت دیدی تھی کہ وہ ترکی میں رہ کر جس یورپین حکومت کی چاہیں رعایا بن جائیں۔ اس رعایت سے عیسائیوں نے بہت ناجائز فائدہ اٹھایا یہ دھڑلے سے قوانین ملکی کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ اور تعزیر و عقوبت سے محفوظ رہتے تھے۔ یہ ترکوں کے دوش بدوش پہلو بہ پہلو رہتے تھے اور ان تمام حقوق سے متمتع ہوتے تھے جو کسی ترک کو حاصل ہو سکتے تھے۔ لیکن "غیر ملکی" ہونے کے باعث فائدہ ترکوں سے زیادہ اٹھاتے تھے۔ یہ تجارت کرتے تھے۔

جائے گا۔[1]

نومبر ۱۶۸۹ء میں سلطنت عثمانی

عیسائیوں سے خصوصی رعایت علمی مصطفےٰ کوبریلی کے ہاتھ

یہ بڑا دین دار۔ صالح اور مدبر انسان تھا۔ زوال پذیر سلطنت کی تمام ان
کو تیزی کے ساتھ دور کیا۔ رعایا میں اعتماد اور اطمینان پیدا کیا۔ عیسائ
ساتھ اس نے خاص طور سے حسن سلوک کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ان حاک
سخت سزائیں دیں۔ جن کے بارے میں شبہ بھی ہو گیا کہ یہ عیسائیوں کے سا
قسم کی بدسلوکی کرتے ہیں۔ جزیہ کے علاوہ ہر محصول سے انہیں آزاد کرد
جزیہ کی رقم بھی اتنی معمولی رکھی جو غریب سے غریب آدمی کو بھی گراں نہیں گ
تھی۔ ادھر کچھ عرصہ سے عیسائیوں کو نئے گرجا اور کلیسا بنانے کی اج
بنانے کی اجازت حاصل کرنے میں سخت دشواریاں لاحق ہوتی تھیں
کوبریلی نے ایک فرمان کے ذریعہ انہیں عام اجازت دے دی کہ وہ
اور کلیسا جہاں چاہیں بنوائیں۔ یونانی کلیساؤں کے پیرو دوں پر ج
کے ارباب اقتدار لرزہ خیز سختیاں کرتے تھے۔ ان سہولتوں نے ا
کا دل سے ممنون کر دیا اور وہ ان کی ترقی جاہ و اقبال کی دعائیں کر

۱۶۹۷ء میں حسین کوپریلی کو سلطان مصطفےٰ

خصوصی مراعات نے اپنا وزیر اعظم بنایا یہ بھی اقلیتوں اور

کے ساتھ بہت حسن سلوک سے پیش آتا تھا اس نے بوسنا
کا ایک سال کا جزیہ معاف کر دیا۔ رومیلیا کی عیسائی رعایا کے ذ
باقی چلا آ رہا تھا۔ اسے یک قلم معاف کر دیا۔ جس سے عیسائیوں
سلمانوں کی عظمت پیدا ہوئی۔

[1] کریسی ج ا صفحہ ۳۲۸-۳۲۶ بحوالہ دولت عثمانیہ

قریب آنے سے روکے رکھا، اور نہتے یونانی، عرب پیدل فوج کی سنگینوں کے سایہ میں جہازوں تک پہنچا دئے گئے۔"

جزیہ کی وصولی

سلطان محمد ثانی (۱۴۰۸ء–۱۴۳۹ء) نے غیر مسلموں کے ساتھ کامل طور پر مراعات ملحوظ رکھیں اسے جب یہ شکایت پہنچی کہ جزیہ کی وصولی میں بعض اوقات بعض حکام و عمال ذمیوں و عیسائیوں پر سختی روا رکھتے ہیں تو اس نے قدیم طریقہ کو منسوخ کر کے وصولی جزیہ کا کام ایک مجلس کے سپرد کر دیا جس کے ارکان یہ تھے۔

(۱) قاضی۔ (۲) صوبہ کا گورنر (۳) عیسائی سردار۔

اس طرح جزیہ کی وصولی کے سلسلہ میں کسی تعدّی اور زیادتی کا امکان باقی نہ رہا۔

مزید حقوق و مراعات

سلطان عبدالمجید خان (۱۸۳۹ء–۱۸۶۱ء) نے اپنے دور حکومت میں عیسائیوں کو مزید حقوق و مراعات عطا کئے۔ ایک فرمان کے ذریعہ (۱۸۵۶ء) انھوں نے اعلان کیا۔

"ان تمام حقوق کی جو نصاریٰ اور دوسرے فرقوں کو دئے گئے ہیں، از سر نو توثیق کی جاتی ہے نیز ان حقوق و مراعات پر بلا تاخیر نظر ثانی کر کے زمانہ اور سوسائٹی کی ضرورت کے مطابق انھیں ترقی دی جائے گی اس غرض سے بطریق کے زیر صدارت ایک مجلس منعقد کی جائے گی جو مذکورہ بالا مسائل پر بحث کر کے اپنی رائے باب عالی میں پیش کرے گی۔ سلطان محمد فاتح نے جو حقوق بطریق کو دئے تھے ان میں اضافہ کیا جائے گا اور آئندہ بطریق کا انتخاب تمام عمر کے لئے ہوا کرے گا۔"

کرزی کرنے والوں کے خلاف ورزی کرنے... مگر محصول نہیں دیتے تھے۔ یہ تجارتی قوانین کی خلاف ورزی کرتے

حکومت کی... پولیس انہیں گرفتار بھی نہیں کرسکتی تھی کیونکہ جس یورپین حکومت کی

آگرو... رہ کر یہ "رعایا" تھے۔ اس کا سفیر یا قونصل انہیں بچانے کے لئے آگروہ

اور... انگریز مورخ فنلے حیرت کے ساتھ ان مراعات کا ذکر کرتا ہے اور

"یہ ہر سزا سے محفوظ تھے۔

قاتلوں کے ساتھ سلوک

۱۸۳۰ء میں یونانیوں نے اچانک ترکوں کے خلاف بغاوت کی اور مسلمانوں کا قتل

عام شروع کردیا۔ ترکی قلعوں کے جن بے دست و پا ترکی دستوں کو

داخل ہوئے انہیں نقض عہد کرکے بے دردی اور سفاکی کے ساتھ قتل کرا

اور بچوں تک کو ذبح کرنے میں تامل نہیں کیا۔ اس بغاوت کو دبانے کے

محمد علی پاشا کا ہونہار بیٹا ابراہیم پاشا آگے بڑھا اور اس نے انہیں

۱۸۲۵ء میں وہ نوارینوں میں داخل ہوا یہ وہ جگہ تھی جہاں یونانیوں نے

بدعہدی کرکے مسلمانوں کو قتل کیا تھا۔ ان کی عورتوں اور بچوں تک کی

لی تھی۔ اب وہ سہم رہے تھے کہ دیکھئے ترک فاتح ان کے ساتھ کیا برتاؤ

لیکن ابراہیم پاشا مسلمان تھا۔ اور ایک مسلمان کی حیثیت سے وہ

کہ بدعہدی سب سے بڑا گناہ ہے چنانچہ اس نے

معاہدے کے مطابق پورے یونانی دستہ کو فرانسیسی اور انگریزی

جہازوں پر روانہ کردیا۔ مسلمانوں کا ایک گروہ جسے نوارینو

قتل عام کی یاد اب تک بے چین کئے ہوئے تھی۔ انتقام کی

میں اکٹھا ہوگیا مگر ابراہیم نے پیش بینی کرکے عیسائیوں کی

کی تدبیر پہلے سے کرلی تھی۔ سوار فوج کے ایک دستہ نے ترکوں

"چونکہ محاصل کے عاید کرنے میں مساوات برتی جائے گی، اس لئے انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرح عیسائی اور دوسرے فرقہ کے لوگ بھی فوج میں داخل ہوں، لیکن انہیں فوجی خدمات کے معاوضہ میں نقد رقم پیش کر کے فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کی اجازت بھی ہوگی!"

فقید المثال کارنامہ

۱۸۶۰ء میں دروزی اور مارونی فرقوں میں خون ریز فساد برپا ہو گیا۔ اول الذکر مسلمان تھے ثانی الذکر عیسائی، مارونی فرقہ کے لوگوں نے قتل و غارت کی ابتداء کی، لیکن جب دروزی ترکی بترکی جواب دینے لگے تو وہ چیخ اٹھے، مارونی فرقہ کے عیسائیوں نے مسلمانوں کو خوب قتل کیا اور لوٹا، اسی طرح دروزیوں نے بھی عیسائیوں کو بے تامل موت کے گھاٹ اتارا، اور برباد کیا، چونکہ مارونی کمزور تھے اور دروزی تگڑے، اس لئے نتیجۃً زیادہ نقصان مارونی عیسائیوں کو — جانی ومالی — برداشت کرنا پڑا۔

لبنان حکومت ترکیہ کا ایک زیر نگیں صوبہ تھا۔ یہاں کی ترک پولیس اور فوج بھی تھی، وہ بھی مارونی فرقہ کے ظلم و تعدی، اور شرارت سے نالاں تھی، اس نے دروزیوں کو روکنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی بلکہ ایک حد تک چشم پوشی سے کام لیا۔

سینہ سپر عبدالقادر جزائری

لیکن عیسائیوں کا یہ قتل اور ان کی یہ مظلومیت ایک سچا مسلمان، امیر عبدالقادر جزائری نہ دیکھ سکا، یہ الجزائر کا مجاہد جسے فرانس نے جلاوطن کر دیا تھا، اور جو شام کے ایک گوشہ میں عزلت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ عیسائیوں کے بچانے کے

سلطان عبدالمجید نے اپنے فرمان میں یہ بھی اعلان کیا کہ :—
"موجودہ کلیساؤں اور عیسائی مدرسوں،

نئے گرجے اور کلیسا شفاخانوں اور قبرستانوں کی مرمت کی عام اجازت
ہے۔ لیکن اگر کسی جدید کلیسا، مدرسہ، قبرستان یا ہسپتال کے تعمیر
کرنے کی ضرورت ہو اور بطریق یا اس فرقہ کا مذہبی پیشوا اسے
منظور کرے تو ہر تعمیر کا نقشہ باب عالی میں پیش کیا جائے گا
اور اگر کوئی دخاص، وجہ مانع نہ ہوئی تو سلطان نقشہ ملاحظہ فرما کر
تعمیر کی منظوری خود صادر فرمائے گا۔"

ترکی حکومت اپنی رعایا کے ساتھ اس کی شور

زبان کا مسئلہ بغاوت پسندی اور غداری کے باوجود اسے
کی مذہبی، سیاسی، اور سماجی سہولیں دیتی تھی۔ ترکوں نے اپنی مختلف
رعایا پر کبھی حرف ترکی زبان ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اسے اپنی
برتنے، اور اسے ترقی دینے کی پوری اجازت دی۔
چنانچہ سلطان عبدالمجید خاں نے اپنے فرمان اصلاحات میں بالف
واضح اعلان کیا :—
"ایک ضابطۂ تجارت و ضابطۂ فوجداری نیز وہ تمام قواعد و ضوابط
جو مخلوط عدالتوں سے متعلق ہیں۔ حتی الامکان، جلد از جلد شائع کردیے
جائیں گے اور سلطنت عثمانیہ میں جتنی زبانیں مستعمل ہیں ان سب
میں ان کا ترجمہ کردیا جائے گا۔"

اسی فرمان میں سلطان عبدالمجید نے
عیسائی اور فوجی خدمت سے صلاح و مشورہ کے بعد یہ باجی

ترکوں کا فیصلہ

حکومت ترکیہ بھی خاموش نہ بیٹھی رہی، یورپ میں احتجاج شروع ہوا اور ترکی حکومت نے وہ کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ خود اپنے وزیر خارجہ فواد پاشا کو بھیجا، جنھوں نے وہاں پہنچتے ہی حالات پر قابو پا لیا، ان کے حکم سے غفلت اور چشم پوشی کے جرم میں ایک سو گیارہ ترک سپاہی گولی سے مارے گئے۔ احمد پاشاہ والیٔ دمشق کو قتل کی سزا دی گئی، بہت سے دروزی جلاوطن کر دیے گئے، خورشید پاشا حاکم بیروت کے لئے موت کی سزا تجویز ہوئی۔ عیسائیوں کے نقصانات کی تلافی کے لئے سات کروڑ پچاس لاکھ قرش رقم باب عالی نے منظور کی۔

عیسائی جج

۱۸۶۸ء میں سلطان عبد العزیز نے ایک عدالت عالیہ قائم کی، جس کے ججوں میں عیسائی اور مسلمان برابر تھے۔

لئے میدان میں کود پڑا ایک فرنچ مورخ کے الفاظ میں :-

" دمشق میں اگر عبد القادر نہ ہوتا تو ایک عیسائی کی صورت نہ دکھائی
دیتی یہ عرب بہادر جس نے سولہ سال تک فرانسیسیوں سے نہایت
شدت کے ساتھ جنگ کی دمشق میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا
آگ کے شعلے پہلی ہی مرتبہ بھڑکے تھے۔ اور درماندوں کی صدا
پہلی ہی مرتبہ بلند ہوئی تھی کہ اس نے بلا کسی پس و پیش کے
عیسائیوں اور ان کے قاتلوں کے درمیان اپنے آپ کو ڈال
دیا۔ ایک چھوٹے سے رضاکار دستہ کے ساتھ اس نے عیسائیوں
کو عوام الناس سے چھڑایا۔ اور اپنا محل انہیں رہنے کو دے دیا۔ جو
ہزاروں کی تعداد میں آکر پناہ گزیں ہونے لگے، اس نے عیسائیوں
کے سکونتی مقام پر پہرہ بندی کر دی " اس شخص نے جو مسلمان
اور اولاد پیغمبر اسلام تھا " اور فرانس کا قدیم دشمن تھا، ایک سے زیادہ
مرتبہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا " اور ان خونخوار لٹیروں کو پسپا
کیا، جو اسلام اور ترکی کے لئے باعث ننگ تھیں عبد القادر نے
صرف یہی نہیں کیا بلکہ ان بدقسمتوں پر بھر نشاک کے لئے بے
دریغ روپیہ صرف کیا، جنہیں اس نے موت کے پنجہ سے رہائی
دلائی —— پھر اس نے خود اپنی نگرانی میں عیسائیوں کو بیروت
پہنچایا جہاں انہیں کسی قسم کا خطرہ نہ تھا " اس کا یہ ایثار اس
کی یہ شرافت اور اس کی یہ بہادری ایک لمحہ کے لئے بھی
کم نہ ہوئی " اس کی زندگی کا یہ صفحہ کتنا شاندار ہے، جس کے
آگے ہر کارنامہ بھی مدھم پڑ جاتا ہے۔ لہ

لہ تاریخ دولت عثمانیہ از ولاتر ون گیٹر ص ۵۰۶

آنے والوں کی خبریں ہیں، تمہارے لئے، ضروری احکام و ہدایات ہیں،!" ایک اور موقعہ پر آنحضرت نے فرمایا، "سب سے زیادہ ویران گھر وہ ہے جو قرآن سے خالی ہو!"

شعبی کا قول ہے، "جو قرآن پڑھتا ہے، وہ اپنے رب عزوجل سے باتیں کرتا ہے۔"

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "اے بیٹے، قرآن کی تلاوت سے غافل نہ ہو، صبح و شام اس کی تلاوت کیا کرو، کیونکہ قرآن مردہ قلب میں زندگی پیدا کرتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے، بدکاریوں سے دور رکھتا ہے۔

حضرت سفیان ثوری، رحمۃ اللہ علیہ رمضان کے شروع ہوتے ہی فرائض سنن کے علاوہ دوسری عبادتیں یکسر ترک کر دیتے تھے اور صرف قرآن کی تلاوت میں لگ جاتے تھے۔

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ جب رمضان کا مہینہ شروع ہوتا اہل علم کی مجلسوں میں اٹھنا بیٹھنا ترک کر دیتے، مذاکرۂ حدیث بھی ملتوی کر دیتے سارا وقت قرآن کی تلاوت میں صرف کیا کرتے تھے،

ابوحنیفہ اور شعبی رحمہما اللہ تعالیٰ رمضان کے مہینہ میں ساٹھ ختم کیا کرتے تھے،

حضرت علیؓ کا قول ہے، "جس نے قرآن پڑھا، پھر مر گیا، اور جہنم کا مستحق قرار پایا، اس نے مصحف کے بجائے گویا آیات اللہ سے ٹھٹھا کیا، امام شعبی کا قول ہے کہ زبان، کان دل کی منادی سے قرآن اس طرح پڑھو کہ کان سن لے، اور دل سمجھ لے،

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ جس نے کھڑے ہو کر نماز میں قرآن پڑھا اسے ہر حرف کے بدلے پچاس نیکیاں ملیں گی، جس نے نماز کے علاوہ بحالت وضو قرآن کی تلاوت کی اسے ہر حرف کے بدلے میں پچاس نیکیاں ملیں گی، جس نے بغیر وضو کے

قرآن اور اس کی فضیلت

اللہ تعالیٰ کہتا ہے:" ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل مد
یہ ہوا اس کی آسانی کا ثبوت، پھر خدا نے اسے "کریم" بھی کہا ہے، فر
لقرآن کریم" ایک جگہ اسے "حکیم" بھی کہا ہے،" یٰس والقر
ایک اور مقام پر اسے "مجید" بھی فرمایا ہے :" ق والقرآن المجید
یہ برکتوں والا قرآن، خدا نے، سید الانام، خاتم الانبیا، محمد مصطفٰ
علیہ وآلہ وسلّم پر نازل فرمایا، یہی آنحضرت کا سب سے بڑا معجزہ تھا جس
کرنے سے بڑے بڑے فصحا اور بلغار عاجز اور درماندہ تھے، چنانچہ قرآ
چیلنج کیا،" قل فاتوا بسورۃ من مثلہ" یعنی اے رسول ان کفا
کہ یہ قرآن کی سی ایک ہی سورت لاسکیں تو لائیں، ایک اور جگہ فر
لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھٰ
لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا" یعنی ا
اگر، انس وجن ایکا کر کے قرآن کا مثل لانا چاہیں، تو نہیں لاسکتے اگر
دوسرے کی مدد کرکے سر توڑ کوشش کیوں نہ کر ڈالیں، قرآن نور
افگندہ نقاب سچائی ہے، اس کے اعمال سے بڑھ کر کوئی عمل روشن
احکام سے بڑھ کر کوئی حکم واضح نہیں، اس کی بلاغت سے بڑھ کر کوئی
اس کی فصاحت پر کسی دوسری فصاحت کو ترجیح نہیں، اس سے بڑھ
کوئی اور کتاب نہیں، اس سے بڑھ کر لذیذ کوئی اور قول نہیں،
رسول اللہ کا قول ہے،" قرآن میں تم سے پہلوں کی واقعات

(۱) قرآن کی تلاوت تدبر کے ساتھ،

(۲) پیٹ کا خالی رہنا،

(۳) رات کا جاگنا بسلسلۂ عبادت،

(۴) سحر کے وقت بارگاہ الٰہی میں تضرع

(۵) نیکوکاروں کی صحبت،

قرآن کی تلاوت آواز سے کی جائے، یا چپکے چپکے دونوں کے بارے میں آثار موجود ہیں، اور فضیلت کا بیان دونوں طرف کے سلسلہ میں موجود ہے، علما کا ارشاد ہے کہ اگر قاری، ریاکاری کے خوف سے چپکے چپکے پڑھتا ہے، تو اس کے لئے افضل یہی ہے، اور اگر ریاکاری کا اندیشہ نہیں ہے تو قرآن کا باآواز پڑھنا افضل ہے بشرطیکہ اس آواز سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ پہونچے، تلاوت کی فضیلت کے بارے میں احادیث کثیرہ موجود ہیں، جو ان کا استقصا کرنا چاہے اسے چاہیئے کہ شیخ مشائخ الاسلام محی الدین نووی قدس اللہ روحہ کی "کتاب التبیان فی آداب حملۃ القرآن" کا مطالعہ کرے،

ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جو شخص ہر رات کو سورۂ واقعہ کی تلاوت کرے گا، وہ فقر و فاقہ سے دور رہے گا، جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو اس وقت تک آرام نہیں فرماتے تھے جب تک الم تنزیل الکتاب اور تبارک الملک کی تلاوت نہ فرمالیں، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا، جو رات کو اذا زلزلت پڑھے اس نے گویا نصف قرآن پڑھ لیا، اور جو قل یا ایہا الکفرون پڑھے اس نے گویا چوتھائی قرآن پڑھ لیا، اور جو قل ہو اللہ پڑھ لے اس نے گویا تہائی قرآن پڑھ لیا،

تلاوت کی اسے دس نیکیاں ہر حرف کے بدلے میں ملیں گی،
آنحضرتؐ کا فرمان ہے "قرآن پڑھو، اور روؤ، اگر رونا نہ آئے تو رونے کی
صورت بنالو" ابصالح المزنی سے روایت ہے کہ میں نے ایک بار، عالم خواب میں
رسول اللہ کے سامنے قرآن پڑھا، آپ نے فرمایا، اے صالح اس قرآت کے
ساتھ رونا کہاں ہے ؟"
حضرت عثمان، جمعہ کی رات کو، سورۂ بقر سے مائدہ تک، ہفتہ کی رات
سورۂ انعام سے ہود تک، اتوار کی رات کو، سورۂ یوسف سے مریم تک، پیر
کی رات کو، سورۂ مریم سے طسم موسیٰ و فرعون تک، منگل کی رات کو سورۂ
سے ص تک، بدھ کی رات کو سورۂ رحمٰن تک اور جمعرات کی رات کو، باقی قرآن
ڈالتے تھے،
حضرت علی سے مروی ہے کہ ایسی عبادت سے کوئی فائدہ نہیں جو تفکر سے
خالی ہو اور ایسی تلاوت رائیگاں ہے جو تدبر سے محروم ہو۔
ایک رات حضرت عائشہ دیر سے حاضر خدمت ہوئیں، حضور نے پوچھا
کیوں ہوئی ؟ فرمایا، ایک شخص قرآن کی تلاوت کر رہا تھا، اس سے اچھی قرآت
میں نے کسی کی نہیں سنی، حضور کھڑے ہوئے اور بڑی دیر تک، اس آدمی کی قرآت
خود بھی سنتے رہے، پھر فرمایا، "یہ سالم ابو حذیفہ کا غلام ہے، خدا کا شکر ہے کہ
امت میں ایسے لوگ ہیں"!
ابن عمر کہا کرتے تھے، کہ انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ سفر میں ہو
دن ہو یا رات قرآن کریم کی تلاوت کیا کرے"
السید الجلیل صاحب الکرامات والمعارف، والمواہب والد...
الخواص رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ دل کے روگ کا علاج پانچ چیزیں ہیں

ہے، اور اگر آپ نے جبر کیا تو خدا کی قسم میرے لب لعنت پر نہیں کھل سکتے۔
امیر معاویہ نے کہا، اے احنف اٹھ کھڑا ہو، وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے، اور منبر پر چڑھ کر انھوں نے حمد و ثنا کے بعد کہا،
اے لوگو! امیر المومنین معاویہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں علیؑ پر لعنت بھیجوں لوگو سن لو، میں کہتا ہوں، علی اور معاویہ نے اختلاف کیا، مقابلہ کیا، دونوں میں سے ہر ایک نے اپنے برسر اقتدار ہونے کا دعوے کیا، اور ایک دوسرے کو باغی کہہ کر، جنگ آزمائی کی، میں کہتا ہوں، اے اللہ، تیری، تیرے ملائکہ مقربین، انبیاء و مرسلین اور جمیع مخلوق کی اس پر لعنت ہو جو ان دونوں میں واقعی باغی تھا، اس طرح ان دونوں میں سے اس جماعت کو بھی راندۂ درگاہ بنا جو بغاوت کی ساتھی تھی، یا اللہ، جماعت باغیہ اور شخص باغی پر اپنی زیادہ سے زیادہ لعنت بھیج، اے معاویہ، میں نے جو کچھ کہا ہے، اس میں نہ اب ایک حرف گھٹاؤں گا، نہ بڑھاؤں گا، اگرچہ مجھے قتل کیوں نہ کر ڈالا جائے۔"
امیر معاویہ نے کہا، اے ابو بحر، ہم تمھیں معاف کرتے ہیں۔
پھر امیر معاویہ نے، عقیل بن ابی طالب سے کہا، علیؑ نے تمھارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، اور میں حسن سلوک سے پیش آ رہا ہوں، تم منبر پر جاؤ، اور علیؑ پر لعنت بھیجو، عقیل نے کہا، بہتر، میں جاتا ہوں، یہ کہہ کر وہ منبر پر چڑھ گئے، پھر انھوں نے حمد و ثنا کے بعد کہا،
"اے لوگو، معاویہ ابن ابی سفیان نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں علی ابن ابی طالب پر لعنت بھیجوں، خدا کی اس پر لعنت ہو!"
یہ کہہ کر وہ منبر سے اتر آئے، امیر معاویہ نے کہا، لیکن آپ نے یہ وضاحت تو کی نہیں کہ ہم دونوں میں سے کس پر آپ نے لعنت بھیجی ہے؟

معاویہؓ اور علیؑ

امیر معاویہ اپنے دربار میں بیٹھے ہوئے تھے، ان کی خدمت میں، اشراف
و اعیان حاضر تھے، حاضرین میں احنف بن قیس بھی تھے، اتنے میں ایک شامی
اور اس نے کھڑے کھڑے باتیں شروع کر دیں، آخر میں اس نے حضرت علیؑ پر
لعنت شروع کر دی،

احنف نے کہا، اے امیر المومنین، اس شخص کو اگر یہ اندازہ ہوتا کہ آپ
کی خوشنودی، انبیاء و مرسلین پر لعنت بھیجنے سے حاصل ہو سکتی ہے، تو یہ
دھڑک ان پر بھی لعنت بھیجنے لگتا، لیکن میں کہتا ہوں، اے امیر المومنین خدا
ڈریئے، حضرت علیؑ کا ذکر چھوڑ دیجئے، وہ اپنے رب سے جا ملے، اپنی
میں پہنچ گئے، اب وہ ہیں اور ان کے اعمال اور خدا کی قسم اس میں کوئی شبہ
ان کی تلوار کھری تھی، ان کے کپڑے پاک تھے، اور یہ باتیں بڑی ناسزا ہیں

"امیر معاویہ نے کہا، اے احنف تجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا، اور خدا کی قسم
تجھے منبر پر کھڑا کر کے رہوں گا، اور تجھے خواہ بہ رضا و رغبت یا بہ جبر و اکراہ
پر لعنت بھیجنا ہی پڑے گی!"

احنف نے جواب دیا، اے امیر المومنین اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو

ادب الجاحظ

عنوان بالا سے عربی زبان کی ایک بے نظیر کتاب میری نظر سے گذری کتاب صوری و معنوی ہر اعتبار سے نہایت دیدہ زیب و دلپذیر ہے، فاضل مؤلف کا نام حسن السندوبی ہے، سندوبی صاحب مصر کے اہل انشا میں ایک مرتبۂ خاص کے مالک ہیں، تلاش و جستجو، جرح و تنقید اور روایت و درایت کا نہایت خوبی سے امتزاج کیا ہے، اور پھر لطف یہ ہے، کہ رنگینیٔ عبارت اور حسن بیان بھی اس کتاب کی خصوصیت خاصہ ہے،

اصل کتاب ڈھائی سو صفحات کو محیط ہے، میں نے چاہا ہے کہ اس کتاب کا خلاصہ کروں، یعنی کوئی اہم بات رہنے بھی نہ پائے اور صفحات اتنے نہ ہوں کہ گراں گذریں۔

اصل و نسب سلسلۂ نسب ابوعثمان عمرو بن بحر بن محبوب بن فزارۃ لیثی کنعانی ہے، بعض ارباب سیر کا خیال ہے کہ فزارۃ ابوالقلمّس عمرو بن قلع الفقیمی کا غلام تھا، قلمّس کی اصابت رائے، اور نفوذ و اثر مشہور و معروف ہے، ہر جس مہینہ کو چاہتا تھا، حلال کر دیتا تھا، اور جس مہینہ

عقیل نے جواب دیا۔ خدا کی قسم جو کچھ میں کہہ چکا اس میں ایک
حرف کی بھی کمی بیشی نہیں کروں گا۔ متکلم کے دل میں جو کچھ ہوتا ہے
زبان پہ آتا ہے۔

"ترجمہ از المستطرف، مطبوعہ مصر"

یہ لفظ تو محب، صدیق، نصیر، غلام، آزاد سب پر منطبق ہوتا ہے، اس کے علاوہ
اور بھی بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک صحیح النسب قبیلہ دوسرے قبیلہ
کا حلیف "مولیٰ" رہا کرتا تھا،

ب خود جاحظ کو لیجئے، اس کی کتابوں اور روایتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ
عربیت میں اسے بہت غلو تھا، کسی قوم کو عرب سے افضل واعلیٰ وہ تسلیم نہیں کرتا تھا
بلکہ اس قدر اپنے اس خیال میں متعصب تھا کہ انسانیت کی ہر فضیلت، بزرگی
اور اولیت کا سہرا وہ عرب ہی کے سر رکھتا تھا،

اس کے باوجود محققین نے اعتراف کیا ہے کہ جاحظ خالص النسب عرب تھا،
ابوالقاسم لمی اور ابن حزم کہتے ہیں کہ وہ عرب تھا، عرب خاندان سے تھا، اور عرب
کے ایسے خاندان میں پرورش پائی کہ مجد وشرف اس کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو گیا،

لقب لقب جاحظ تھا، اس لئے کہ وہ بہت ہی بدشکل تھا، اس کی آنکھیں پھٹی
پھٹی تھیں اس کے علم و فضل کے آگے یہ عیب کوئی اہمیت نہیں رکھتا
اہل کمال میں بہت سے ایسے ہوئے ہیں جو اس سے بھی زیادہ بدشکل و بد قوارہ
تھے، مثلاً شیخ الفلاسفہ، سقراط، یہ بھی حد درجہ بدشکل تھا، ناک چپٹی چپٹی اور
ہونٹ موٹے موٹے تھے، جاحظ تو بہر حال سقراط سے کم تھا، یہ عجیب بات ہے
اس کا اصلی نام "عمرو" کوئی نہیں لیتا، نہ اس کی کنیت "ابوعثمان" سے کوئی یاد
کرتا ہے کہتا ہے تو جاحظ۔

یہاں تک جاحظ کا تعلق ہے وہ اس لقب (جاحظ) کو بہت ناپسند کرتا تھا
اور جو کوئی اسے اس لقب سے پکارتا تھا، تو وہ برا مانتا تھا اس کی خواہش تھی کہ
لوگ اس کا اصلی نام لیا کریں، وہ اپنے اصلی نام "عمرو" سے اتنا خوش تھا کہ کہا
کرتا تھا، کہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں یہ نام بہادروں کے لئے، بادشاہوں کے لئے

کو چاہتا تھا حرام[1] کر دیتا تھا، یہ خصوصیت و اقتدار اس کے خاندان میں
قبل قائم رہی، عرب میں اس شان کا کوئی نہ پیدا ہوا اور نہ کسی میں یہ جرأت
کہ اس کی کسی رائے کی مخالفت کر سکتا -

اس مقتدر خاندان میں جاحظ نے اپنے ایام نشو و نما پورے کیے
اس نے بلکہ اس کے آباؤ اجداد نے بھی یہیں پرورش پائی، یموت بن
ہے کہ فزارہ ایک سیاہ رو آدمی تھا، اور عمرو بن قلع کے اونٹ چرایا ک

یہاں سے جاحظ کی عربیت اور نسل کے متعلق ایک سوال پید
کہ آیا جاحظ عربی سامی نسل سے تھا یا قرب و جوار کی وجہ سے افریقی عناصر
ہو گیا؟ یا اس کے آباؤ اجداد میں سے کوئی غلام تھا یا اس کی نسل غلامی
اور آیا لائشوں سے پاک تھی؟ اور وہ اچھا خاصا "حُر" پیدا ہوا تھا؟

میرا جواب تو یہ ہے کہ سیاہ رنگ ہونا تو عربی الاصل ہونے کے
معقول دلیل نہیں ہے اس لیے کہ یہ رنگ عربوں میں پایا جاتا تھا، بلکہ
گا کہ اس رنگ پر فخر بھی کیا جاتا تھا، بہت سے ایسے لوگ تھے، جو
تھے، محبوب رکھتے تھے، اور دوسرے رنگوں پر اسے ترجیح دیتے تھے
کے جد اعلیٰ کا سیاہ رنگ ہونا، اس کی "عجمیت" کی دلیل کیونکر ہو سکتی

رہی غلامی تو ماہرین نساب و اخبار و رواۃ میں سے کوئی بھی
کہ اس کے آباد اجداد میں کوئی بھی غلام رہا ہو، اسی طرح یہ بھی نہیں
کہ اس کے اسلاف میں سے کوئی شخص کبھی اسیر کیا گیا ہو -

فزارہ کو آل نعیم کا "مولیٰ" کہتے ہیں تو لفظ "ولا" حریت کی نفی

---

[1] اصطلاح میں اسے "نسی" کہتے ہیں، قرآن مجید کی یہ آیت اسی کی طرف اشارہ
"انما النسئ زیادة فی الکفر یضل بہ الذین کفروا یحلونہ عاما و یحرمونہ عاما

یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ بصرہ میں تھا، اور ابھی بغداد نہیں گیا تھا، خطیب بغدادی اپنی "تاریخ بغداد" میں لکھتے ہیں، کہ جن لوگوں نے جاحظ سے حدیث کی سنی ہے ان میں سے ایک ابوداؤد شعبی ہیں، ابن ابی داؤد کہتے ہیں "میں بصرہ میں تھا، تو ایک بار جاحظ سے ملنے گیا، میں نے اجازت طلب کی تو انھوں نے روشن دان سے جھانکا اور پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا اصحاب حدیث میں سے ایک شخص حاضر ہے۔ کہا تم نے مجھے "حشویہ"[۱] سے گفتگو کرتے کبھی دیکھا ہے؟ میں نے کہا میں ابوداؤد کا بیٹا ہوں، کہا، اخاہ! آؤ یہ کہہ کر وہ نیچے اتر آیا اور پوچھا کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا مجھ سے کوئی حدیث بیان کیجیے، کہا لکھو عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی علی طنفسۃ[۲] خطیب نے سلیمان بن اشعث سے ایک روایت کی ہے کہ میں جاحظ کے ہاں گیا، اور کہا کوئی حدیث بیان کیجیے۔ کہا لکھو عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ الا المکتوبۃ[۳] یہاں ایک غلط فہمی رفع ہو جانی چاہیے، یعنی جاحظ اہل سنت کی "حشو" سے نہیں تعریف کرتا تھا، یہ خیال اس کا انھیں لوگوں کے متعلق ہے جو لوگ کھوٹے کھرے میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔

عہد جاحظ کے اسالیب تعلیم

قبل اس کے کہ ہم اس امر پر گفتگو کریں کہ جاحظ کی تعلیم کیوں کر ہوئی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے اسلوب تعلیم کا ایک مختصر سا خاکہ بھی آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

۱؎ یعنی ابوداؤد کا جاحظ سے ملاقی ہونا مشتبہ ہے (مترجم) ۲؎ جاہل برے لوگ ۱۲

۳؎ قالین دری ۱۲ ۴؎ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، کہ جب جماعت ہو جائے تو فرض کے علاوہ اور نماز نہ پڑھنا چاہیے ۱۲

سرداروں کے لئے، رئیسوں کے لئے مخصوص رہا۔ مثلاً عمرو بن سعید الاکبر، عمرو بن
العاص، عمرو بن معدیکرب وغیرہ۔

وہ کہا کرتا تھا "لوگ مجھے عمرو بن بحر کیوں نہیں کہتے؟ یہ کیا ہے جس کی
وہ اسی مہمل لقب جاحظ سے یاد کر رہا ہے۔"

بات بھی یہی ہے کہ جب کوئی لقب آدمی کے کسی عیب کو ظاہر کرتا ہو
معلوم ہی ہوتا ہے، اگر جاحظ کو معلوم ہوتا کہ اس کا یہ لقب بڑے بڑے لوگوں
لئے باعث شرف و مجد ہوگا۔ بلکہ معیار فضیلت قرار دیا جائے گا، تو شاید وہ
ہوتا، بلکہ بعض مرتبہ تو یہ خطاب دوسروں کے لئے مخصومت کا سبب بھی
تھا، اور ویسے ایک مستقل فضیلت تو تھی ہی ابوحیان توحیدی ابن عمید
برسرپرخاش تھے کہ "جاحظ ثانی" وہ بھی کہلاتے تھے، حالانکہ وہ صرف
تئیں اس خطاب جلیل کا حقدار سمجھتے تھے، محمود بن عزیز جیسا فاضل اجل
ثانی" کے شرف کا مالک تھا، ابو محمد الحسین بن خلاد کے متعلق ابن ندیم کہتا
کہ "جاحظ کے مسلک کے پیرو تھے"، ابوالقاسم آمدی جیسے شخص کے
ابن ندیم ان کے مصنفات کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے
کے ہم مذہب تھے۔"

مولد و منشا جاحظ کے مولد کے بارے میں مورخین اور رواۃ میں اختلاف
ہے، بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اس کی ولادت ۱۵۹ھ
بعض کچھ اور کہتے ہیں، لیکن صحیح تر روایت خود جاحظ کی ہے جسے یاقوت
اپنی "معجم" میں نقل کیا ہے کہ جاحظ کہتا تھا، میں ابونواس سے ایک سال
ہوں، میں ۱۵۰ھ کے اوائل میں کتم عدم سے عالم وجود میں آیا، اور وہ
. . . . خود جاحظ کی اس "نص" کے بعد شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں

ابن خلکان کی روایت حد درجہ تعجب خیز ہے اس نے اپنی کتاب میں خطیب بغدادی کی "تاریخ بغداد" سے یہ قول نقل کیا ہے کہ "ابونواس کی پیدائش ۱۳۶ھ میں ہوئی، لیکن اس قول کی اہمیت جاحظ کے اس قول سے زائل ہو جاتی ہے، جس میں اس نے اپنی اور ابونواس کی عمر بیان کی ہے،

جاحظ بصرہ میں پیدا ہوا، اس زمانہ میں بصرہ وکوفہ ہی دو شہر تھے جو تہذیب و تمدن، علوم وفنون اور لغت وادب کے مرکز تھے، بغداد اس وقت تک عہد طفولیت میں تھا، اس کی عمرانیت وحضارت بھی اس درجہ تک نہیں پہنچی تھی، گرچہ عمران وتمدن کی طرف نہایت تیزی سے بڑھ رہا تھا،

جاحظ کی نشو ونما بصرہ ہی میں ہوئی، اور وہیں سے اس کی تعلیم وتربیت کا آغاز ہوتا ہے، پھر ایسا بھی ہوا کہ بحث واستقرار اور علماء عصر سے استفادہ کی خاطر وہ بصرہ چھوڑ کے اس زمانے کے دوسرے اسلامی ممالک کی طرف گیا، جہاں سے وہ کامیاب وکامران واپس ہوتا تھا، جب اس کی عمر ۵۰ سے متجاوز ہو گئی، تو اس نے بغداد کا رخ کیا، اور اسی کو اپنا مستقل مستقر بنا لیا، بغداد جب وہ پہنچا تو مامون رشید کا عہد سعادت تھا، اس وقت تک بغداد ترقی وسرفرازی کی ساری منزلیں طے کر چکا تھا بغداد میں اس کا داخلہ ۲۰۴ھ میں ہوا، جب اس کے قیام کی شہرت ہوئی تو علماء وفضلا کی ایک جماعت کی جماعت مشتاق زیارت ہو کر آئی اور طالبان علم کا تو میلا امنڈ آیا، ہر صنف اور ہر جنس کے طلبہ موجود تھے نسل وقوم کا امتیاز ہی نہیں تھا، جاحظ کہتا ہے "فرار میرے پاس علم کلام حاصل کرنے کے لئے آیا، لیکن اس کو اس فن سے مناسبت نہیں تھی"[2]

ایک خیال یہ بھی ہے کہ جاحظ کو علم حدیث سے کوئی لگاؤ نہیں تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ علوم حدیث میں بھی وہ کمال حاصل کر چکا تھا، اور مسند درس کی زینت بن چکا تھا،

غور و فکر اور بحث و استقراء کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں تعلیم و تع
کا دستور یہ تھا کہ پہلے بچہ ابتدائی طور پر لکھنا پڑھنا سیکھتا تھا، پھر کچھ صرف و نحو کی
تعلیم ہوتی تھی پھر کچھ تھوڑا سا حساب سکھایا جاتا تھا۔ پھر قرآن مجید پورے طور سے
قرآت وغیرہ کے ساتھ پڑھایا جاتا تھا اس کے بعد بچے کو کسی داستان گو کے سپرد
کر دیتے تھے، جو بادشاہوں کی جنگ و فتح کے قصے سناتا تھا، بہادروں کے کار
بتاتا تھا، شہسواروں اور سپہ سالاروں کی کہانیاں سناتا تھا، اصحاب جنگ و جدل
کی سیرت بیان کرتا تھا، اور یہ سب وہ اس طرح کرتا تھا کہ عبرت و موعظت کا پہلو
ہاتھ سے نہیں جانے پاتا تھا، یہ باتیں پورے طور سے بچے کے دل میں گھر کر
جاتی تھیں، اسی سلسلہ میں عابدوں اور زاہدوں خلوت نشینوں اور بزرگوں کے
بھی بیان کرتا جاتا تھا، ان متفرق معلومات پر عبور تام حاصل کر لینے کے بعد
عامہ کے حلقہائے درس میں شریک ہوتا تھا، فقیہہ کی تعلیم حاصل کرنے کے
محدث کے حلقہ کا رخ کرتا تھا، پھر اہل لغت کی مجلس میں جاتا تھا، وہاں ماہرین
کے درس میں شریک ہوتا تھا، وہاں سے ماہرین اخبار و آثار کے پاس
تھا پھر منطقی کی مجلس میں، وہاں سے فلسفی کے دربار میں، پھر محفل ادب میں وہاں
مہندس کے "معمل" میں پھر مفسر کے ہاں زانوئے شاگردی تہ ہوتا تھا اور
اصولی و متکلم کی جماعت میں پھر محفل روایت میں، اور وہاں سے "شاعر" کے
ذکر میں، پھر انشا پردازوں کے دفتر میں اور وہاں سے منجمین کے رصد خانوں میں
کسی اسطرلابی کے حضور میں اور وہاں سے کسی جغرافی کے سامنے، پھر رزم
کسی "استاد" کے دولت خانہ پر، وہاں سے کسی ساز و چنگ کے مرشد کے
کسی دف دنے بجانے والے کے گھر پر یہ تھا اس عہد کے اسلوب تعلیم کا
تھا کہ جس سے لڑکے اور لڑکیاں دونوں کو بہ قدر استعداد حصہ ملتا تھا،

تھا۔ مثلاً قاضی ابو یوسف شاگرد امام ابو حنیفہ (قاضی القضاۃ، چیف جسٹس) بغداد
زید بن ہارون سری بن عبدویہ و حجاج بن محمد بن حماد بن سلمہ وغیرہ۔
جاحظ سے بھی بہتوں نے اس فن کو حاصل کیا، مثلاً مبرد۔ یموت بن مرزع اور
ابوبکر بن ابی داؤدؒ سجستانی وغیرہ۔

اسباب معاش اور عزت وجاہ

جاحظ کے ابتدائی ایام بہت تنگدستی اور فقر و فاقہ میں بسر ہوئے ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ نہر سیحان پر مچھلی اور روٹی بیچا کرتا تھا، یہ روایت صحیح ہو یا نہ ہو ہر حال اس سے تو یہ ثابت ہی ہوتا ہے کہ ابتدائی ایام اس کے بہت عسرت و فلاکت میں گزرے۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے اس کی سبکی ہوتی ہو، جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے فضل و کمال کا ایک زمانہ قائل ہے۔ اس کی تصنیفات سارے عالم میں پھیلی ہوئی ہیں جب وہ روشناس خلق ہوا تو ساری دنیا اس کی طرف امنڈ پڑی، اس کے اسباب معیشت وسیع ہو گئے، اور وہ عیش و عشرت میں اپنی زندگی بسر کرنے لگا، اب تو حالت یہاں تک پہنچ گئی، کہ وزرائے دولت اور عمائد سلطنت اس سے قرب رکھنے لگے، مثلاً خاندان برامکہ کے افراد، کل طاہریہ کے اشخاص، فتح بن خاقان، ابراہیم بن عباس الصولی، محمد بن عبدالملک زیات، احمد بن ابی داؤد وغیرہ۔

میمون بن ہارون نے یہ دیکھ کر کہ اب تو اس کی خوب مزے میں بسر ہوتی ہے ایک بار اس سے دریافت کیا "کیا بصرہ میں تمہارے پاس کوئی جاگیر ہے؟"
جاحظ مسکرایا اور کہا "ہاں، میں ہوں، میری جاریہ ہے، ایک خادمہ ہے جو اس کی خدمت کرتی ہے، ایک نوکر ہے، ایک گدھا ہے، بس یہ ہے"

---
۱ (ترجم)

جب طالب علم اپنے علم و فن میں استحکام حاصل کر لیتا تھا، تو اسے اپنے شیوخ
کی طرف سے سند ملتی تھی، اس کے بعد اسے حق حاصل ہو جاتا تھا کہ وہ مسند
و تدریس کو سنبھال لے، لیکن بہت سے ان اسناد پر اکتفا نہیں کرتے تھے
اس کے بعد بھی بادیہ گری کرتے تھے۔ بڑے بڑے شیوخ و علماء سے
کرتے تھے، استفادہ کرتے تھے، مجلس مناظرہ منعقد کرتے تھے،

اسی نظام و دستور کے مطابق جاحظ نے بصرہ اور کوفہ کے اکابر علمائے
حاصل کی، جن لوگوں سے اس نے تعلیم حاصل کی، ان میں سے چند کے اسما
آپ بھی سن لیجیے، مثلاً ابو عبیدۃ معمر بن مثنیٰ، اصمعی ابو زید انصاری، اخفش
ابو اسحٰق نظام سے اس نے علوم کلام و مذہب اعتزال کی تعلیم حاصل کی۔
اس نے اپنے شیوخ سے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ تو کیا ہی تھا مگر
بصرہ کے مربد میں جایا کرتا تھا، اور تازہ وارد اعراب بادیہ سے فصاحت
کے درس لیتا تھا[1]

اس مربد میں عرب تجارت اور اسباب تجارت کی خرید و فروخت اور لین دین
لے آیا کرتے تھے، خطبا و شعراء رواۃ و نساب، رجز خوان اور ارباب بلاغت
مختلف قبائل سے متعلق ہوتے تھے، سب ہی آتے تھے اپنے نتائج
پیش کرتے تھے، اور داد فصاحت دیتے تھے اور خراج تحسین لیتے تھے
گویا اسلام میں "سوق عکاظ" کا دوسرا نمونہ تھا۔

جاحظ نے علم حدیث بھی بہت سے اور قابل استناد بزرگوں سے حاصل

---

[1] اعراب بادیہ کی فصاحت و بلاغت ہمیشہ معیار رہی، اب کہ دنیا اس قدر تہذیب
سے آشنا ہو چکی ہے اور زبان عربی بھی مختلف ادوار سے گزر چکی ہے! ایں ہمہ اب
اعراب بادیہ کی عربی سند ہے (مترجم)

ہے، رہی خلافت کی تمنا تو یا تو یہ اس کی حرص بے پایاں کا ایک ثبوت ہے، یا پھر اس نے بطور مزاح کہا ہوگا، ورنہ اگر ایسی بات وہ سنجیدگی سے کہتا تو اس کا نتیجہ بھی نہایت تلخ ہوتا، وہ سمجھدار آدمی ایسی احمقانہ بات کیوں کرتا، مزاح میں یہ بات اس کے منہ سے نکل گئی ہوگی۔

میر منشی میر منشی کا منصب اسلامی ممالک میں نہایت اہم عہدہ تھا۔ حکومت عامہ کی سیاست اسی محور پر گردش کرتی تھی، اس منصب جلیل پر وہی مامور کیا جاتا تھا، جو مختلف علوم و آداب میں دسترس رکھتا تھا، جس کا شمار اصحاب سیاست و تدبیر میں ہوتا تھا، اور جو اپنی دانش و بینش کی بنا پر عام طور سے ممتاز سمجھا جاتا تھا۔

مامون الرشید نے جاحظ کی فضیلت کی بنا پر اسے اس عہدہ پر مامور کر دیا، بعض لوگوں کو اس کی یہ سرفرازی و قدر افزائی گراں گزری، وہ لوگ طرح طرح کے حیلے سوچنے لگے، اور مامون تک اس کی چغلی بھی پہنچنے لگی، یہ رنگ دیکھ کر تین دن کے بعد جاحظ نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا جو منظور ہو گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جاحظ ان آزاد نگاروں میں تھا جو اپنا قلم آزاد رکھتے ہیں، اور اصحاب دولت و اقتدار، خلفا و ملوک اور وزرا و ارباب دولت سے مرعوب نہیں ہوتے یا ان لوگوں میں تھا جو اس قسم کے مناصب کو حصول عزت و جاہ کا ایک زینہ سمجھتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ اس کا میلان آزاد نویسی ہی کی طرف تھا۔

علم و وسعت علم جاحظ نے بہت سے علوم میں کمال حاصل کیا تھا فلاسفۂ یونان، حکمائے ہند، علمائے فارس اور ادبائے روم کی اکثر کتابیں اس نے مطالعہ کی تھیں، ان کے افکار و آرا پر اس نے غور کیا تھا، کسی علم و

میری کل کائنات، ایک بار میں نے اپنی کتاب " الحیوان" محمد بن الملک زیات
ہدیۃً بھیجی تو اس نے مجھے پانچ ہزار دینار عطا کئے " البیان والتبیین" ا
ابی داؤد کو میں نے عطیۃً بھیجی، اس نے بھی مجھے پانچ ہزار دینار بخشے
طرح کتاب " الزرع والنخل" ابراہیم بن عباس الصولی کو میں نے بھیجی
مجھے پانچ ہزار دینار عنایت کئے، اب میں بصرہ میں ہوں، میری جاگیر
سانخ ہے، جو نہ تجدید کی محتاج ہے نہ اس کی کھاد وغیرہ کی فکر کی
جب کہ جاحظ کی مالی حالت اتنی مستحکم ہو گئی تھی، تو پھر یہ امر باعث
نہیں رہ جاتا کہ اس نے زمین کے چپہ چپہ کو علم سے لبریز کر دیا اور اپنے
ازاں سے فضل و فہم میں بہ مدارج بڑھ گیا، اور ہر علم و فن پر متعدد تصانیف
ایک ذخیرہ تیار کر دیا، اس لئے کہ نعم و عطایا آدمی کو بے فکر کر دیتے ہیں
اپنی استعداد کے مطابق اپنے ذوق سے کام لیتا ہے۔
جاحظ کے بعض احباب و اخوان اس کے پاس آئے اور پوچھا
عثمان کیا حال ہے؟" جاحظ نے جواب دیا " تمہارے سوال کے دو پہلو
کا الگ الگ جواب سن لو، حال تو برابر ہے کہ وزیر میری رائے پر عمل
جو میں کہہ دیتا ہوں اس کو نافذ کرتا ہے، خلیفہ کے انعامات و اکرامات
سلسلہ ہے کہ جاری ہے، پرندوں کا گوشت کھاتا ہوں نرم و ریشمی لباس
اس طبرستانی گدے پر بیٹھتا ہوں، اور دیکھو یہ تکیہ لگاتا ہوں، اور اب
کہ خدا کسی طرح یوم عیش و مسرت لائے۔" ان میں سے ایک نے کہا
حال میں ہو یہ عیش و مسرت نہیں ہے؟" جاحظ نے جواب دیا، عیش و مسرت
حاصل ہو گی جب خلافت میرے قبضہ میں ہو گی۔"
ان الفاظ میں گویا خود جاحظ نے اپنی عزت و جاہ کا پورا حال

اسے خوب جانتے ہیں۔"

جاحظ کی کتابیں دوسروں کے نام سے

ہر عہد و ہر زمانہ میں ارباب قلم آفات فقر و فاقہ میں مبتلا ہوئے، جاحظ بھی نہ بچ سکا۔ قدماء کے آثار کی عظمت، گزشتہ لوگوں کا اعتبار لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہوتا ہے، بہ نسبت اپنے زمانہ کے، چنانچہ مسعودی نے اپنی کتاب "التنبیہ و الاشراف" میں روایت کی ہے، کہ جاحظ باوجود اپنی جلالت قدر کے کہتا تھا۔

"میں نے بہت سی کتابیں تالیف کیں، جو کثرت معانی اور حسن نظم کی بنا پر خوب تھیں، لیکن میں نے لوگوں کی توجہ اس طرف نہیں دیکھی، پھر میں نے اس سے کم درجہ کی کتابیں تالیف کیں، کسی کو میں نے عبداللہ بن مقفع کی طرف منسوب کر دیا، کسی کو سہل بن ہارون کی طرف بس لوگ دوڑ پڑتے تھے، اور اس کے نسخے ہاتھوں ہاتھ نکل جاتے تھے، ان کتابوں میں سے سوا اس کے کوئی بات نہیں تھی کہ میں نے انہیں متقدمین کی طرف منسوب کیا تھا۔"

اس قول صریح سے ثابت ہوتا ہے کہ جاحظ نے اپنی بہت سی کتابوں کو ابن مقفع اور سہل بن ہارون وغیرہ کی طرف منسوب کیا، عجیب تر بات یہ ہے کہ اس اعتراف صریح کے باوجود اب تک دس صدیاں گزر چکی ہیں، لیکن کوئی ایسا مرد باخدا نہ ہوا جو ابن مقفع کی کتابوں کا مطالعہ کرکے جاحظ اور اس کے اسلوب کا فرق سامنے رکھ کر کوئی تحقیق کرتا۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ابن مقفع کے اب آثار ہی کیا موجود ہیں، کیونکہ جاحظ کی بہت سی کتابیں محو ہو گئیں، سہل بن ہارون اور ابن مقفع کی کتابیں

فن کی کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جو عربی میں ترجمہ ہوئی ہو اور جاحظ نے اس کا
نہ کیا ہو۔

ابو ہفان کہتے ہیں "جاحظ سے زیادہ کتابوں کو محبوب رکھنے والا
کبھی دیکھا نہ سنا، جو کتاب بھی اس کے ہاتھ پڑ گئی بس ختم کر کے دم لیا، یہ
یہاں بڑھا ہوا تھا، کہ کتب فروشوں سے رات رات بھر کے لئے ان کی دوکان
لے لیتا تھا، اور رات بھر کتابیں دیکھا کرتا تھا، حافظہ بھی غضب کا تھا
وسیع الروایۃ، قوی الحجۃ اور تیز زبان تھا اسے علم و فضل کی" (انسائیکلو
چاہیے دنیا کی کون ایسی چیز تھی، جو اس کے احاطۂ معلومات سے خارج

اس کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی جانتا تھا
کی کوئی ایسی مسکت دلیل نہیں ہے جو پورے طور سے اس کو ثابت کر
لیکن اس کی عبارت و الفاظ سے ایسے قرائن ضرور ملتے ہیں جو اس رائے
موید ہیں،

ابو بکر احمد بن علی کا یہ قول جاحظ کی وسعت علم و کمال پر ایک
ہے وہ کہتا ہے،

"جاحظ اصحاب نظام میں سے تھا، علم کلام میں وہ پورے طور سے
دین و دنیا میں بھی وہ بہت بڑا فاضل اجل تھا، اس کی بہت سی
کتابیں دین و مذہب کی حمایت میں ہیں، نیز آداب و اخلاق
ظرافت و سنجیدگی سے متعلق بھی اس نے بہت سی کتابیں لکھی
لوگ ان کتابوں کو پڑھتے ہیں، اور اس کے فضل و کمال کے قائل
ہیں، جاحظ معتزلہ و غیر معتزلہ ہر جماعت میں نہایت عظمت و عزت
کا مالک تھا، جو علماء اشخاص کے قدر شناس اور معاملہ فہم

اس کا انداز عجیب و غریب ہے، وہ جب چاہتا ہے رائی کا پہاڑ بنا دیتا
ہے اور جب چاہتا ہے پہاڑ کو رائی کر دکھاتا ہے، کبھی وہ کالوں کو گوروں پر
بڑے شد و مد سے ترجیح دیتا ہے کبھی وہ حامیانِ عثمان کو روافض سے بہتر
ثابت کرتا ہے اور کبھی وہ یزیدیوں کو عثمانیوں اور اہلِ سنت پر تفوق دیتا
ہے کبھی وہ حضرت علی کی فضیلت بیان کرتا ہے، اور کبھی ان کی تنقیص کرتا
ہے، کبھی وہ ایک کتاب لکھتا ہے، جس میں عیسائیوں کی طرف سے
مسلمانوں پر اعتراض ہوتے ہیں، اور کبھی احادیثِ رسول کے ساتھ تمسخر اور
استہزا کرتا ہے جو اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں مثلاً . . . . حجرِ اسود کے
متعلق وہ کہا کرتا تھا کہ وہ تو سفید ہے، مشرکین و کفار نے اپنی سیاہ
کاریوں سے سیاہ کر دیا تو چاہیئے تھا، کہ اسلام جب پھیلا اور لوگ
مسلمان ہوئے تو پھر وہ سفید ہو جاتا، اسی طرح صحیفۂ رضاعت پر بھی وہ
کہا کرتا تھا .. .. .. الخ

اب آیئے ذرا ابن قتیبہ کے اس طعن کی حقیقت پر غور کریں۔ حجرِ اسود کے متعلق
[ابن] عباس سے ایک روایت ہے کہ حجرِ اسود جنت کے پتھروں میں سے ایک پتھر تھا
[وہ] دودھ کی طرح سفید تھا، لیکن مشرکین و کفار کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا /
[مگر] حضرت محمد بن الحنفیہ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے) فرماتے تھے
[کہ حجرِ] اسود بھی عام پتھروں میں سے ایک پتھر ہے، جاحظ حضرت ابن عباس کی طرف
[منسوب] قول منسوب ہے اس کی ندرت کی بنا پر یہ کہا کرتا تھا پھر مسلمانوں نے مسلمان ہو کر
[اسے] سفید کیوں نہیں کر لیا؟

اب رضاعت کے مسئلہ کو لیجیئے، حضرت عائشہ صدیقہ کی طرف ایک قول منسوب
ہے کہ رجم اور رضاعت کے متعلق وحی آئی، وہ ایک کاغذ میں میرے بستر کے نیچے

بھی نذر دور ایام ہوگئیں،

جس طرح جاحظ نے اپنی بہت سی کتابیں دوسروں کی طرف غلط طور سے
منسوب کردیں اسی طرح دوسروں نے بھی اس کی طرف بہت سے مصنفات
جلب منفعت کے خیال سے) منسوب کردیئے، جیسے کتاب "الابل" اور
"الہدایا" حسب تحقیق یاقوت (صاحب معجم) ایک عرصہ سے اس کی طرف منسوب
ہیں "تنبیہ الملوک والمکائد" بھی اس کی طرف منسوب ہے جس کی جانب
پاشا نے اشارہ بھی کیا ہے۔

"المحاسن والاضداد" "کتاب التاج" "الدلائل والاعتبار علی الخلق و
اس کی طرف غلط طور سے منسوب ہیں، جاحظ کا اسلوب نگارش تو ان
نہیں جاتا،

جاحظ نگاہ اعدا میں

ارباب علم و دانش کی ایک مخالف جماعت
ان کے قدردانوں اور قدر افزاؤں کے
ساتھ ہمیشہ رہی ہے، جاحظ بھی اس خصوصیت سے مستثنیٰ نہیں تھا، اس کے
دشمن تھے، بداندیش تھے، اور یہ سب کے سب اس کے فضل وکمال کے
منکر تھے، اور اسی طرح ذریعۂ اشاعت تھے جس طرح عقیدت مند
دوستوں کی جماعت، اسکے خصوصیات وکمالات کی تبلیغ کیا کرتی تھی۔

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کے خصوم و اعدا نے اس پر جو الزام
لگائے ہیں وہ آپ کے سامنے پیش کردیں، تاکہ معلوم ہوسکے کہ
سب سے پہلے ہم ابن قتیبہ کے مطاعن سے گفتگو کا آغاز کرتے
کہتا ہے:۔

"جاحظ کا شمار آخر متکلمین میں ہے، وہ ننگ متقدمین

JAF & CO.
Plot # 43/4 Q-2, Block 6
PECHS, Near Jheel Park
Karachi.

رہی ابن قتیبہ کی یہ تنقیص کہ وہ ایک چیز بڑی شد و مد سے ثابت کرتا ہے اور بڑی زور شور سے اس کی تردید بھی کرتا ہے، تو یہ تو گویا اس کی قوتِ بیان کا اعتراف ہے۔ ابن قتیبہ نے کیوں کر فراموش کر دیا کہ یہ اعجاز بلاغت ہے جو خدا کی طرف سے صرف جاحظ ہی کے حصہ میں آیا تھا یا اسے بھی چھوڑ دیجیے۔ اس پر غور کیجیے کہ دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز ہے جو معائب سے بری ہو؟ یا یکسر خیر ہو یا سراسر شر؟ ظاہر ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے دو پہلو نہ نکلتے ہوں، ایک حیثیت سے وہ سزاوارِ ستائش ہوتی ہے، تو دوسرے اعتبار سے مستحق مذمت ... یہ جاحظ کا کمال ہے کہ وہ جو چیز پیش کرتا ہے، اور اس قدر مجلّا اور مشرح طور سے کہ دوسرا نہیں کر سکتا۔

ابوالعباس ثعلب سے روایت کی جاتی ہے کہ ایک مجلس میں اس نے کہا "جاحظ کا ذکر چھوڑ دو، وہ تو غیر ثقہ ہے"، شاید اسی قول کی بنیاد پر ابو منظور ازہری کا یہ قول بھی ہے کہ "جاحظ کو زبان و خطابت میں ملکہ حاصل تھا، علوم و فنون میں ...یت وسیع النظر تھا، لیکن اہل علم و معرفت اس کی برائی کرتے ہیں اور اس کے صدق کو مشتبہ سمجھتے ہیں۔"

اس قسم کے اقوال سے جاحظ کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے جن پر نہ کوئی دلیل ہو نہ برہان، بات تو وہ قابل التفات ہوتی ہے جو دلائل و براہین سے محکم ہو، بدیع الزماں ہمدانی اپنے مقالہ میں جاحظ کا ذکر بایں الفاظ کرتا ہے:
"جاحظ بلاغت کے دو پہلوؤں میں سے ایک میں خوشہ چینی کرتا ہے ... دوسرے میں تہی رہ جاتا ہے، بلیغ تو وہی کہلاتا ہے جس کی نثر و نظم کا پلہ بھاری ہو، اشعار سے اس کا کلام داغدار نہ ہو جاتا ہو۔ تو جاحظ کا کوئی منظوم بھی کسی کو معلوم ہے؟ ہم نے کہا نہیں، تو کہا، اس کا کلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت رکھی ہوئی تھی جب آنحضرت
انتقال فرمایا تو ہم اس میں مشغول ہو گئے، اتنے میں کسی قبیلہ کی ایک بکری آ
اسے کھا گئی، . . . . . " یہ عجیب بات ہے علمائے احناف اس مسئلہ میں
ہم آہنگ ہیں "جواہر مضیئہ" میں ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک تحریم رضاعت
و کثیر دونوں سے ہوتی ہے، اور امام شافعی کے ہاں پانچ رضعات کے بعد
ہے، ابوحنیفہ تو دلیل میں حدیث پیش کرتے ہیں، "الرضاعۃ من المجاعۃ
شوافع کی دلیل کیا ہے؟ احناف کہتے ہیں کہ دلیل تھی تو شوافع کے پاس
اسے بکری کھا گئی!

جاحظ بلکہ تمام معتزلہ اس قسم کے خرافات و مہملات سے انکار کرتے
اور واقعہ تو یہ ہے کہ ان کے دلائل بھی بڑے قوی ہیں اس واقعہ کو وہ
خلاف سمجھتے ہیں " وانہ لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ
من خلفہ" تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس جیسی عزیز و مستحکم چیز کو بکری
زمن باطل ہو جاتا، اور دلیل ساقط ہو جاتی ویسے تو دنیا کی ہر شخصیت
کر سکتی نہ محو کر سکتی ہے لیکن ایک بکری کے قبضۂ تصرف میں یہ کچھ ہے
ایسا تھا بھی تو قرآن کی اس آیت کی کیا تاویل ہوگی؟ " الیوم اکملت لکم دینکم
کے بعد خود خدا نے اسے بھیج دیا کہ وہ کھائے؟ اور اس کی حفاظت
کا کوئی انتظام نہ کیا جاسکے؟ اور پھر وہ آیت نازل ہی کیوں کی گئی
معمول بہ نہیں بننا تھا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ جاحظ کے اعتزال کی بنا پر ابن قتیبہ کو اس
تھی، اور حقد و تعصب کا یہ نہایت عجیب نمونہ ہے کہ ایک غلط بات
کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا جائے۔

ہو جاتا اس لئے کہ علم و عمل کے میدان میں اس نے ایک جغرافی کی حیثیت سے قدم
نہیں رکھا تھا۔

جاحظ نگاہ حق شناس میں ایک وہ شخص جو اس کے فضل و منزلت سے واقف ہو، اس کے نزدیک تو جاحظ بلاشبہ عربی انشا پردازوں کا سردار، ادبائے عرب کا شیخ اور ارباب علم و بیان کا امام ہے، فصاحت و بلاغت کا ستون ہے، ارباب فلسفہ و حکمت اور اہل علم و ادب میں سے کوئی شاید ہی اس جیسے کمال تک پہنچا ہو، اس کے معارف کا درجہ تو یہاں تک بلند ہے، کہ اسے ان لوگوں میں شمار کرنا چاہیے جن پر اسلام کو فخر ہے۔ ابو حیان توحیدی نے ایک مستقل کتاب "تقریظ الجاحظ" کے نام سے لکھی ہے، ہمیں اس کتاب کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن یاقوت نے اس کتاب سے یہ عبارت نقل کی ہے:۔

"ہم سے صابیئن کی ایک جماعت نے بیان کیا کہ ثابت بن قرہ[۱] نے کہا کہ امت عربیہ میں تین ہستیاں بہت زیادہ قابل رشک گزری ہیں، ان میں سے پہلی ہستی تو عمر بن الخطاب کی ہے . . . . دوسری ذات حسن بصری کی ہے . . . .[۲] اور تیسری شخصیت ابوعثمان الجاحظ کی ہے جسے خطیب المسلمین، شیخ المتکلمین کہیے تو بجا ہے وہ جیب

۱؎ کوفہ . . . پورا نام ابوالحسن ثابت بن قرہ ہے۔ مذہباً صابی تھا، طبیب و فیلسوف صاحب فضل و کمال تھا، ہیئت و ہندسہ و طب میں خاص دستگاہ رکھتا تھا، ۲۲۱ھ میں ولادت ہوئی اور ۲۸۸ھ میں بغداد میں انتقال ہوا ۱۲۔ ۲؎ صاحب کتاب نے ان دونوں بزرگوں کے متعلق ثابت کی تفصیلی رائے نقل کر دی ہے، لیکن چونکہ اس کا موضوع سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا، اس لئے اسے نظر انداز کر دیا گیا (مترجم)

ادو، تمھیں معلوم ہوگا کہ اس کے کلام میں اشارات کم ہیں، عبارت قریب الفہم
ہے، استعارے بھی شاذ و نادر ہیں، کلام میں پیچیدگی نہیں ہے، سیدھا سادا
کلام وہ استعمال کرتا ہے، کیا تم میں سے کسی نے اس کا کوئی ایسا کلام
جو سماعت پر بار ہو؟"

بدیع الزماں کے اس قول کو میں جاحظ کی حمایت میں سمجھتا ہوں نہ
نہیں اس لئے کہ یہ ایسے اوصاف ہیں جو ادبا میں بہت کم پائے جاتے ہیں
جاحظ میں تھے۔

لغزش

جاحظ اپنی وسعت علم، گہرائی فہم اور دانش و بینش کے باوجود
کبھی ٹھوکر بھی کھا جاتا ہے، اور دنیا میں کون ایسا ہے جس سے
نہ کوئی کبھی نہ کبھی غلطی نہ ہوتی ہو، وہ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا، مثلاً مسعودی
نے جغرافیہ میں اس کی ایک غلطی نکالی ہے کہ:۔

" سندھ میں مہران نامی جو نہر ہے جاحظ اسے دریائے نیل کا ایک حصہ
سمجھتا تھا، اور دلیل اس پر لاتا تھا کہ اس میں بھی گھڑیال ہیں جیسے
نیل میں ہیں، کم سے کم میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ گھڑیالوں کا وجود دلیل
کیونکر بن سکتا ہے؟ اس نے اپنی کتاب "امصار" میں لکھا ہے
نے نہ کبھی دریا کا سفر کیا، نہ وہ کوئی بڑا بھاری سیاح تھا نہ
سے واقف تھا، اس کی حالت تو اس شخص کی سی تھی، جو رات کو جنگل
اندھیرے میں لکڑیاں چن رہا ہو، ایسے ہی وہ بھی دوسروں کی کتابوں
نقل کر دیتا ہے۔"

اس میں شبہ نہیں کہ مسعودی کا اعتراض بجا ہے علاوہ
فن میں مہارت تامہ بھی رکھتا تھا، لیکن اس لغزش سے جاحظ کا

دونوں ابو ہریرہ بخشے گئے تھے۔“

ابوحیان کہتا ہے، یہ قول ایک صحابی کا ہے، جس کے دل میں اسلام کی ذرا سی حرمت نہیں ہے، نہ مسلمانوں کا کوئی احترام ہے، اس نے یہ تنقید کی ہے اور حق کو ایسی نظروں سے دیکھا ہے کہ ہوا و ہوس کے جذبات دور کر دیے ہیں، ایسی عقل سے کام لیا ہے، کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ تعصب فراموش کر گیا ہے، ہم اپنے دوسرے اسلاف و اخلاف کے فضائل و محاسن سے ناواقف نہیں ہیں، لیکن ہمیں اس شخص کی یہ بات پسند آئی کہ جو اگرچہ ہمارا ہم قوم و ہم زبان نہیں ہے اور جو شاید حضرت عمر بن الخطاب کے سوانح حیات پر پورا عبور بھی نہیں رکھتا، اور اسی طرح جاحظ کے علم و ادب پر پوری وسعت نظر بھی نہیں رکھتا، لیکن بایں ہمہ وہ ایسی بات کہتا ہے، اور اس طرح رشک کرتا ہے، اور جاحظ پر اپنے کلام کو ختم کرتا ہے، ایک عیب جو جاحظ میں معائب ہی معائب دیکھتا ہے، لیکن وہ اس سے قطع نظر کر کے اس کی صفائی دیتا ہے۔

ابوحیان کہتا ہے۔ میں نے ابو محمد الاندلسی سے (جو سیرافی کی جماعت کے ایک رکن تھے) کہا، ہم ابو سعید سیرافی کی مجلس میں سرگرم تکلم تھے، کہ ایک اختلاف

۔ پورا نام ابو محمد بن محمود الزبیدی الاندلسی ہے، نحو، لغت اور شعر کے امام تھے، جاحظ کے کلام سے بہت دلچسپی رکھتے تھے، یہاں تک کہ وہ کہا کرتے تھے کہ جنت میں ان کے سارے اسباب تنعم کے بجائے اگر مجھے جاحظ کی کتابیں مل جائیں تو میں اس تبادلہ پر تیار ہوں، ابو سلیمان منطقی اور ابو سعید سیرافی کی جماعت کے ایک بہت ممتاز رکن رہے۔

گفتگو کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سحبان[1] کی فصاحت و بلاغت
کان آشنا ہو رہے ہیں، وہ اگر مناظرہ کرتا ہے تو نظام کو مات کر دیتا ہے
اگر سنجیدگی سے کچھ کہتا ہے تو عامر[2] بن عبد قیس سے بھی بڑھ جاتا ہے
اور اگر ہزل و مذاق پر اتر آتا ہے تو مزبد[3] سے بھی بازی لے جاتا ہے۔
تو جاحظ وہ تھا جس سے دل کو سرور اور روح کو تازگی حاصل ہوتی
ہے، وہ شیخ العرب اور لسان العرب تھا، اس کی کتابیں ایک ایسا
باغ ہے، جو کلیوں سے لبریز ہو اور اس کے رسائل ان کے پھل،
بڑے بڑے خلفاء اس کی عظمت کے قدر شناس تھے، اور امراء
اس کی تعریف میں رطب اللسان، بادشاہ اسے اپنا ندیم بناتے تھے
اور علماء اس سے کسب علم کرتے تھے، بڑے بڑے مغرور متکبر اس
کے فضائل کو تسلیم کرتے تھے اور عامۂ خلائق اس کی محبت میں گرفتار
تھی، وہ زبان و قلم دونوں کا مالک تھا، علم و ذہانت دونوں اس کے
حصہ میں تھیں، رائے اور ادب پر بھی اسے قابو حاصل تھا نثر و نظم کا بھی
وہ بادشاہ تھا، اور فہم و ذکا سے بھی اسے بہرۂ وافر ملا تھا، اس کی
اچھی خاصی ہوئی، اس کی حکمت سارے جہان میں بوئے گل کی طرح
پھیلی، لوگوں نے اس کے نقش قدم پر چلنا باعث سعادت سمجھا، اس
کے نام سے انتساب باعث فخر و نازش مانا گیا اور جنہوں نے اس کی
پیروی کی وہ کامیاب ہوئے بلاشبہ اسے "حکمت" اور "فصل خطاب"

---

[1] ۔ سحبان وائل مشہور عربی خطیب ۔
[2] ۔ فصاحت و بلاغت میں مرتبۂ خاص کا مالک تھا۔
[3] ۔ ابو اسحاق مزبد۔ نوادرات و فکاہات میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

ثمامی کہدیتا تو بہت خوش ہوتے، ان کا سینہ جاحظ کی عظمت و بزرگی سے بھرا ہوا تھا، اگر کوئی صاحب آداب و علوم ان کے پاس آتا اور وہ اس کا امتحان لینا چاہتے کہ عقل و ذہانت میں کیسا ہے، تو پہلے تو وہ بغداد کے متعلق اس کی رائے دریافت کرتے، اگر وہ بغداد کے خصوصیات و محاسن سے واقفیت کا ثبوت دیتا تو گویا یہ اس کے فضل و عقل کا مقدمہ ہوتا، پھر جاحظ کے متعلق پوچھتے تھے اگر یہ دیکھتے کہ اس کے انداز گفتگو سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس نے جاحظ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، اس کی تصنیفات سے استفادہ کیا ہے، اس کے بحر علم و کلام سے جرعہ نوشی کی ہے تو اس کے متعلق فیصلہ کر دیتے کہ اس کی پیشانی پر علم ادب کا نشان چمک رہا ہے اور اگر دیکھتے کہ یہ شخص بغداد کی برائی کر رہا ہے، جاحظ کے واجبات و معارف سے ناآشنا ہے، تو پھر چاہے جتنے محاسن رکھتا ہو سب بے کار۔

ابوالقاسم سیرافی بیان کرتے ہیں کہ ہم اپنے استاذ ابوالفضل بن العمید وزیر کے دولت خانہ پر حاضر تھے، باتوں باتوں میں جاحظ کا ذکر نکل آیا، حاضرین میں سے ایک شخص نے اس کی برائیاں بیان کرنا شروع کیں، لیکن وزیر صاحب خاموش رہے، جب وہ چلا گیا تو میں نے پوچھا تعجب ہے، آپ اس آدمی کی باتوں پر خاموش رہے، حالانکہ اور لوگوں سے آپ خوب بحث کرتے ہیں۔

انھوں نے جواب دیا اس کے مقابلہ میں زیادہ بلیغ صورت یہ تھی کہ اسے اس کے جہل پر باقی رہنے دیا جاتا، اگر میں اسے روک کے دلائل پیش کرنے لگتا تو وہ

۱؎ ثمامہ بن اشرس نہایت ذکی و ذہین شخص تھا، مامون الرشید کے صاحب اعتماد لوگوں میں شمار ہوتا تھا، فصاحت و بلاغت میں بھی بڑا پایہ رکھتا تھا۔ حکمار کے طرز پر اس کی بہت سی کتابیں ہیں، بعض لوگوں نے اس پر زندقہ کا الزام بھی لگایا ہے لیکن یہ غلط ہے معتزلہ کی جماعت کا ایک دقیع شخص تھا۔ ۱۲

آن پڑا، اور وہ اختلاف تھا جاحظ اور ابو حنیفہؒ صاحب "النبات" کی فصاح
و بلاغت سے متعلق اور ہم سب تمہیں حکم بنانے پر راضی ہیں، اب کہو تمہاری
رائے ہے؟

محمد نے کہا، میں دونوں کی مخالفت میں کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا، یہ
کہا بہر حال کچھ تو کہیے،

محمد نے جواب دیا، ابو محمد نداوۃ کے اعتبار سے زیادہ ہیں اور ابو عثما
جاحظ حلاوت کے لحاظ سے بڑھے ہوئے ہیں، ابو عثمان کے معانی دل
انداز ہوتے ہیں، کانوں کو گراں نہیں گزرتے، ابو حنیفہ کے الفاظ بہت ز
شیریں ہوتے ہیں، اور اسالیب عرب کے بہت زیادہ آئینہ دار ہوتے ہیں

یاقوت کے قول کے مطابق ہنر شناسان علم کلام کی متفقہ رائے یہ ہے
دنیا میں بس تین متکلم گزرے ہیں جاحظ، علی بن علیبدہ، اور ابو زید بلخی
سے جاحظ تو وہ ہے جس کے الفاظ معانی سے زیادہ ہوتے ہیں، اور علی
وہ ہے، جس کے معنی الفاظ سے زیادہ ہوتے ہیں، اور ابو زید وہ ہے، جس
لفظ و معنی دونوں کا توازن بالکل درست ہوتا ہے، لیکن اس رائے کے
خود یاقوت نے روایت کی ہے کہ "ابو زید کو" جاحظ خراسان کہا جاتا
کی جلالت شان و عظمت کے لئے یہ کافی ہے کہ ابو زید بلخی جیسا فخر روزگار
طرف منسوب کیا جائے۔

ابو الفضل بن عمیدان لوگوں میں سے تھے جو جاحظ کے پرستاروں
کئے جا سکتے ہیں، اسی کے اسلوب و مذہب پر وہ عامل تھے۔ اگر کوئی

لہ ابو حنیفہ احمد بن داؤد و تنداالدینوری، مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے، ایک
پر لکھی، اس میں بہت زیادہ مشہور ہوئے ۲۸۲ھ میں وفات پائی۔ ۲ہ علی بن علیبدہ

تھا اور اس کے ارد گرد بے ریش و بروت لڑکے بیٹھے ہوئے تھے سوا اس کے کسی اور کی اس مجلس داڑھی نکلی رہی نہیں، اس منظر سے میں کچھ گھبرا سا گیا، میں نے پوچھا

"تم میں سے ابوعثمان کون ہے" ؟

اس نے میری طرف گھور کے دیکھا اور کہا،

"کہاں سے آئے ہو؟"

میں :۔ "اندلس سے"

جاحظ :۔ "حمقوں کی سرزمین" اچھا نام کیا ہے ؟"

میں :۔ "سلام"

جاحظ :۔ "ایک کتے کا نام، ابن"؟

میں :۔ "ابن یزید"

جاحظ :۔ "بہت خوب، کنیت ؟"

میں :۔ "ابو خلف"

جاحظ :۔ "سگ زبیدہ کی کنیت ؟ تشریف کیوں لائے ؟"

میں :۔ "علم حاصل کرتے"

جاحظ :۔ "تشریف لے جایئے، کامیابی مشکل ہے"

میں :۔ "آپ نے انصاف نہیں کیا، میں طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔"

جاحظ :۔ "تم نے میرے ارد گرد بیس لڑکے دیکھے، سوا میرے کسی کی داڑھی رہی ہو؟ مجھے پہچاننے میں دقت کیوں پیش آئی" ؟

"ان تمام باتوں کے باوجود میں جاحظ کے ہاں بیس سال تک مقیم رہا۔"

میرا خیال ہے کہ جاحظ نے سرزمین اندلس کے متعلق جو کچھ کہا وہ بالکل بجا

جاحظ کی کتابوں کا مطالعہ کرتا اور اے ابوالقاسم وہ آدمی بن جانا، جاحظ کی کتابیں
عقل سکھاتی ہیں پھر علم و ادب اور یہ میں نہیں چاہتا کہ وہ آدمی بنے!

ابن عبید کہتے ہیں "تین علوم ایسے ہیں کہ تمام دنیا ان کے بارے میں تین
کی عیال" ہے :-

فقہ میں امام ابوحنیفہ،

کلام میں ابوالہذیل العلاف،

فصاحت و بلاغت میں ابوعثمان جاحظ۔

ابو محمد الحسن بن عمرو النجری کا ایک عجیب دلچسپ واقعہ بیان کیا جاتا ہے وہ
ہیں کہ میں اندلس میں تھا، میں نے سنا کہ یہاں جاحظ کے ایک شاگرد ہیں جن
بن یزید کہتے ہیں، ابوخلف کنیت کرتے ہیں، میں ان کے پاس گیا، وہ ایک
تھے، میں نے ان سے جاحظ کی ملاقات کا حال دریافت کیا اس لئے کہ جاحظ
اندلس میں آیا نہیں تھا، انھوں نے کہا :-

مشرق کے طلبہ ہمارے بادشاہوں کے ہاں اس لئے شرف و عزت
مستحق سمجھے جاتے تھے کہ وہ جاحظ سے شرف حاصل کر چکے ہیں اتفاقاً
میں اس کی ایک کتاب "التربیع والتدبیر" آئی اس کے بعد ہی اس کی دوسری
"البیان والتبیین" آئی، پھر میں نکل کھڑا ہوا اور کسی مانع کی پروا نہیں کی
پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ تبر میں ہے ادھر کا قصد کیا، تو معلوم ہوا، وہ بصرہ
بصرہ جب پہنچا تو خبر اس کے سامنے حاضری کا موقع حاصل ہوا، جاحظ

لہ ۔ ابوالہذیل العلاف بصری، ان کا شمار اکابر معتزلہ اور افاضل اہل کلام
ہے، صاحب علم و نظر بزرگ تھے، منطق و فلسفہ میں متقدمین کی تمام کتابوں
نظر رکھتے تھے۔ ۱۲

اس نے "الفرق بین النبی والمتنبی" اور "دلائل النبوۃ" کا "الفرق" کے ساتھ ذکر کیا ہے اور "الفرق" کا ذکر چوتھی جلد میں پھر کیا ہے، میں نے دونوں کتابیں دیکھنا چاہیں اور ان دونوں میں سے ایک ہی پر میں کامیاب ہو سکا، یعنی "دلائل النبوۃ" پر جسے غلطی سے "الفرق" بھی کہتے ہیں، مجھے اپنی اس ناکامیابی پر افسوس ہوا، جب میں مصر سے مکہ میں داخل ہوا تو عرفات میں (جہاں دنیا بھر کے لوگ موجود تھے، اور ایسا عجیب و غریب منظر تھا، کہ بیان نہیں کیا جا سکتا ہے) میں نے پکارنا شروع کیا: خدا اس شخص پر رحم کرے جو "الفرق بین النبی والمتنبی اللجاحظ" کا مجھے پتہ دے سکے، لیکن یہ ندا بے اثر رہی اور کسی نے بھی اس کا اعتراف نہ کیا، نہ پتہ بتایا، ابن رخشید کہتے ہیں اس سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ اپنے دل سے کہہ سکوں کہ میں جو کچھ کر سکتا تھا، کر چکا۔"

یاقوت کہتا ہے ابوعثمان جاحظ کی فضیلت کو کافی ہے کہ ابن رخشید جیسا یگانۂ روزگار جو فلسفہ کا ایک بڑا مبصر اور معتزلہ کا ایک نہایت گراں پایہ سردار تھا، جاحظ کی کتابوں کو اس درجہ عزیز و محبوب رکھتا تھا کہ عرفات و بیت الحرام میں ندا دیتا رہا۔

ایک مجلس میں ابوہفان سے پوچھا گیا، کہ تم جاحظ کی ہجو کیوں نہیں کرتے؟ حالانکہ تمہارے حریف سے باز نہیں آتا، اس نے جواب دیا، خدا کی قسم اگر جاحظ ایک معمولی سا رسالہ بھی لکھ دے تو اس کی شہرت چین تک پہنچے گی، اور میں اگر ایک ہزار بیتیں بھی کہہ ڈالوں تو ہزار برس تک وہ یوں ہی رہیں گی۔

القاضی الفاضل[1] جیسا شخص اقرار کرتا ہے، کہ تمام انشاپردازان عہد جاحظ

---

[1] ابوعلی عبدالرحیم القاضی الفاضل، صلاح الدین ایوبی کا وزیر باتدبیر، جو اپنی اصابت رائے، سیاست دانی، فصاحت، بلاغت، ذکاوت، اور بہت سے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۴ پر)

وہ درست ہے، عربوں کے دخول سے پیشتر اس میں مجد و شرف کا کوئی سامان نہیں ...
نہ کوئی تمدن تھا، نہ تہذیب، لیکن عربوں نے جب اسے فتح کیا تو وہ اپنے ساتھ
صرف فوج و سپاہ نہیں لے گئے، بلکہ عقل وسیع، ذہن صافی، علوم صالحہ ...
نافعہ، ہمت مرداں کے خزانے بھی لے گئے، وہ اپنے ساتھ جراثیم حیات اور ...
عمرانیت بھی لے گئے، انھوں نے وہاں مدنیت قائم کی، حضارت قائم کی، انسانیت ...
شرف و بزرگی کا راستہ کھول دیا، لیکن جب وہ عہد مسعود ختم ہو گیا، ان کی قوت ...
ضعیف پڑتی گئی، ان کی ہمت دبتی گئی، تا آنکہ سب کچھ ختم ہو گیا،

تصنیفات کی شہرت

عرب انشا پردازوں میں شاید کسی شخص کی کتابوں ...
وہ شہرت دوام اور ہر دلعزیزی نہیں حاصل ...
جو جاحظ کی تصنیفات کو حاصل ہوئی، جب بھی وہ کوئی کتاب یا رسالہ لکھتا تو ...
لوگ اس پر ٹوٹ پڑتے تھے، کوئی زبانی یاد کرتا تھا، کوئی نقل کرتا تھا، غرض ...
دھوم مچ جاتی تھی،

عالموں کی مجلسیں اور ادیبوں کی محفلیں جاحظ اور اس کی تصنیفات کے ذکر ...
بھری رہتی تھیں، جہاں کسی شہر میں کوئی کتاب پہنچی، بس اس کے درس ...
کا سلسلہ شروع ہو گیا،

ابوحیان توحیدی کہتے ہیں کہ ہم سے علی[1] بن عیسیٰ النحوی بیان کرتے ...
اپنے شیخ ابن اخشید کو کہتے ہوئے سنا کہ
جاحظ نے اپنی کتاب "الحیوان" میں اپنی تمام کتابوں کی فہرست گنوا ...

---

[1] ابوالحسن علی بن عیسیٰ بن عبداللہ الرمانی، اخشیدی اور وراق سے مشہور ...
نیز "رمانی" ہی کہے جاتے ہیں، مختلف علوم و فنون میں دستگاہ رکھتے ...
متکلم تھے، ۲۹۶ھ میں ولادت ہوئی اور ۳۸۴ھ میں وفات۔

ادبن طابخہ تھا، اور کنانہ نے اپنے باپ خزیمہ کی وفات کے بعد ان سے نکاح کرلیا، تب نضر کی پیدائش ہوئی (جیسی کہ عرب جاہلیت میں عادت تھی کہ سوتیلا لڑکا اپنے باپ کی وفات کے بعد اپنی ماں سے نکاح کرلیا کرتا تھا) لیکن جاحظ نے اس افترا کے تار پود بکھیر کے رکھ دیے ہیں، وہ کہتا ہے کہ ان سے کنانہ کی کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی نہ ذکر نہ انثیٰ، لیکن ان کی بھتیجی برۃ بنت مر بن ادبن طابخہ تھیں جن کی کنانہ بن خزیمہ سے شادی ہوئی تھی، اور ان سے نضر پیدا ہوئے تھے، یہ صرف دو ناموں کا ایک ہونا ہے، اس سے اتنی غلط فہمی پھیلی ...... یہی وہ صحیح مسلک ہے جس پر اہل علم و اہل نسب کا اتفاق ہے، جاحظ کہتا ہے کہ اس کے علاوہ جو شخص عقیدہ قائم کرے کفر کا مرتکب ہوگا ..... میرا تو یہ خیال ہے کہ جاحظ اپنے اس کارنامہ کی بنا پر یوم آخرت میں ماجور ہوگا،

تحقیق علمی ہی کے خیال سے اس نے متعدد شہروں میں سفر کیا، وہ مصر بھی گیا، اور وہاں ایک عرصہ دراز تک مقیم رہا اور اپنے تجربات کی آزمائش کرتا رہا۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب "حسن المحاضرہ" میں جہاں ان اہل علم کا ذکر کیا ہے جنھوں نے مصر کا سفر اختیار کیا، ان میں جاحظ کا ذکر نہیں کیا شاید اس لئے کہ وہ معتزلی تھا، میں سمجھتا ہوں یہ مختصر نمونہ اس باب میں کافی ہے۔

فن ترجمہ اور جاحظ گزشتہ صفحات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ عربی میں کسی غیر زبان کی کوئی ایسی کتاب منتقل نہیں ہوئی، (عام اس سے کہ وہ کسی علم وفن سے تعلق رکھتی ہو) جسے جاحظ نے پورے طور سے ہضم بقول بعض، ہضم نہ کرلیا ہو، اگرچہ اس زمانہ میں نہ پریس کی یہ عالمگیر ترقی تھی نہ معمولی کتابوں تک پہنچنے کا ذریعہ سفر تھا یا خود نقل کرنا تھا یا کتب

کی کتابوں سے نفع اٹھاتے ہیں،

اہل بصرہ اہل کوفہ سے تفاخر کیا کرتے تھے، اور اسی طرح اہل کوفہ اہل بصرہ

خطیب بغدادی بیان کرتے ہیں کہ بصرہ کے لوگ کوفہ والوں سے ان کتابوں

تفاخر کیا کرتے تھے، کتاب الحیوان اللجاحظ، کتاب سیبویہ کتاب العین للخلیل

ابو القاسم اسکافی کہا کرتے تھے، کہ تین چیزیں ہیں جن کو میں بلاغت کی

سمجھتا ہوں (۱) قرآن مجید (۲) کلام جاحظ (۳) اور بحتری کے اشعار

ابن درید کے سامنے دنیا کی مسرت افزا چیزوں کا ذکر کیا گیا، انھوں نے کہا

چیزیں تو زیادہ سے زیادہ "فردوس نظر" ہو سکتی ہیں، وہ چیزیں کہاں ہیں جو

کو طراوت بخشتی ہوں، لوگوں نے پوچھا وہ کیا؟ کہا جاحظ کی کتابیں، محدثین کے

اور ابو العیناء کے نوادر،

ابو محمد اندلسی کہا کرتے تھے کہ جنت کے سارے سامان تنعم پر میں جاحظ

کو ترجیح دیتا ہوں،

پایۂ تحقیق و شوق سفر

جاحظ ادب میں فرد فرید تھا، نہ صرف ادب

تمام علوم و فنون میں وہ یکساں مہارت رکھتا

ان لوگوں میں تھا جو مسائل علمیہ سے دلچسپی لیتے ہیں، اور اہل بحث و نظر کی

گفتگو کرتے ہیں، اس نے نسابین کی اس بڑی غلط فہمی کو رفع کیا جو

اپنی جہالت کی وجہ سے نہ معلوم کیا سے کیا کر دیا تھا، مثلاً زبیر بن بکار

کی جاتی ہے کہ ان کا خیال یہ تھا، کہ ام نضر بن کنانہ ابن خزیمہ کا نام برۃ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۳) ممتاز خصائص میں مشہور امام ہے، ولادت ۵۶۹ھ میں مقام

اور وفات ۶۹۰ھ میں بمقام قاہرہ ہوئی۔ ۱۲ ؎ ابو عبادہ الولید بن عبید البحتری

۲۰۲ھ وفات ۲۸۴ھ ہ

دوسرا طریقہ حنین[۱] بن اسحاق اور عباس بن سعید جوہری[۲] کا ہے وہ یہ کہ ترجمہ کرنے والا پورا جملہ پڑھ لیتا ہے، اپنے ذہن میں اس کے معنی مقرر کر لیتا ہے پھر اسے ایسے عربی جملہ میں منتقل کرتا ہے کہ پورا پورا مفہوم ادا ہوتا ہے خواہ الفاظ ہم آہنگی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں۔ ظاہر ہے یہ اصول بہت زیادہ کامیاب ہے، اسی لئے لوگوں کا خیال ہے کہ حنین بن اسحاق کی کتابیں جو طب، منطق طبیعات، اور الٰہیات سے متعلق ہیں وہ کسی قسم کی تہذیب و اصلاح کی محتاج نہیں ہیں۔ ان علوم ریاضی میں انکی جو کتابیں ہیں وہ بلاشبہ نظر ثانی کی محتاج ہیں، اس لئے کہ اس فن میں انھیں پورا عبور حاصل نہیں تھا، اس زمانہ کا یہ دستور تھا نقل و ترجمہ کا۔

اب حسب وعدہ ہم جاحظ کا قول فیصل" اس باب میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

"مترجم ان مفاہیم کو ہرگز ادا نہیں کر سکتا جن کا حکیم نے لحاظ رکھا ہے، نہ ان نکتوں اور حقائق کو سمجھ سکتا ہے جو کتاب میں بیان کئے گئے ہیں جب تک وہ خود اس علم یا فن میں جس کا وہ ترجمہ کر رہا ہے، اصل مصنف کی سی استعداد نہ رکھتا ہو، مترجم کے لئے ضروری ہے، کہ جس زبان سے وہ ترجمہ کر رہا ہے اس میں اپنی مادری زبان کی سی مہارت

---

[۱] [illegible] حنین بن اسحاق عبادی، علوم اوائل کے ماہر تھے، طبیب تھے، بہت سی قدیم [illegible] کو عربی میں منتقل کیا ہے، یونانی، سریانی اور لاطینی خوب جانتے تھے، بعض خلفا کتاب [illegible] سونا تولا کرتے تھے، ۲۶۴ھ میں وفات ہوئی۔

[۲] [illegible] عباس بن سعید الجوہری بہت بڑے فلکی اور منجم تھے، ارصاد اور اس کے [illegible] کی پوری مہارت رکھتے تھے، ان کی زیج مشہور ہے، اکابر مہندسین [illegible] میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔

زردشتوں کے سامنے دست سوال دراز کرتا تھا،

جن کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا اور وہ گرہیں جو شروح وحواشی تعلیقا
وتفاسیر وتاویلات میں بعض اہل بحث ونظر مثلاً فارابی، ابن سینا ابن رشد
نے سقراط وافلاطون، بقراط وارسطو، جالینوس وفیثاغورث وغیرہ کی کتابوں
پیدا کر دی تھیں، اور علماء ومفکرین حیران تھے، کہ کیا صورت نکلے کہ
ہو، جاحظ نے اس دشوار گزار راہ میں بھی رہنمائی کی اور ان گرہوں کی گرہ کشا
قبل اس کے کہ آپ کے سامنے جاحظ کی رائے پیش کی جائے مناسب
ہوتا ہے کہ اس عہد کے اسلوب نقل اور طریق ترجمہ کا ایک مختصر سا
کر دیا جائے،

اس زمانہ میں نقل وترجمہ کی دو صورتیں تھیں:-

ایک تو وہ طریق تھا جسے یوحنا بن بطریق اور ابن ناعمہ الحمصی کا
چاہیے، یعنی لفظ پر لفظ رکھنا، جس لفظ کو یونانی یا کسی اور زبان میں دیکھا
عربی میں مترادف تلاش کیا اور اسے اس کی جگہ پر رکھ دیا یہاں تک کہ
کا ترجمہ ہو گیا، ظاہر ہے کہ یہ طریقہ حد درجہ مہمل ہے اس لئے کہ مترجم
عربی پر مہارت تو رکھ نہیں سکتا تھا کہ ہر غیر زبان کے لفظ کے مقابلہ میں
ہی وسیع المفہوم لفظ عربی سے تلاش کر کے اس کی جگہ پر رکھ دیتا، نتیجہ
کہ کتاب نہ عربی ہی ہوتی تھی نہ عجمی، اس طریقہ ترجمہ سے بہت نقصان پہنچا
فارسی ہندی، سریانی اور لاطینی کے بہت سے کلمات اسی طرح رہ گئے
ترکیبیں دوسری زبان کی ویسی مخصوص ترکیبیں نہ حاصل کر سکیں، مجازات
کے استعمال میں بھی یہی صورت رہی۔

عام اس سے کہ وہ اہل اسلام سے ہوں یا کسی اور مذہب سے مگر ہوں " مشرک " "صفریہ"[1] نے بھی ان کی موافقت کی ہے لیکن ان کے خیال میں بچوں کا قتل ناجائز تھا ۔ "نجدات"[2] کا فتویٰ یہ تھا کہ وہ گناہ کبیرہ جس پر امت نے اجماع کر لیا ہو، اس کا مرتکب تو بلا شبہ مشرک و کافر ہے لیکن جس گناہ پر امت میں اختلاف ہو تو اسے اہل فقہ کے اجتہاد پر چھوڑ دینا چاہیئے ۔ "اباضیہ"[3] کا قول یہ ہے کہ جس گناہ میں خدا کی طرف سے وعید ہو اور کرنے والا اسے جانتا ہو جو خدا کی طرف سے وعید آئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہو تو وہ کفران نعمت کا مرتکب ہو گا لیکن ایسا کافر نہیں ہو گا جس نے کفر یا شرک کیا ہو ۔ حسن بصری اور ان کے ہم خیال بزرگوں کا خیال یہ ہے کہ مرتکب گناہ کبیرہ منافق ہے ۔

لیکن جمہور امت کا فیصلہ یہ ہے کہ اس امت مومنہ کا مرتکب گناہ کبیرہ مسلمان تو ہوا اپنے اس اعتقاد کی بناء پر جو اس کو اللہ سے ہے اس کی نازل کی ہوئی چیزوں پر ہے رسول اور کتب آسمانی پر ہے، البتہ اگر کوئی گناہ کبیرہ کرتا ہے تو وہ فاسق ہے لیکن ایمان اور اسلام کی اس سے نفی نہیں ہوتی ۔ لوگ انہی تخیلات میں تھے کہ اسی زمانہ میں ایک شخص حسن بصری کے پاس آیا ، وہ جو والی مسجد میں اپنی مجلس میں رونق افروز تھے ، اس نے سوال کیا "یا امام الدین ! ہمارے زمانہ میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی ہے ، جو گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہتی ہے ۔ کبیرہ ان کے نزدیک ایسا کفر ہے کہ ملت سے خارج کر دیتا ہے ۔ یہ تو ہوئے " وعیدیہ " (خوارج کی) ایک دوسری جماعت ہے وہ کہتی ہے

۱؎ خوارج کا ایک فرقہ زیاد بن اصفر کی طرف منسوب ہے ۔
۲؎ خوارج کا ایک فرقہ جو نجدہ بن عامر کی طرف منسوب ہے ۔
۳؎ خوارج کا ایک فرقہ عبداللہ بن اباض کی طرف منسوب ہے ۔

رکھتا ہو۔

"ہمارا یہ قول تو کتب ہندسہ، تنجیم، حساب اور موسیقی کے متعلق تھا،

لیکن قرآن مجید وغیرہ میں ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔"

یہ ہیں جاحظ کے خیالات نقل و ترجمہ کے بارے میں اس طریقہ سے ا

گویا نقل و ترجمہ کا راستہ روشن تر کر دیا ہے۔

اعتزال اسلام میں

قبل اس کے کہ جاحظ کا مسلک اعتزال پیش کیا

نامناسب نہ ہوگا، اگر اعتزال کے نشو و نما وغیرہ پر

ذرا بسط کے ساتھ کچھ عرض کر دیا جائے۔

معتزلہ یا قدری یا اہل عدل و اسلام جو چاہے کہیے وہ جماعت بے

مضبوط اور صاحب فکر و عمل جماعت ہے، اس کے شیوخ طلیق اللسان او

بیان تھے،

یہ جماعت پہلی صدی ہجری کے اواخر میں ظہور پذیر ہوئی تو وہ زمانہ

کا ایک فرقہ "ازارقہ"[1]، زوروں پر ہے۔

بصرہ اور اہواز میں خاص طور سے اس کے اثرات و نقوش قائم

معاملہ بہت زیادہ نازک ہو گیا تھا، عبدالملک بن مروان کے عہد خلافت

بن یوسف کے زمانۂ ولایت (عراقین) میں یہ صورت اور زیادہ سخت ہو

گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کیا سمجھا جائے؟ یہ ایک سوال پیدا ہوا، ہر جماعت

ہر فرقہ اور مذہب نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، جن میں سے "ازارقہ

یہ تھا کہ گناہ خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ اس کا مرتکب مشرک ہے چونکہ ان

مشرک کی اولاد بھی مشرک ہوتی تھی اس لیے عورتوں اور بچوں کا قتل وا

---

[1] خوارج کا سب سے بڑا فرقہ "نافع بن ازرق کی طرف منسوب ہے۔"

ادراک کسی طرح بھی اس دنیا میں نہیں کر سکتے ہیں، اور نہ آخرت میں وہ کسی طرح بھی دیکھا جا سکتا ہے، اسی نے تمام چیزوں کو پیدا کیا، ایجاد کیا۔ وہ اشباہ و امثال سے قطعاً بری ہے، نہ کوئی مکان اس کا حصر کر سکتا ہے، نہ کوئی زمانہ اس کو محدود کر سکتا ہے، نہ وہ جسم ہے، نہ عرض ہے، نہ عنصر ہے، نہ جزو ہے، نہ جوہر ہے، وہ تمام چیزوں کا صورت گر ہے، وہ عالم بالذات ہے، عالم بعلم نہیں، وہ قادر لذاتہ ہے، حی بالذات ہے، اس کے صفات بھی قدیم ہیں، اور معانی اس کے ساتھ ساتھ قائم ہیں، قدم (قدامت) میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

یہ اصول اقوال فرقہ "مجسمہ"[1] کے رد میں وضع کیا گیا ہے۔

(۲) **العدل** — یعنی اس بات کا اعتقاد کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، فساد کو نہیں پسند کرتا ہے، اور شر کا صدور اس سے اسی وقت ہوتا ہے جب بندوں کے لئے اس میں کوئی مصلحت ہو اور اس سے جو کچھ صادر ہوتا ہے وہ بندوں کی مصلحت کے لئے ہوتا ہے، بندوں سے جو خیر و شر، صلاح و فساد کے حرکات سرزد ہوتے ہیں ان کا انہیں پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، یعنی اچھی باتوں پر ثواب اور بری باتوں پر عذاب، اس لئے کہ ان کو جو قدرۃ تفویض کی گئی ہے، اس کی بنا پر وہ خلق افعال پر قادر ہیں، اللہ تعالیٰ اگر چاہتا، تو وہ قوۃ و قدرت جب چاہتا سلب کر لیتا، اور جب چاہتا باقی رہنے دیتا۔ اگر چاہتا تو مخلوق کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا تھا، اور معصیت سے روک سکتا تھا لیکن اس لئے نہیں کیا، اپنے بندوں کو اس نے ایسی تکلیف نہیں دی جو ان کی طاقت سے باہر ہو، اور نہ ایسی باتیں کہیں جو ان کی مقدرت میں نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ نے حسنات کے کرنے کا حکم دیا ہے [illegible] ان تمام سیئات سے بری ہے، جن سے اس نے منع

---

[1] یہ ایک قدیم فرقہ جو اعضاء انسانی کی طرح اللہ کو بھی صاحب اعضا مانتا ہے۔

کہ ایمان کے ساتھ معصیت کچھ نقصان نہیں پہنچاتی اور کفر کے ساتھ اطاعت
یہ لوگ "مرجیہ" کہلاتے ہیں، پھر آپ اس بارہ میں کیا فرماتے ہیں؟ حسن بصری نے
جب یہ سنا تو وہ غور کرنے لگے، قبل اس کے کہ وہ کوئی رائے قائم کرکے جو
دیں، واصل بن عطا جواب دے بیٹھے کہ صاحب گناہ کبیرہ نہ تو مومن مطلق
نہ کافر مطلق، بلکہ وہ ان دونوں کے درمیانی راستہ میں ہے، حضرت حسن کو
اس جلد بازی سے غصہ آگیا، وہ اس جرأت نازیبا پر خفا ہوئے تو واصل ا
ساتھیوں کو لے کر اٹھ گئے، اور مسجد کے ایک ستون کے پاس مجمع کر کے
ظاہر کرنے لگے، اسباب وعلل بیان کرنے لگے، مقدمات و نتائج ترتیب
لگے، حسن بصری نے ایک شاگرد عمرو بن علبید کو واصل کے پاس مناظرے کے
بھیجا۔ مناظرہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمرو بن علبید بھی واصل سے مل گئے۔

معتزلہ نام کیوں پڑا؟ اس میں کئی اقوال ہیں، مثلاً حسن بصری سے جب و
مفارقت اختیار کی تو انھوں نے کہا، "واصل ہم سے جدا ہو گئے" یا قتادہ
حسن بصری کی وفات کے بعد جب ان کی مجلس میں بیٹھے تو انھوں نے عمرو
اور ان کے معتقدین کو "معتزلہ" کہا وہب بن منبہ کہتے ہیں، کہ عمرو بن علبید
کے اصحاب جب حسن بصری سے الگ ہو گئے تو "معتزلہ" کہلانے لگے

معتزلہ کے فقہا نے پانچ اصول بتائے ہیں کہ یہی مذہب اعتزال کی
و بنیاد ہیں، جس نے ان کو پورے طور سے مانا وہی "معتزلی" ہے
نے ان میں کچھ کم یا زیادہ کیا وہ اس "شرف" کا مستحق نہیں ہے۔

(۱) التوحید: یعنی اس بات کا اعتقاد کہ خدا ایک ہے۔ کوئی اس ک
نہیں ہے، وہ قدیم ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے حادث ہے

لہ - اعتزال کے معنی ہیں ترک کر دینا، چھوڑ دینا، الگ ہو جانا۔

کہ وہ بھی اس شرف سے مشرف ہو؟ اس لئے نہ اسے مومن کہتے ہیں نہ کافر۔ اس لئے کہ خصالِ خیر اور اس کی ماتحت چیزوں کا وہ انکار نہیں کرتا، لیکن اگر دنیا سے بغیر توبہ کئے ہوئے گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے بعد رخصت ہو جائے، تو بلاشبہ وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، اس لئے کہ دارالجزا میں "یا جنت ملے گی یا دوزخ"، (فریق فی الجنۃ وفریق فی السعیر)

(۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر — یعنی اس بات کا اقرار کہ اہلِ ایمان حدود خداوندی کے بجا لانے پر مکلف ہیں اور یہ جو تکالیف ہیں یہ بھی اللہ تعالےٰ کا اپنے بندوں پر لطف ہے، مقصد صرف امتحان ہے اور اس کی آزمائش کہ وہ اپنے فرائض ادا کرتے ہیں یا نہیں؟ اور ہر مسلمان پر یہ واجب ہے کہ ان باتوں کی طرف دعوت دے اور جو مخالفت کرے اسے خدا سے ڈرائے۔

یہ اصول اس آیۂ پاک کی تعمیل ارشاد ہے "ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر"

یہ ہیں وہ اصول پنجگانہ جنہیں فقہاء معتزلہ نے ترتیب دیا ہے لیکن امامت کے بارے میں بھی ان کا ایک خاص مسلک ہے یعنی انتخاب امام امت کا حق ہے وہ جس میں اس کی صلاحیت دیکھے کہ احکام خداوندی کا اجرا کر سکتا ہے، اور حدود شریعت نافذ کر سکتا ہے خواہ وہ قریش سے ہو یا کسی اور قبیلہ سے اسے وہ منتخب کرے اس لئے کہ معتزلہ کسی شخص یا قبیلہ کے لئے امامت کو مخصوص نہیں سمجھتے ہیں۔ حضرات ان کے علاوہ تمام خوارج اور "زیدیہ" کی ایک جماعت معتزلہ سے متفق ہے۔ وہ یہ استدلال پیش کرتے ہیں، کہ حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے وقت فرمایا

...معروفی ... کو ... سے ثابت ہوتا ہے؟ (مترجم)

فرمایا ہے، کوئی شخص کسی چیز پر قادر نہیں ہے مگر اس قدرت پر جواسے عطا

کی گئی ہے۔

یہ اصول "مجبرہ"[1] کے خلاف وضع کیا گیا ہے جن کے سردار جہم بن صفوان[2]

(۳) الوعد والوعید ——— یعنی اس بات کا اعتقاد کہ اللہ تعالیٰ صادق

ہے، وعید کا نافذ کرنے والا ہے، جو مسلمان طاعت و استقامت پر وفات

پاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے نوازتا ہے، اگر کسی شخص نے گناہ کبیرہ کیا ہو، اور

توبہ کے مر گیا ہو، تو وہ دائمی طور سے جہنم کا مستحق ہے، لیکن اس کا عقاب کافر

سے کم ہوگا، اللہ تعالیٰ کے ارشادات بدلتے نہیں ہیں۔

یہ اصول ان لوگوں کے خلاف وضع کیا گیا ہے جو جواز کذب باری کے

ہیں۔

(۴) اسماء واحکام ——— یعنی اس کا اقرار کرنا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب

نہ کافر ہے نہ مومن بلکہ بین بین ایک چیز ہے لیکن اس کا شمار کفر و اسلام کے

درمیان یعنی "فسق" میں ہوگا، اگر وہ اسی فسق کی حالت میں مر گیا تو جہنم کا دائمی

اور وہ ہے۔ ہاں کافروں کا سا خلود فی النار نہیں ہوگا،

یہی وہ اصل الاصول ہے، جسے اعتزال کی جڑ کہنا چاہیے، واصل

بن عطا اور عمرو بن عبید کے نزدیک ایمان عبارت ہے عادات و خصائل خیر

اگر خصائل خیر کسی شخص میں جمع ہیں، تو بلاشبہ وہ مومن ہے، مومن

ملدح ہے اور فاسق چونکہ اس خیر سے خالی رہتا ہے اس لیے وہ اس

---

[1] - ایک فرقہ کا جس کا عقیدہ یہ تھا، کہ انسان مجبور محض ہے، ۱۲

[2] - جہم بن صفوان ترمذی، فارسی الاصل، فرقہ جبریہ کے سردار، جعد کے

ہوئے۔ ۱۳۱ھ میں وفات پائی۔ ۱۲

یہ بھی معلوم ہو چکا کہ ابتداء میں یہ مسئلہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا، لیکن اس کے باوجود بعد میں اس میں بھی فرقے بنے، جماعتیں قائم ہوئیں، جتھا بندی ہوئی اور جدل و بحث کا بازار گرم ہوا،

جاحظ چونکہ شیوخ معتزلہ میں سے تھا۔ وہ مخصوص رائے کا مالک تھا، اور اپنی رائے میں بہتوں سے منفرد بھی تھا، اور ایک جماعت کی جماعت اس کی پیرو بھی تھی، اس لئے ایک پورا فرقہ "جاحظیہ" کے نام سے قائم ہو گیا، اس کی کتابوں میں اعتزال کے متعلق جو کچھ ملتا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو اس کے "عنایت فرماؤں" نے ازراہ عداوت و خصومت اس کے سر تھوپا ہے۔

ابن راوندی[1]، البغدادی[2]، ابن حزم اور شہرستانی[3] کو اس سے خاص طور سے عداوت تھی، ان لوگوں نے جاحظ کی طرف طرح طرح کے قول منسوب کئے ہیں، جو اس کے ہرگز نہیں ہیں اور انہی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ آگے بھی یہ سلسلہ جاری رہنے دیا، بعض کا اس کے انصار و احباب نے جواب بھی دیا ہے، مثلاً مقریزی نے شہرستانی سے یہ روایت نقل کی ہے، کہ جاحظ کہا کرتا تھا کہ قرآن منزل از قبیل اجسام و اجساد ہے، یہ بھی ممکن ہے وہ آدمی ہو جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ حیوان ہو جائے کہ اس سے بڑھ کر کذب صریح اور افترائے محض کیا ہو سکتا ہے کون اسے

---

[1] ابوالحسین احمد بن یحییٰ الراوندی، انشاپرداز اور فلسفی تھے، ان پر زندقہ کا الزام لگایا جاتا ہے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ توبہ کے بعد ان کا انتقال ہوا سنہ وفات ۲۹۸ھ

[2] ابو منصور عبدالقاہر بن طاہر التمیمی البغدادی صاحب کتاب "الفرق بین الفرق" ۴۲۹ھ میں فوت ہوئے۔

[3] ابوالفتح محمد بن عبدالکریم الشہرستانی صاحب کتاب "الملل والنحل" عالم، فاضل فقیہ متکلم ... ۴۷۹ھ میں بمقام شہرستان تولد ہوئے، ۵۴۸ھ میں بمقام شہرستان

کہ اگر سالم موجود ہوتا، تو میں بلا تامل خلافت اسے سونپ دیتا، سالم ایک انصاری
کے غلام تھے، عام طور سے سالمؒ مولیٰ ابی حذیفہؓ کے نام سے مشہور ہیں
حضرت عمرؓ اگر امامت کو سارے مسلمانوں کے لئے جائز نہ سمجھتے ہوتے تو یہ بات
کیسے فرماتے؟ اور سالم کی وفات پہ اظہار تاسف کیوں کرتے؟ اس باب میں
امام ابو حنیفہ، اکثر مرجیہ، زیدیہ میں سے بھی غالب تعداد، تمام شیعہ اور رافضیہ کو
اختلاف ہے، یہ لوگ سوا قریش کے اور کسی کو امامت کا مستحق نہیں سمجھتے ہیں
دلیل یہ لاتے ہیں "الامامة فی قریش"

فرقہ معتزلہ کے بانی واصل بن عطا اور عمرو بن عبید کی جب وفات ہوئی ہے
وقت تک کتب فلسفہ، حکمت، منطق، طبیعیات، اور الٰہیات وغیرہ کا یونانی
رومی، ہندی، اور سریانی زبانوں سے ترجمہ نہیں ہوا تھا، ان دونوں نے
وفات کے وقت اپنے مذہب کو بالکل سادہ حالت میں چھوڑا تھا دلائل و براہین
محکم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی، بلاغت، عربیت، اور فصاحت بدویت
بیان، اور زور بیان پر اس عمارت کی تعمیر ہوئی تھی، لیکن جب اوائل عہد عباسی
میں یہ علوم عربی میں منتقل کئے گئے تو لوگوں نے بہت زیادہ دلچسپی کو
اسی زمانہ میں علم کلام کی ابتدا ہوئی جس میں ابو الہذیل علاف، ابو اسحاق ابراہیم
بن سیار النظام خاص طور سے معروف و ممتاز ہیں، پھر ہمارے ہیرو
کی باری آتی ہے جس کا سارا عالم معترف ہے۔

جاحظ اور اعتزال تفصیل بالا سے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں
نشو و نما کیوں کر ہوئی؟ واصل بن عطا اور عمرو
نے اپنے استاذ حسن بصری سے کیوں مفارقت اختیار کی؟ معتزلہ نام کیوں
ان لوگوں کے عقائد کیا ہیں؟ اصول کیا ہیں؟

رسالوں سے اس کا ثبوت ملتا ہو، تو کیا جاحظ کی کتابوں میں یہ قول پایا جاتا ہے ؟ اس کی کتابیں تو مشہور عالم ہیں انھیں دیکھ لو، یا اس کے احباب و اصحاب میں سے کوئی روایت کرتا ہو، یہ بھی نہیں کسی آدمی کی وفات کے بعد یہی دو صورتیں ہیں جن سے صداقت معلوم ہو سکتی ہے، اور جب ان سے پتہ نہیں چلتا تو ظاہر ہے ، یہ بالکل کذب ہے بہتان ہے۔

اس کی کتابیں "نظم القرآن"، "اثبات النبوۃ" وغیرہ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسے اسلام سے کتنی محبت تھی، اور خدائے تعالیٰ اس کے اس عمل خیر کو ضائع نہیں فرمائے گا۔

ابن راوندی ہمیشہ معتزلہ کو تشنیع وطعن سے بدنام کیا کرتے تھے ، انھوں نے جاحظ پر ایک الزام یہ بھی لگایا تھا کہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض تھا، نعوذ باللہ من ذالک۔

خیاط نے اس کی بھی تردید کی ہے کہ ابن راوندی کا جاحظ پر بغض رسول اللہ کا الزام لگانا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دوست و دشمن میں تمیز نہیں کر سکتے ، اس لئے کہ جاحظ سے زیادہ کسی متکلم نے نظم قرآن اور احتجاج نبوت پر ایسی کتابیں نہیں لکھیں جو مائل و دل ہوں، اثبات رسالت اور تصحیح احادیث و اخبار میں اس کی کتابیں مشہور ہیں اور یہ ایسی چیز ہے کہ اس سے زیادہ موکد چیز حب رسول اور تصدیق نبی پر پیش نہیں کی جا سکتی۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ بڑے قوی دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ اس پر الزام لگایا جاتا ہے وہ سراسر بہتان ہے، وہ جاحظ ہی تھا، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کی تصحیح کی (جو غلط فہمی کی وجہ سے غلط سمجھا جاتا تھا) اور ثابت کر دیا کہ سب سے زیادہ اشرف و اطہر نسب حضور ہی کا تھا، کسی گذشتہ باب میں

یقین کر سکتا ہے کہ جاحظ ایسی گری ہوئی باتیں بھی کر سکتا ہے، حیرت ہے کہ شہرستانی نے
ابن راوندی سے ایسی بحیثیت بات روایت کیسے کر دی؟ اگرچہ ابوالحسن خیاط نے
اپنی کتاب "الانتصار" میں ان تمام مطاعن کی تردید کر دی ہے، جو ابن راوندی نے
معتزلہ پر عائد کئے تھے، بالخصوص جاحظ کی بہت صفائی دی ہے، جاحظ کے
نقائص و معائب جو مشہور کئے گئے تھے، ان کا ایک ایک کا چن چن کر جواب دیا
ہے جوابات حد درجہ دلائل و براہین سے مستحکم ہیں، لیکن اس قول کا اشارہ بھی
اس نے نہیں کیا ہے اسی طرح ابوالحسن اشعری نے اپنی کتاب "مقالات الاسلامیین"
میں وہ تمام روایات جمع کر دیے ہیں، عام اس سے کہ وہ اہمیت رکھتے ہوں یا
نہ رکھتے ہوں، لیکن اس قول کاذب کا انھوں نے ذکر بھی نہیں کیا ہے، اسی طرح
ابن حزم اور بغدادی سب کے سب جاحظ کے دشمن ہیں لیکن ان میں سے کسی نے
بھی یہ قول نہیں نقل کیا ہے، اگر ان لوگوں میں سے کوئی شخص ایک بار بھی
کسے طور پر جاحظ سے اس لغزش کا صدور پا لیتا تو ساری دنیا اس کے طعن و
تشنیع اور تحقیر و اہانت سے بھر جاتی لہذا ثابت ہوا کہ یہ قول بالکل غلط ہے
کوئی عقل مند ایسی احمقانہ بات نہیں کہہ سکتا۔

ابن راوندی کا ایک اور افترا جاحظ پر یہ ہے کہ اس کا قول ہے کہ
ہے کہ اللہ تعالیٰ اجسام کو ان کے وجود کے بعد معدوم کر سکے، اس لیے
کہتے ہیں، کہ اگر وجود کے بعد کسی جسم کا معدوم کر دینا محال ہے تو عدم کے بعد
اس کا وجود بھی مستحیل ہے۔"

خیاط کہتا ہے، جاحظ غریب پر یہ بھی بہت بڑا کذب ہے، کسی آدمی کی طرف
جو قول منسوب ہو اس کی صداقت جانچنے کے دو ہی معیار ہیں ایک تو یہ
کے احباب و اصحاب اس کی روایت کرتے ہوں، دوسرا یہ کہ اس کی کتاب

وهي غلالة ان اخذه اليم شديد"

جاحظ:- خدا قاضی صاحب کو اعلیٰ مرتبہ دے، اس کی بہترین تاویل اس کی تلاوت ہے۔

ابن ابی داؤد:- آہنگر کو بلاؤ،

جاحظ:- خدا قاضی کو سربلند کرے، کس لئے؟ زنجیریں توڑنے کے لئے یا ان میں اضافہ کے لئے؟

قاضی:- تاکہ تجھ سے دور کر دی جائیں۔

پس آہنگر لایا گیا، اہل مجلس میں سے بعض نے اشارہ کیا کہ زنجیر اتارتے وقت ذرا دیر تک کام کرے، بس کیا تھا جاحظ نے ایک آفت برپا کر دی، اور ...نے لگا ایک مہینہ کا کام ایک دن میں کر، بلکہ ایک دن کا ایک گھنٹہ میں، بلکہ ... گھنٹہ کا ایک منٹ میں۔ کمبخت میری ٹانگ دکھتی ہے، مجھے باقی جسم اور حیثیہ ... نہیں ہے۔ اس پر قاضی صاحب اور دوسرے اہل مجلس ہنس پڑے، قاضی ...نے محمد بن منصور سے کہا میں اس کے ظرف پر تو اعتماد کرتا ہوں، لیکن اس ... پر نہیں پھر اپنے غلام سے کہا، اسے حمام میں لے جاؤ، پھر زنجیر وغیرہ ... اور وہ حمام میں داخل کیا گیا، پھر اچھے اچھے کپڑے پہنا کر مجلس میں ... قاضی صاحب نے کہا، ابو عثمان اب کیا کہتے ہو؟ جاحظ بڑی دیر تک ... اور سنی کی باتیں کرتا رہا۔

...ن و شعر سے دلچسپی

جاحظ کی خواہش تھی کہ فن عروض و شعر میں بھی وہ مرتبہ کمال پر پہنچے، لیکن طبیعت کو زیادہ مناسبت ... اس لئے وہ اپنی اس آرزو میں ناکام ہی رہا، پھر اس کی جولانگہ نثر ہی رہی ... اصمعی سے بھی اس نے شعر حاصل کرنا چاہا سوا غریب و نادر اشعار کے

جہاں ام نضر کے نسب سے بحث کی گئی ہے کہ اس سے حضور کا نسب ثابت ہوتا
کی تفصیل گزر چکی ہے۔

جاحظ اور ابن زیات و ابن داؤد

امرار دولت عباسیہ میں جاحظ
ممتاز مرتبہ کا مالک تھا، وہ
سب اس کے فضل و کمال کا اعتراف کرتے تھے اسے پسند کرتے تھے
درجہ کو بلند سمجھتے تھے، ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ جاحظ اس کی پارٹی میں شریک
اس نے بجائے ابوداؤد کے جو قاضی تھے، ابن زیات کو جو وزیر تھے ترجیح
اور انہی کے ساتھ ہو گیا نتیجہ یہ ہوا کہ حیلہ جوؤں اور چغلخوروں کی گرم بازاری
وزیر اور قاضی دونوں ہی متاثر کیے جانے لگے، ابن زیات کے
گئے کہ اس نے جاحظ کی گرفتاری کا حکم دے دیا، جاحظ بھاگ کھڑا
سے پوچھا گیا، تم بھاگے کیوں؟ اس نے کہا بھائی میں ڈرا کہ تنور میں
جاؤں کہ ابن زیات نے ایک تنور بنوایا تھا، جس سے خفا ہوتا تھا
ڈلوا دیتا تھا، جب تک وہ مر نہیں جاتا تھا، تنور سے گلو خلاصی ممکن نہیں
وہ پکڑے گئے اور قاضی ابوداؤد کے حضور میں پیش کیے گئے، اس حال
گردن زنجیر سے بندھی ہوئی تھی، پیر بھی جکڑے ہوئے تھے، اور
پرانی قمیص زیب بر تھی۔ قاضی کی جب اس پر نظر پڑی تو انھوں نے کہا
تو بڑا فراموش کنندۂ نعمت ہے، لیکن شکوہ ہے کہ زمانے نے تجھے زیادہ

جاحظ:۔ اگر آپ مجھے بخشش دیں تو انتقام سے یہ کہیں اچھا ہوگا۔

ابن ابی داؤد:۔ خدا تجھے غارت کرے، کمبخت، خدا کی قسم تو
ہے، تیرا اس آیت کی تاویل کیا کرتا ہے، وکذٰلک اخذ ربک

لہ یا ابن دواد (۲) مترجم

کتابوں کی تعداد اور ان کا مختصر تعارف

مسعودی کا قول ہے کہ جاحظ کی کتابوں سے ذہن میں جلا پیدا ہوتی ہے اس کی کتابیں ہر اعتبار سے بے نظیر و لاجواب ہیں، جب اسے شبہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس سنجیدہ مضمون کو پڑھتے پڑھتے اکتا گیا ہوگا، تو وہ سنجیدگی سے ظرافت کا روپ بدل دیتا ہے، اور ایسی پر مذاق باتیں کرتا ہے کہ آدمی کا سارا تکدر رفع ہو جاتا ہے، اس کی تمام کتابیں اسی خصوصیت سے مخصوص ہیں جماعت معتزلہ میں سلف و خلف کسی میں بھی ایسا فرد فرید نہیں پایا جاتا۔

میں نے اس کی کتابوں کی استقصا میں اس کی کتاب "الحیوان" پر اعتماد کیا ہے یاقوت نے اپنی "معجم الادبا" میں جو ذکر کیا ہے اس سے بھی میں نے خوشہ چینی کی ہے اس کے علاوہ دوسری کتب و اسفار بھی پیش نظر رہی ہیں، میں نے اس کی بھی کوشش کی ہے کہ بعض نساخوں نے جاحظ کی کتابوں کے جو مختلف عنوانات دے کر لوگوں کو اس تکرار کی وجہ سے مغالطہ میں ڈال دیا ہے، اسے بھی رفع کردوں، میں نے چاہا ہے کہ فہرست بہت صحیح ثابت ہو، ترتیب میں حروف ہجا کا لحاظ رکھا ہے ملاحظہ ہو،

۱۔ کتاب آل ابراہیم بن المدبر :۔ فن مکاتبت میں ہے،

۲۔ کتاب آی القرآن :۔ جاحظ کہتا ہے اس کتاب میں میں نے وہ تمام آیات قرآنی جمع کردی ہیں جن سے ایجاز و حذف اور زوائد و فضول و استعارات کا فرق معلوم ہوگے،

۳۔ رسالہ فی اثم السکر :۔ بدمستی کے گناہ کے بیان میں۔

۴۔ رسالہ الی ابی النجم و جوابہ :۔ مراسلت و بحث و مناظرہ،

۵۔ کتاب احالۃ القدر علی الظلم۔

اسے اور کچھ نہیں آتا تھا، پھر میں اخفش کے پاس پہنچا اسے سوا اعراب کے اور کچھ نہ معلوم تھا، پھر میں نے ابو عبیدہ کا رخ کیا، وہ اخبار، انساب، اور [illegible] کے علاوہ ہر چیز میں کورے تھے، جو کچھ میں چاہتا تھا، اس میں سوا انشا پردازوں کے اور کسی سے اپنا مطلب نہ حاصل کر سکا۔

جس زمانہ میں اس کو اس فن کے حاصل کرنے کا جنون سوار تھا، وہ کہا کرتا عروض شعر کے لیے میزان و معیار رکھتا ہے، صحیح و سقیم اور خوب و زشت اسی سے معلوم ہو سکتا ہے،

لیکن جب اپنی اس تمنا میں ناکام رہا اور کامیابی کی کوئی صورت بظاہر نظر نہ تو کتنی دلچسپ بات کہی، کہتا ہے:۔

"عروض ایک مردود علم ہے، ایک مجہول کلام ہے، عقول پر بار ڈالتا ہے، مستفعل اور مفعول کے سوا اس میں رکھا کیا ہے اس سے نہ حاصل نہ محصول"

شعر کے متعلق اس کی رائے کتنی نپی تلی ہے، کہتا ہے:۔

"شعر کی فضیلت تو بس عرب ہی کے لیے ہے اور وہی کہہ سکتا ہے جو عربی جانتا ہو، شعر کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے کسی دوسری زبان میں نقل کیا جا سکتا ہے، اور اگر ایسا کیا بھی جائے تو اس میں پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے اس کی پسندیدگی رخصت ہو جاتی ہے، اور وہ نثر کی طرح ہو کے رہ جاتا ہے، ہندوستان کی کتابوں کا ترجمہ ہوا یونان کی حکمتیں عربی میں منتقل کی گئیں، فارسی زبان کا ادب بھی لیا گیا اس ترجمہ کے بعد بعض کے حسن میں تو اضافہ ہوا اور بعض و ناقص، الخ"

کی تصحیح کی ہے۔

۲۰۔ کتاب اصول الفتیا و الاحکام۔

۲۲۔ الاعتزال و فضلہ:۔ شاید یہ وہی کتاب ہے جو جاحظ نے "فضیلۃ المعتزلہ" کے نام سے ابن راوندی کی "فضیحۃ المعتزلہ" کے جواب میں لکھی تھی۔

۲۳۔ کتاب افتخار الشتا و الصیف:۔ (جاڑے اور گرمی کی اچھائیاں اور برائیاں)

۲۴۔ " افعال الطبائع

۲۵۔ " تمام فضول الصناعات و مراتب التجارات۔

۲۶۔ " الامامۃ علیٰ مذہب الشیعہ:۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی رسالہ ہو جو اس نے "بیان مذہب الشیعہ" کے نام سے لکھا تھا۔

۲۷۔ کتاب امامت معاویہ بن ابی سفیان:۔ اس میں رجال مروانیہ کا ذکر ہے اور بنی امیہ کی تائید ہے۔

۲۸۔ کتاب امامت ولد العباس:۔ اس میں وہ مذہب پر دلیلیں لایا ہے اور قصۂ فدک کا بھی ذکر کیا ہے، حضرت فاطمہ اور حضرت ابوبکر کی گفتگو بھی نقل کی ہے، یہ اور اس کے علاوہ اور بہت سی چیزیں جو اس موضوع سے تعلق رکھتی ہیں بیان کی ہیں۔

۲۹۔ رسالہ فی امتحان عقول الاولیاء:۔

۳۰۔ کتاب الامثال

۳۱۔ " الامصار:۔ شاید یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر مسعودی نے "البلدان" کے نام سے کیا ہے، ہم نے احتمال مغائرت کے سبب یہاں ذکر کر دیا۔

۳۲۔ رسالہ فی الامل و المامول

۳۳۔ کتاب امہات الاولاد۔

۶۔ کتاب الاحتجاج لنظم القرآن۔

۷۔ " احدوثۃ العالم

۸۔ " الاخبار :۔ دو کتابیں اور ذکر کی جاتی ہیں، ایک نو" کتاب الاخبار و کیف تصح" اور دوسری " تصحیح الاخبار" غالباً ایک ہی کتاب ہے لیکن نام بدل دیئے گئے ہیں۔

۹۔ کتاب الاخطار والمراتب والصناعات،

۱۰۔ اخلاق الشطار

۱۱۔ اخلاق الفتیان وفضائل اہل البطالۃ :۔ کتاب التاج میں ہے کہ یہ کتاب جاحظ کی طرف غلط طور سے منسوب کر دی گئی ہے،

۱۲۔ کتاب اخلاق الملوک (ملوک و سلاطین کے کردار پر گفتگو)

۱۳۔ " الاخوان (ابنائے زمانہ واخوان کے طبائع پر گفتگو)

۱۴۔ الاستبداد والمشاورۃ فی الحرب

۱۵۔ الاستطاعۃ وخلق الافعال :۔ یہ کتاب ان کتابوں میں ہے جن میں جاحظ نے مذہب اعتزال کو ثابت کیا ہے۔

۱۶۔ کتاب استطالۃ الفہم :۔ قاضی شہاب الدین خفاجی نے اپنی کتاب طراز المجالس میں لکھا ہے، کہ جاحظ نے اس میں حکما و شعرا کا ذکر کیا ہے۔

۱۷۔ رسالۃ فی استنجاز الوعد

۱۸۔ کتاب الاسد والذئب

۱۹۔ " اصحاب الالہام

۲۰۔ " الاصنام :۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں جاحظ نے جاہلیت عرب کے اصنام کا تذکرہ کیا ہے، اور اسی میں نضر بن کنانہ جد نبی صلی اللہ علیہ

میرے اہتمام میں مصر سے شائع ہوئی۔

۴۰۔ رسالہ فی بیان مذاہب الشیعہ:۔ دیکھو نمبر ۲۶

۴۱۔ کتاب تمییز الاموال۔

۴۲۔ " الربیع والقدویہ:۔ یہ بھی نہایت عجیب وغریب کتاب ہے اپنے ایک کرمفرما احمد بن عبدالوہاب کی بدصورتی کا جواب دیا ہے اور ثابت کیا ہے، وہ نہایت حسین وجمیل تھے، اسی طرح کے اور بھی بہت سے خرافات واساطیر ہیں لیکن عبارت کی شگفتگی اور معانی ومفاہیم کی وقت نظر بہت زیادہ داد طلب ہے ۱۹۰۳ء میں بمقام لندن رسالہ "مناقب الترک" و رسالہ "فخرالسودان علی البیضان" کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔

۴۳۔ کتاب تصویب علیؑ فی تحکیم الحاکمین:۔ یہ کتاب اب ناپید ہے، صرف ایک ٹکڑا ہمارے ہاتھ لگا ہے، جس میں حضرت علی کے قبول تحکیم کا ذکر ہے،

۴۴۔ کتاب المفاح

۴۵۔ " تفضیل صناعۃ الکلام ۔ مسعودی کہتا ہے کہ "ہاشمیہ" کے نام سے بھی یہ رسالہ مشہور ہے۔

۴۶۔ رسالہ فی تفضیل النطق علی الصمت:۔ ۱۳۲۴ھ میں بمقام مصر طبع ہوچکا ہے۔

۴۷۔ کتاب التفکر والاعتبار۔

۴۸۔ " التفتیش

۴۹۔ " جمہرۃ الملوک

۵۰۔ " الجوابات

۵۱۔ " جوابات کتاب المعرفہ

۵۲۔ " الجواری

۳۴- کتاب الانس والسلوۃ۔

۳۵- " الاوفاق والریاضیات

۳۶- " النخلاء- جاحظ کی نہایت بدیع کتابوں میں سے ایک ہے اور
لائق ہے کہ تدبیر منزل کے اصول اس سے استخراج کیے جائیں
اشیاء سے کس طرح نفع اٹھایا جائے یہ اور بہت سی قابل ذکر باتیں
میں موجود ہیں، ۱۳۲۲ھ بمقام مصر طبع ہو چکی ہے۔

۳۷- کتاب اجبیرۃ غنام الرشد۔

۳۸- کتاب البلدان:- جیسا کہ گزر چکا ہے کیا عجب کہ "کتاب الامصار"
ہم نے احتمال مغائرت کے سبب یہاں بھی لکھ دیا۔

۳۹- کتاب البیان والتبیین:- جاحظ نے یہ بے نظیر کتاب لکھی اور قاضی
داؤد کے حضور میں پیش کی جس کا صلہ پانچ ہزار دینار کی صورت میں
متقدمین میں سے اکابر علما اور اعاظم ادبا کا اس پر اتفاق ہے کہ
میں سب سے بہتر کتاب ہے مسعودی کا قول ہے کہ جاحظ کی بہت
کتابیں ہیں، لیکن "البیان والتبیین" سب میں فائق ہے اس لئے کہ
نظم، منتخب وچیدہ اشعار، بلیغ سے بلیغ خطبے بہتر خوبی کے ساتھ
ابن خلدون کا قول ہے کہ مکتب درس میں ہم نے اپنے اساتذہ
ہے کہ فن ادب کے اصول و ارکان بس چار چیزیں ہیں سب سے
رکھتی ہیں، ایک تو "کامل للمبرد" دوسری "کتاب البیان والتبیین"
"کتاب النوادر لابی علی القالی" چوتھے "ادب الکاتب لابن قتیبہ"
سے علاوہ جو کچھ ہے اس کو انھیں کا "فروع" کہنا چاہیے،
نے ۱۳۰۱ھ میں بمقام قسطنطنیہ اسے شائع کیا، پھر

یہ کتاب الحیوان" تیار کر دی، لیکن یہ دروغ محض ہے، عبداللطیف البغدادی کی تلمیض "اختصار کتاب الحیوان" کے نام سے موجود ہے، اور خود کتاب الحیوان بھی ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء میں بہ مقام مصر، جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اس سے تو جاحظ کے مفاخر و محاسن کا پایہ بلند ہی ثابت ہوتا ہے۔

۶۴۔ رسالۃ فی الخراج
۶۵۔ کتاب خصومۃ الطول والعور
۶۶۔ " خلق القرآن
۶۷۔ " الدلالۃ علی ان الامامۃ فرض
۶۸۔ " ذکر ما بین الزیدیۃ والرافضۃ
۶۹۔ رسالۃ فی ذم اخلاق الکتاب، مطبع سلفیہ نے ۱۳۴۴ھ میں اسے شائع کیا ہے۔
۷۰۔ کتاب ذم الزنا
۷۱۔ " فی ذم النبذ
۷۲۔ رسالہ فی ذم الوراقۃ
۷۳۔ " فی الرد علی الجہمیہ
۷۴۔ " فی الرد علی الخولیہ
۷۵۔ کتاب الرد علی النصاری ۱۳۴۲ھ میں مطبع سلفیہ اسے شائع کر چکا ہے۔
۷۶۔ " المسائل الہاشمیات
۷۷۔ " الرد علی من الحد فی کتاب اللہ۔
۷۸۔ " الرد علی من زعم ان الانسان جزء لا یتجزی۔
۷۹۔ " الرد علی العثمانیہ

۵۳۔ رسالۃ الحاسد والمحسود :۔ ۱۳۲۴ھ میں بمقام مصر طبع ہو چکا ہے۔

۵۴۔ کتاب حانوت عطار

۵۵۔ " الحجات :۔ قاضی شہاب الدین خفاجی نے اپنی کتاب "طراز المجالس" میں
اس کا ذکر کیا ہے۔

۵۶۔ کتاب الحجۃ فی تثبیت النبوۃ

۵۷۔ " الجبر والنبوۃ

۵۸ " الحزم والعزم

۵۹۔ " حکایۃ قول اصناف الزیدیہ

۶۰۔ رسالۃ المحلیہ

۶۱۔ کتاب حیل اللصوص :۔ ابومنصور بغدادی نے اپنی کتاب الفرق بین الفرق
میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جاحظ نے اپنی اس مہمل کتاب کے ذ
سے چوری کی تعلیم دی ہے، ظاہر ہے یہ اس کے ایک دشمن کا ال
ہے، اگر کتاب ہمارے پاس موجود ہوتی، تو صدق و کذب کا پ
چلانا آسان تھا۔

۶۲۔ کتاب حیل المکدین :۔ ابومنصور بغدادی نے اپنی کتاب میں اس کا
کیا ہے۔

۶۳۔ کتاب الحیوان :۔ جاحظ نے یہ کتاب محمد بن عبداللہ الزیات کو نذر بھی اور
اس پر پانچ ہزار دینار مرحمت فرمائے جاحظ کی نہایت بہترین کتابوں میں
ہے، ابومنصور بغدادی جن کو جاحظ پر تہمت تراشیوں اور معتزلہ کی
جو یوں میں کمال حاصل ہے، یہاں بھی باز نہیں آئے ہیں اور کہا
یہ بھی "خوشہ چینیوں" کا نتیجہ ہے، کچھ ارسطو سے لے لیا، کچھ

۹۵۔ کتاب العرجان والبرصان

۹۶۔ رسالہ فی العشق والنساء ۱۳۲۴ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

۹۷۔ رسالہ فی العقو والصفح

۹۸۔ کتاب عناصر الآداب

۹۹۔ غش الصناعات، ابو منصور بغدادی کا خیال ہے کہ جاحظ نے اس کتاب سے تاجروں کی تجارت کو بہت نقصان پہنچایا،

۱۰۰۔ رسالہ فی فخر السودان علی البیضان ۱۳۲۴ھ میں شائع ہو چکا ہے،

۱۰۱۔ کتاب فخر عبد شمس مخزوم

۱۰۲۔ فخر ہاشم و عبد شمس، میرے پاس یہ کتاب موجود ہے، عنقریب میں اسے شائع کرنے والا ہوں۔

۱۰۳۔ رسالہ فی فرط جہل الکندی[1]

۱۰۴۔ کتاب فرق، بین الجن والانس

۱۰۵۔ بین الملائکۃ والجن

۱۰۶۔ ما بین العبتی والمتبنی

۱۰۷۔ رسالہ فی فضل اتخاذ الکتب

۱۰۸۔ کتاب فضل ما بین الرجال والنساء

---

[1] ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی، اسلام کا مشہور فیلسوف سلسلۂ نسب ملوک کندہ تک پہنچتا ہے وہ پہلا شخص ہے جس نے مسلمانوں میں علوم فلسفہ میں بہت شہرت حاصل کی، حدوث عالم کے بارے میں مذہباً افلاطون کا پیرو تھا، مختلف علوم و فنون میں اس کی تصانیف موجود ہیں، اپنی وسعت علم کے باوجود بخیل حد درجہ کا تھا، اور جاحظ کے نزدیک بخیلوں کا امام تھا، ۲۶۰ھ میں وفات پائی۔

۸۰ - کتاب الرد علی المسیحیہ

۸۱ - " الرد علی الیہود

۸۲ - " الزرع والنخل والزیتون والاعناب - جاحظ نے یہ کتاب ابراہیم بن عباس الصولی کو (جو میر منشی تھا) بھیجی اس نے پانچ ہزار دینار عنایت کیے -

۸۳ - کتاب السلطان واخلاق اہلہ

۸۴ - رسالۃ الشارب والمشروب

۸۵ - کتاب الفرجاء والبجناء

۸۶ - " لصناعۃ الکلام - شاید یہ وہی کتاب ہو جس کا ذکر "تفضیل صناعۃ [illegible] کے سلسلہ میں ہو چکا ہے،

۸۷ - کتاب الصوالحۃ

۸۸ - رسالہ فی طبقات المغنیین جس کا ایک ٹکڑا ۱۳۲۴ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے،

۸۹ - کتاب الطفیلیین

۹۰ - " العالم والجاہل

۹۱ - " العباسیہ" شاید یہ کتاب وہی ہے جس کا ذکر "امامۃ ولد [illegible] کے سلسلہ میں ہو چکا ہے،

۹۲ - کتاب العثمانیہ: میرے پاس یہ کتاب اور اس کا نقض ونقض النقض موجود ہے عنقریب میں دونوں کو شائع کرنے والا ہوں"

۹۳ - کتاب العرب والعجم

۹۴ - " العرب والموالی

۱۲۴۔ کتاب المخاطبات فی التوحید،

۱۲۵۔ رسالہ فی مدح التجار و ذم عمل السلطان ۱۳۲۴ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے۔

۱۲۶۔ رسالہ فی مدح الکتاب[1]۔

۱۲۷۔ رسالہ فی مدح النبیذ } ،

۱۲۸۔ " فی مدح الوراقۃ }

۱۲۹۔ کتاب المزاح والجد

۱۳۰۔ " المسائل

۱۳۱۔ " مسائل العثمانیہ

۱۳۲۔ " " کتاب المعرفۃ

۱۳۳۔ " القرآن

۱۳۴۔ " المضاحک۔ ابومنصور نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۱۳۵۔ " المعاد و المعاش۔

۱۳۶۔ " المعادن

۱۳۷۔ " معارضۃ الزیدیہ

۱۳۸۔ " الموافقۃ

۱۳۹۔ " المعلمین

۱۴۰۔ " المغنیین والغناء والصنعۃ

۱۴۱۔ " مفاخرۃ السودان والحمران

۱۴۲۔ " رسالہ فی مفاخرۃ المسک والرماد۔ صلاح الصفدی کا قول ہے کہ یہ نہایت بدیع رسالہ ہے۔

---

[1] [illegible] سوداگروں کے ذم میں بھی ایک ایک رسالہ جاحظ کے قلم سے نکل چکا ہے (مترجم)

۱۰۹ ۔ کتاب فضل العلم

۱۱۰ - ،، فضل الفرس علی الهلاج

۱۱۱ - ،، فضیلۃ المعتزلہ" ابو الحسین خیاط نے اپنی کتاب "الانتصار" میں اس
کا ذکر کیا ہے،
کیا عجب یہ وہی کتاب ہو جس کا ذکر الاعتزال و فضلہ کے نام سے ہو چکا ہے
ابن راوندی نے اس کا رد "فضیحۃ المعتزلہ" کے نام سے لکھا تھا،

۱۱۲ - کتاب فضیلۃ الکلام، یہ ان کتابوں میں ہے جو کئی ناموں سے مشہور ہے

۱۱۳ - کتاب القحاب:۔ ابو منصور بغدادی نے اپنی کتاب "الفرق بین الفرق"
میں ذکر کیا ہے ۔

۱۱۴ - کتاب القحطانیہ والعدنانیہ ۔

۱۱۵ - ،، القضاۃ والولاۃ

۱۱۶ - رسالۃ فی القلم

۱۱۷ - کتاب القواد ۔ قاضی شہاب الدین خفاجی نے اپنی کتاب طراز المجلس میں
کتاب کا ذکر "القواد و اسباب الصناعات" کے نام سے کیا ہے
کہ یہ وہی ہو،

۱۱۸ - رسالۃ فی القیان سنہ ۱۳۴۴ھ میں مطبع سلفیہ اسے شائع کر چکا ہے

۱۱۹ - کتاب الکبر المتحن والمستقبح

۱۲۰ - رسالہ فی کتمان السر

۱۲۱ - ،، فی الکرم

۱۲۲ - کتاب الکلاب، ابو منصور نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے

۱۲۳ - رسالۃ فی الکیمیاء

۱۵۸۔ کتاب الوکلاء

۱۵۹۔ رسالۃ الیتیمیہ

دوسروں کی کتابیں جاحظ کے نام سے

۱۔ کتاب البابل۔ یاقوت کا قول ہے کہ یہ کتاب بہت زمانہ سے جاحظ کے نام سے منسوب چلی آرہی ہے۔

۲۔ کتاب التاج یا اخلاق الملوک، احمد ذکی پاشا نے سنہ ۱۳۲۲ھ (۱۹۱۲ء) میں ایک طویل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب جاحظ کی ہی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جاحظ اس سے بری ہے اس کے قلم سے یہ کتاب ہرگز نہیں نکلی، (اس کے بعد مؤلف کتاب حسن السندوبی صاحب نے دونوں کتابوں کے مقدمے لکھے ہیں، اور ہر دو کتابوں کے اسلوب بیان اور طرز ادا کا تخالف اور تبائن امثال سے ثابت کیا ہے کہ جاحظ کا رنگ اس کتاب سے بالکل ظاہر نہیں ہوتا، مثالیں چونکہ عربی کی ہیں۔ اس لئے ان کا ترجمہ یہاں بیکار نظر آیا۔ بہر حال ثابت انھوں نے بھی کیا ہے کہ یہ کتاب جاحظ کی نہیں ہے، اس طویل موازنہ کے بعد فاضل مؤلف فرماتے ہیں، کون ایسا شخص ہوگا، جسے عقل سلیم یا وجدان صحیح سے ذرا بھی مناسبت ہو، وہ اسے باور کرے گا، کہ یہ کتاب جاحظ کی ہے؟ ان دونوں کا فرق اسلوب بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح صدق و کذب، نور و ظلمت اور حق و باطل کا فرق محتاج بیان نہیں ہوا کرتا، بہر حال یہ واقعہ ہے کہ یہ کتاب جاحظ کی نہیں اور جو شخص اس پر اصرار کرے، وہ جاحظ کو درجۂ رفیع سے گرانا چاہتا ہے یا وہ جاحظ کا قدر شناس نہیں ہے، ہماری مستقل رائے

۱۴۳ - کتاب الملح والطرف

۱۴۴ - " الملوک والامم السالفۃ والباقیہ

۱۴۵ - رسالہ فی مناقب الترک و عامۃ جند الخلافۃ۔ جاحظ نے یہ رسالہ فتح
خاقان وزیر اعظم المتوکل باللہ کے حضور میں گزارا تھا، لندن سے
میں شائع ہو چکا ہے، پھر ابراہیم بک مویلحی نے اپنے اخبار مصباح
میں اسے شائع کیا، ۱۳۲۴ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے۔

۱۴۶ - رسالۃ فی من لیسمی من الشعراء عمراً۔

۱۴۷ - " فی موت ابی حرب الصفار البصری۔

۱۴۸ - رسالہ فی المیراث

۱۴۹ - کتاب النانشی والمتلاشی۔

۱۵۰ - کتاب النرد والشطرنج

۱۵۱ - " النصرانی والیہودی

۱۵۲ - " النغل

۱۵۲ - " نقض الطب:۔ ابوبکر رازی نے اس کے رد میں ایک پورا
لکھا ہے، اسی طرح ابن ہندویہ نے بھی ایک مستقل رسالہ اس کے
میں لکھا۔

۱۵۴ - کتاب نوادر الحسن

۱۵۵ - " النوامیس۔ ابو منصور اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ حیلہ گر
حلب زر کا ایک عمدہ راہنما ہے۔

۱۵۶ - کتاب وجوب الامامۃ

۱۵۷ - " الوعد والوعید، ۱۳۲۴ھ میں مصر سے شائع ہوئی۔

"قوام الملک" اور "نظام الدین" وغیرہ القاب سے یاد کیا گیا، اور "قوام الملک" "نظام الدین" "حجۃ الاسلام" "نور الملک" "جمال السلطنۃ" اور "بہاء الدولہ" وغیرہ جیسے القاب وخطابات عہد سلاجقہ کی پیداوار ہیں، اس کے علاوہ بہت سے ایسے شعرا اور انشا پردازوں کا ذکر ہے، جو چوتھی صدی ہجری کے تھے، پھر جاحظ نے ان چیزوں کو کہاں اور کیسے پایا؟ لہٰذا ثابت ہوا، کہ یہ کتاب جاحظ کی نہیں ہے۔

۲۔ کتاب المحاسن والاضداد۔ اس کے متعلق تو بہت سے لوگ فریب میں مبتلا ہیں، اور غلطی سے جاحظ ہی کی کتاب سمجھ رہے ہیں، قدما میں شیخ محی الدین عربی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جاحظ بیچارہ اس الزام سے "قطعاً" بری ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ چوتھی صدی کے وراقین میں سے کسی نے یہ کتاب تیار کی ہوگی اور دیکھا ہوگا کہ یوں تو اس کی اشاعت ہوتی نہیں، جاحظ ہی کی طرف منسوب کردوں، اس طرح یہ جاحظ کے نام سے مشہور ہوگئی۔

سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ میں یوں ہی اس کتاب کے ورق الٹ پلٹ رہا تھا کہ میری نظر صفحہ ۳۸ پر پڑی، تو اس میں بھی ابن المعتز کے چند شعر دکھائی دیے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جاحظ ابن المعتز کے اشعار کیسے روایت کر رہا ہے، حالانکہ ابن المعتز ابھی سات برس کا نہ ہوا تھا، کہ جاحظ کی وفات ہو چکی تھی، شعبان ۲۴۹ھ میں ابن معتز کی ولادت ہوئی اور محرم ۲۵۵ھ میں جاحظ کی وفات تو اب عرفاً، عقلاً، عادتاً کسی طرح بھی یہ ممکن ہے کہ ایک سات برس کا بچہ اتنا بڑا شاعر بے بدل ہو جائے کہ جاحظ جیسا شخص اس سے روایت کرے، ہاں صفحہ ۱۴۴ پر ایک شعر بن قرامطہ ہوشیدہ کو معنو پر۔

تو یہ ہی ہے کہ پانچویں صدی ہجری کے کسی آدمی نے کسی کتاب پر
نام دیکھ لیا اور جھٹ ایک مصنوعی مقدمہ تیار کر کے شایع بھی کر دیا
اس طرف متوجہ ہو جائیں (سندوبی صاحب مؤلف کتاب نے جس
اور جوش خطابت سے اس دعوی کو پیش فرمایا ہے کم از کم اس طرح
کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا، واللہ اعلم بالصواب / (مترجم)

۳ - کتاب تنبیہ الملوک والمکائد - یہ کتاب بھی جہل و حماقت سے اس کی
منسوب کر دی گئی ہے۔

۴ - کتاب الحنین الی الاوطان، جس شخص کو جاحظ کے طرز سے ذرا بھی
وہ بلا تامل سمجھ سکتا ہے کہ وراقوں نے ادھر اُدھر کے چند اوراق
اس کے نام سے مشہور کر دیتے ہیں تاکہ رواج عام حاصل ہو جائے
تعجب ہے کہ شیخ طاہر جزائری رحمۃ اللہ نے بھی دھوکا کھایا،
جاحظ ہی کی سمجھتے رہے، حالانکہ یہ بالکل کذب و افتراء ہے، مطبع
نے ۱۳۳۳ھ میں شایع کی ہے۔

۵ - کتاب الدلائل والاعتبار علی الخلق والآثار - یہ کتاب بھی جاحظ کے
غلط طور پر منسوب ہے۔

۶ - کتاب سلوۃ الحریف بمناظرۃ الربیع والخریف، مطبع جوائب نے
ایک ممتاز مطبع تھا، اسے شایع کیا تھا، استنبول کے کسی کتب
اس پر نظر پڑی بغیر یہ تحقیق کئے کہ اس نسخہ کا کاتب کون ہے؟
صحیح بھی ہے یا نہیں؟ صرف یہ دیکھ کر کہ اس میں جاحظ کا نام ہے
گئی، میرا یہ دعوی ہے کہ جاحظ کی کتاب نہیں ہے اور نہ اس کی زندگی
نام سے یہ پہچانی گئی، مثلاً مقدمہ کے بعد دیباچہ میں

پھر وہ خاموش ہوگئی، اب کے حکم پاکر طنبوریہ نے گانا شروع کیا۔

وارحمنا للعاشقینا   ماان اری لھم معینا

کم یھجرون دیصرمون   ویقطعون فیصبرونا

گود بجانے والی نے پوچھا، پھر عاشق کرتے کیا ہیں، اس نے جواب دیا یہ کرتے ہیں، یہ کہہ کے اس نے ستار پھینک دیا (اس وقت معلوم ہوتا تھا، وہ چودھویں رات کا چاند ہے، اور فوراً اپنے تئیں سپرد دریا کردیا، محمد کے پاس ایک غلام ہاتھ میں مورچھل لئے کھڑا تھا، وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر مبہوت ہو رہا تھا، وہ بھی اس جگہ پر آیا، دیکھا وہ پانی میں ہچکولے کھا رہی ہے اس لئے یہ شعر پڑھا،

انت التی غرقتنی   بعد القضا لو تعلمینا

یہ کہہ کے خود بھی دریا میں پھاند پڑا، دونوں ایک دوسرے سے چمٹ گئے پھر ایسے ڈوبے کہ ابھر نہ سکے، محمد نے جو یہ اندوہناک منظر دیکھا تو بہت موثر ہوا اس نے کہا جاحظ کوئی ایسی بات کر جو میری تسکین و تسلی کا سبب ہو، ورنہ تجھے بھی ان دونوں کے پاس پہنچا دیتا ہوں،

مجھے ایک واقعہ یاد آگیا، کہ یزید بن عبدالملک عدالت میں بیٹھا ہوا عرضیاں دیکھ دیکھ کر فیصلے لکھ رہا تھا، ایک درخواست کا مضمون یہ تھا کہ امیرالمومنین اپنی فلاں لونڈی کو حکم دیں کہ وہ مجھے تین مختلف راگ سنا دے، اور بس یزید بہت برہم ہوا، اسی وقت اس نے حکم دیا، جس نے یہ عرضی دی ہو اس کا سر اور وہ حکم کی تعمیل ہونے ہی والی تھی کہ ایک دوسرا قاصد پہنچا، کہ امیرالمومنین اس مغضوب بارگاہ کو یاد فرما رہے ہیں، وہ آدمی اس کے سامنے کھڑا کیا گیا، امیرالمومنین نے دریافت فرمایا، ایسی گستاخی کی جراءت تجھے کیسے ہوئی؟ اس

اور حجاج کی جنگ سے تلمیح کی گئی ہے، حالانکہ یہ واقعۂ جنگ جاحظ کی وفات سے پورے چالیس برس بعد پیش آیا، لہٰذا یہ کتاب قطعاً جاحظ پر افترا ہے، اور ابو عثمان اس سے قطعاً ناواقف ہے۔

۸۔ کتاب الہدایا، یاقوت کا قول ہے کہ ایک زمانۂ دراز سے یہ کتاب جاحظ سے منسوب چلی آرہی ہے۔

نوادراتِ جاحظ

جاحظ اپنی جلالتِ شان اور عظمتِ عام کے باوجود بالکل ایک خشک سا انشا پرداز نہیں تھا، بلکہ وہ ایک زندہ دل، شوخ طبع اور دلچسپ و دل آویز خصائل کا مالک تھا، اس کے ان متانتِ بیان، قوتِ زبان اور دوسرے خصائل علمی کے ساتھ لطائف و ظرائف، نوادرات و ظرائف اور طنز و لطیفے کے بہت سے نمونے ملتے ہیں چند درج ذیل ہیں:

(۱)

محمد بن ابراہیم بغداد جا رہے تھے، میں ان کا ہم رکاب ہو گیا، ہم ایک بجرے میں سوار ہوئے اور اس نے مغنیہ کو گانے کا حکم دے دیا، اس نے ستار سنبھالا اور گانا شروع کر دیا۔

کل یوم قطیعه عتاب ... ینقضی دهرنا و نحن غضاب

لیت شعری انا خصصت لهذا ... دون ذا الخلق ام کذا الناس

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ایک طرح اس کتاب کے حصہ کو الحاقی یا مصنوعی کہنا ممکن ہے، لیکن پوری کتاب کا انکار کر دینا بہت بڑی جرأت ہے۔ (مترجم)

"خدا آپ کو صحت عطا فرمائے، آپ کی نعمتیں اسی طرح برقرار رہیں۔"

ابن زیات:۔ اچھا تو بتاؤ، تم نذر کرنے کو کیا لائے ہو؟

جاحظ:۔ میں نے سوچا کہ آپ کی خدمت میں کچھ ہدیہ پیش کروں لیکن غور کرتا ہوں تو ہر چیز خدا نے آپ کو دے رکھی ہے، میرے پاس ایک نہایت بلند مرتبہ چیز کتاب سیبویہ ہے، کسائی نے اسے لکھا ہے اور فرائی کی میراث سے میں نے خریدا ہے۔

ابن زیات۔ خدا کی قسم اس سے زیادہ پسندیدہ ہدیہ تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

(۴۲)

جاحظ کہتا ہے مجکو عمر بھر میں کسی سے شرمندگی نہیں اٹھانا پڑی، ہاں دو شخصوں نے البتہ مجھے بہت خجل کیا، جن میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے دروازہ پر ٹہل رہا تھا، کہ ایک عورت میرے پاس آئی اور کہنے لگی، مجھے ایک بڑی سخت ضرورت در پیش ہے، ذرا تھوڑی دور تک میرے ساتھ چلیے، میں اس کے ساتھ ہو لیا وہ ایک یہودی سنار کی دوکان پر جاکر کھڑی ہو گئی، اور اس سے مخاطب ہو کر کہا، "ایسا ہی" اور یہ کہہ کے چلتی بنی، میں نے سنار سے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے اس نے کہا اس عورت نے ایک انگوٹھی مجھ سے بنوائی، اور فرمائش کی کہ میں اس پر شیطان کی صورت نقش کر دوں، میں نے کہا، میں کیا جانوں شیطان کیسا ہوتا ہے، یہ سنکر وہ چلی گئی، اور اب یہاں آکر جو کچھ اس نے کہا ہو گا آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔

(۴۳)

ایک آدمی میرے پاس آیا اور فرمائش کی کہ اپنے دوستوں کو ایک سفارشی خط

نے جواب دیا، امیر المومنین کے حلم وعفو سے، یزید بن عبدالملک نے اسے بیٹھنے کا
حکم دیا یہاں تک کہ مجلس برخاست ہوگئی، پھر اسی لونڈی کو بلوایا، وہ عود لے کر حاضر
ہوئی، اس نوجوان نے اس سے کہا، یہ شعر گاؤ۔

افاطم مهلا بعض هذا التدلل　　وان كنت قد ازمعت صرمي فاجملي

اس نے اسے گایا، یزید نے نوجوان سے کہا اور؟ اس نے کہا، یہ شعر،

تألق البرق نجديا فقلت له　　يا ايها البرق اني عنك مشغول

اس نے اسے بھی گایا، خلیفہ نے کہا ابھی اور بھی باقی ہے؟ نوجوان نے
کہا، جہاں پناہ! مجھے ایک رطل شراب منگوا دیجیے، وہ حاضر کی گئی ابھی پورے
طور سے وہ پی بھی نہ چکا تھا، کہ دفعتہً وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور ایک بلند قبہ
پر چڑھ گیا، اور وہاں سے کود پڑا، اور ختم ہوگیا، خلیفہ نے کہا، انا للہ وانا الیہ
راجعون، دیکھا اس احمق کو وہ بے وقوف یہ سمجھا کہ میں اس جاریہ کو اس سے
لوں گا، اس لونڈی کو اس کے اہل واقربا تک پہنچا دو، اور اگر کوئی نہ ہو تو اسے
بیچ کر اس کی قیمت اس نوجوان پر صدقہ کر دو،
لوگ اسے پکڑ کر لے چلے، جب وہ گھر کے وسط میں پہنچی، تو اس نے
ایک تالاب دیکھا، جس میں بارش کا پانی جمع ہوا کرتا تھا، وہاں پہنچ کر اس
نے لوگوں سے اپنے آپ کو چھڑا کر، اور یہ شعر پڑھ کر،

من مات عشقا فليمت هكذا　　لا خير في عشق بلا موت

اپنے آپ کو اس میں ڈال دیا، اور ختم ہوگئی،
محمد نے یہ قطعہ سنکر خوشنودی کا اظہار کیا، اور مجھے گراں بہا انعام
فرمایا۔

(۲)

محمد بن زیات نے فصد لی، تو جاحظ عیادت کو حاضر ہوا اور کہا،

لونڈی :۔ کہدو، حلقی دروازہ پر ہے۔

میں :۔ بس بھر پایا، کچھ نہ کہو۔۔ ۔۔ ۔۔ یہ کہہ کے میں واپس ہو گیا،

(۶)

میرے پاس بعض لوگ آئے، اور کہا، کہ تمھارے پاس ایک ہزار ایسے جوابات ہیں جو دوسروں کو خاموش کر دیتے ہیں، کچھ ہمیں بھی سکھاؤ گے، میں نے کہا "ضرور" ایک نے کہا، اگر کوئی شخص کسی نا ملائم اور مکروہ الفاظ میں مخاطب کرے تو کیا جواب دیا جائے، میں نے کہا جو کچھ وہ برا بھلا کہے تم صرف یہ کہو، "بجا ارشاد"

(۷)

علی بن عبیدہ ریحانی بیمار پڑے تو میں ان کی عیادت کو گیا، میں نے ان سے پوچھا "کس چیز کو جی چاہتا ہے، ابوالحسن ؟"

انھوں نے کہا :۔ رقیبوں کی آنکھیں، چغلخوروں کی زبان، اور حسد کرنے والوں کا جگر چاہتا ہوں۔"

(۸)

ایک مرتبہ ایسا اتفاق پیش آیا، کہ میں کنیت بھول گیا، تو میں نے اپنے گھر والوں سے پوچھا کہ بھائی میری کنیت کیا ہے؟ انھوں نے کہا، ابو عثمان،

اقوال جاحظ

جاحظ کے جن اقوال بدیع نے شہرت عام اور ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر لی ہے، وہ لوگوں کی زبانوں پر ہیں، ہم آج اس صحبت میں اس کے بعض اقوال آپ کو روشناس کرانا چاہتے ہیں، جو کسی نہ کسی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔

لکھ دیجئے مجھے ضرورت ہے میں نے ایک خط لکھا اور اس پر مہر لگا کے اس کے حوالہ کیا،

رقعہ لے کے جب وہ باہر پہنچا، تو اس نے رقعہ کا لفافہ پھاڑا اور خود پڑھ لیا، اس میں میں نے لکھا تھا۔

" یہ خط لکھ کے اس شخص کو دے رہا ہوں جسے میں ذرا بھی نہیں پہچانتا اگر آپ اس کی حاجت پوری کر دیں تو آپ کی تعریف نہیں کروں گا، اور اگر اسے ناکام واپس کر دیجئے، تو مجھے آپ سے ذرا بھی شکایت نہ ہوگی "

وہ آدمی فوراً میرے پاس آیا، میں نے کہا شاید تم نے میرا خط پڑھ لیا، اس نے کہا ہاں!

میں :۔ میں نے کہا جو کچھ لکھا ہے اس سے تمہیں گزند نہیں پہنچ سکتا، میں نے اپنی یہ علامت مقرر کر لی ہے۔ کہ جب کسی کی سفارش کرتا ہوں تو ایسے ہی الفاظ لکھتا ہوں،

اس نے کہا :۔ خدا تجھ پر لعنت کرے، تیرے ہاتھ پاؤں بیکار کر دے

میں :۔ یہ کیا؟

اس نے جواب دیا :۔ یہ میری علامت ہے جب کسی کا شکریہ ادا کرتا ہوں تو ایسے ہی الفاظ استعمال کرتا ہوں۔

(۵)

میں اپنے ایک دوست کے ہاں گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا، تو ایک لونڈی نکلی،

میں :۔ اپنے آقا سے کہدو، جاحظ دروازہ پر کھڑا ہے۔

لونڈی :۔ کہدوں جاحد (جھگڑنے والا) دروازہ پر کھڑا ہے۔؟

میں : اس سے کہدو حدقی کھڑا ہے،

جاحظ کی شاعری

نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت، نوادرات زمانہ ہیں، اور اگر یہ دونوں وصف کسی شخص میں جمع بھی ہوتے ہیں تو پلہ برابر نہیں رہتا، نظم دل کش ہوگی، تو نثر روکھی ہوگی، اور اگر نثر کا پلہ بھاری رہا، تو نظم بس یونہی رہتی ہے، ظاہر ہے جاحظ نے نثر میں بالخصوص کمال حاصل کیا تھا، اپنے اسلوب بدیع میں، وہ ماہر تھا، کوئی اس حد تک نہیں پہنچ سکا، لیکن بایں ہمہ وہ شعر و شاعری کے میدان میں بالکل مبتدی نہیں ہے بلکہ اچھا خاصا ہے۔

(۱)

راویوں کا بیان ہے کہ اس نے ایک قصیدہ ابو الفرج نجاح بن سلمہ کی طرف میں لکھا اور اس میں اپنا ماہانہ کھول دینے کی درخواست کی تھی یہ قصیدہ نایاب ہے، ان چند اشعار باقی ہیں جن کا نمونہ یہ ہے،

ا دم بعز الخفض راض بخفضہ ... وذو الخرام یسری حیث لا احد یسری
بمن الرضا شیئاً یسیرا مھونا ... ودون الرضا کاس امر من الضبر
سوی لا یا مر صاحب حنکۃ ... واخر کلب لا یوس ولا یبری

(۲)

علم اور علما کے فضائل و مناقب میں کہتا ہے،

یطیب العیش ان تلقی حکیما ... غذاء العلم والفھم المصیب
فیکشف عنک حیرۃ کل جھل ... وفضل العلم یعرفہ اللبیب
شفاء المرض لیس لہ شفاء ... ودا ء الجھل لیس لہ طبیب

---

(۱)

آدمی کو لازم ہے کہ سخی ہو، فضول خرچ نہ ہو، بہادر ہو، لیکن سریع الغضب
ہو، شجاع ہو، لیکن بزدل نہ ہو، گفتگو خوب کرتا ہو لیکن عامیانہ باتوں سے پر
کرتا ہو، خاموش ہو لیکن گونگا نہ ہو، حلیم اور بردبار ہو، لیکن ذلت نہ قبول کرتا ہو
کی مدد سے دریغ نہ کرتا ہو، لیکن ظلم بھی نہ کرتا ہو باوقار ہو، لیکن احمقانہ طور
حاکم ہو لیکن غصے میں نہ آجاتا ہو،

(۲)

ہر عشق کو محبت کہہ سکتے ہیں لیکن ہر محبت کو عشق نہیں کہہ سکتے ہیں ا
محبت سے الگ ایک مستقل چیز ہے، جس طرح فضول خرچی اور سخاوت ا
نہیں، یا بخل و میانہ روی میں فرق ہے، یا بزدل اور حوصلہ مندی میں فر
ہے، جلد غصہ آجانے والے آدمی، اور شجاع ہیں جس طرح تفریق ہے
طرح یہ بھی الگ چیز ہے،

(۳)

یہ چیزیں ان آدمیوں میں ضرور پائی جاتی ہیں، گونگے میں ہلکا پن، ا
میں غصہ کی سرعت، پستہ قد میں غرور، میانہ قد آدمی میں شرافت لمول
علم، افرس میں ذکاوت، اندھوں میں قوت حافظہ اعور میں ثقالت
میں مسرت۔

(۴)

جاحظ کا قول ہے، جس نے اپنے مال کی حفاظت کر لی، اس نے دو
چیزوں کو بچا لیا، ایک تو مذہب کو دوسرے آبرو کو،

---

(۱)

ابن بطلان طبیب کے خط سے ابن ابی اصیبعہ نقل کرتے ہیں کہ جاحظ اور یوحنا بن ماسویہ ابن بطلان کے قول کے مطابق اسماعیل بن بلبل کے ہاں ایک دستر خوان پر بیٹھے (میرے نزدیک صحیح تر واقعہ یہ ہے کہ دعوت ابن ابی داؤد کے ہاں تھی، نہ کہ اسماعیل بن بلبل کے ہاں۔ بہرحال، تو دستر خوان پر جہاں اور لذیذ کھانے لائے گئے، دودھ دہی بھی آیا، لیکن مچھلی کے ساتھ یوحنا نے دونوں کے استعمال سے منع کیا اس لئے کہ نقصان کا اندیشہ تھا، جاحظ نے کہا "خوب" یا تو مچھلی اور دودھ طبعاً، ایک دوسرے کے مغائر ہیں، اگر ایسا ہے تو علاج بالضد تو خوب ہوتا ہی ہے، اور اگر مغائرت نہیں ہے ایک ہیں، تو گویا ایک ہی چیز کھائی حرج کیا ہوا؟ یوحنا نے کہا میں بحث و مباحثہ کا تو عادی نہیں ہوں، عمل دیکھ لینا کیا ہوتا ہے؟ جاحظ نے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لئے خوب ہی خوب کھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ رات کو فالج کا جب حملہ ہوا تو کہنے لگا، خدا کی قسم یہ قیاس محال کا نتیجہ ہے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟

(۲)

ابو معاذ عبدان النحوی کہتے ہیں کہ ہم جاحظ کی عیادت کو گئے، وہ فالج میں مبتلا تھا، ہم مجلس میں بیٹھے ہی تھے کہ متوکل باللہ کا ایک قاصد آیا، پھر جاحظ ہماری طرف متوجہ ہوا اور کہا: "اس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو، جس کے ایک پہلو کی حالت یہ ہے کہ اگر آرہ سے چیر ڈالا جائے تو بھی ذرا احساس نہ ہو، اور دوسرے کا یہ حال ہے کہ اگر مکھی بھی بیٹھ جاتی ہے تو درد والم کی انتہا نہیں رہتی۔"

ہجو

بعض شعرا نے جاحظ کی ہجو بھی کی ہے، لیکن یہ شعرا پست درجہ کے
جو لوگ صاحب اثر و اقتدار تھے وہ جاحظ کی منزلت سے واقف تھے، ان کی
تمنا رہتی تھی کہ جاحظ اپنی کسی کتاب میں ان کا ذکر کر دے خواہ وہ برسبیل
یا بصورت ظرافت ہی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے، کہ جاحظ کا ذکر
شہرت دوام کا ضامن ہے۔

(۱)

ایک ہجو گو جو معتزلہ کا بہت بڑا دشمن ہے کہتا ہے۔

لو یمسخ الخنزیر مسخا ثانیا ما کان الا دون قبح الجاحظ

یعنی اگر سور کی صورت موجودہ صورت سے بھی زیادہ مسخ کر دی جائے
بھی جاحظ کا مقابلہ کیا کر سکے گی۔

(اس ناخوشگوار عنوان کی زیادہ مثالیں غیر ضروری سمجھ کر حذف کر
گئیں۔ مترجم)

بیماری اور وفات

متوکل علی اللہ کے عہد میں جاحظ کی بیماری کا آغاز ہوتا ہے، اپنی
سارے زمانہ میں تصنیف و کتابت کا کام اس نے برابر جاری رکھا
ہوتا ہے کہ وہ کس قدر تنومند اور مضبوط جسم کا مالک تھا، ۲۴۷ھ
یک پورے آٹھ سال وہ فالج جیسے نامراد مرض میں مبتلا رہا، لیکن
کام سے غافل نہ ہوا، اب حالات سنئے:

ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

جاحظ کے خصائص و ممیزات!

ظہور جاحظ سے پیشتر بالعموم لوگوں کا فضل و کمال کسی ایک فن تک محدود
رہا تھا لیکن جاحظ کا رنگ سب سے الگ ہے، وہ ادیب بھی ہے، شاعر بھی
ہے، متکلم بھی ہے، فلسفی بھی ہے، منطقی بھی ہے، غرض کوئی علم و فن ایسا
نہیں ہے، جس میں جاحظ پایۂ اجتہاد نہ رکھتا ہو، تحقیق علم تجارب نظریات کے لئے
اس نے دور دراز کی مسافتیں کیں، تکلیفیں اٹھائیں، اور ہر قسم کے آفات و مصائب
سے دوچار ہوا، وہ پہلا شخص ہے جس نے تقلید اعمیٰ سے گلو خلاصی حاصل کی
اور رائے عامہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، اپنے معتقدات و خیالات علی الاعلان
ظاہر کئے، سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی جو کتاب بھی اٹھا کر
دیکھئے ہر ہر سطر سے اس کی شخصیت اپنی غیر معمولی حلاوت اور شیریں بیانی، وقت
نظر و وسعت علم کا پرتو آپ پر ڈالے گی، اسے خود بھی اپنی عظمت و بزرگی کا احساس
تھا، اس لئے اس میں "انانیت" بھی کافی تھی، وہ اپنا جیسا بجا طور پر کسی کو نہیں
سمجھتا تھا اور اپنا سا ہم پایہ اور مستحق عزت و تعظیم بھی اس کی نظروں میں کوئی نہیں
تھا، یہ تو اس کے خصائص و ممیزات پر ایک سرسری اظہار خیال ہے، ورنہ
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

(۳)

داہنے نصف حصہ بدن کا یہ حال تھا کہ شدت حرارت کی وجہ سے اس پر
صندل اور کافور کی مالش کی جاتی تھی، اور دوسرے نصف حصہ کی یہ کیفیت ج
کہ اگر قینچی سے کاٹ دیا جائے جب بھی کچھ اثر نہ ہو۔

(۴)

ابوالعباس مبرد کہتے ہیں کہ میں جاحظ کی عیادت کو گیا، میں نے سنا کہ
میں داہنی طرف سے مفلوج ہوں، اگر قینچی سے تراش دو تو مجھ پر اثر نہ ہو
بائیں طرف سے منقرس کہ اگر مکھی بھی اڑ کر بیٹھ جائے تو درد و کرب کا پہ
ٹوٹ پڑتا ہے،

(۵)

ابوطاہر کہتے ہیں میں جاحظ کے ہاں گیا، میرے ساتھ رفیقوں کی ایک جما
تھی، جاحظ اپنی آخری عمر کو پہنچ چکا تھا، ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا، مگر کوئی جو
نہیں ملا، سامنے روشن دان سے اس نے جھانکا اور کہا، میں بہت زیادہ بو
ہوگیا، ضعف و نقاہت کا دور دورہ ہے، تم لوگ اب مجھے کیا کروگے،
وداعی سلام قبول کرو، ہم نے بھی سلام کیا، اور واپس چلے آئے۔

(۶)

جاحظ کا جب انتقال ہوا، اور خبر وفات قصر خلافت میں پہنچی، تو خلیفہ
باللہ نے حد درجہ رنج و تاسف کا اظہار کیا، اور یزید بن مہلبی سے
اے ابو یزید کیا جاحظ کی خبر وفات آئی ہے؟ اس نے کہا، ہاں امیرالمو
کو خدا ہمیشہ سلامت رکھے، ابو شراعہ القیسی نے بہت دردناک مرثیہ ک
اس طرح بالآخر تاریخ اسلام کا وہ زبردست رکن ختم ہوگیا۔

فارابی کا وطن

وطن اور زاد کا مسئلہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ——— !

اسی طرح فارابی کے وطن اور زاد بوم کے بارے میں بھی مورخین کے درمیان اتفاق نہیں ہے بلکہ اختلاف کافی ہے، ابن ندیم کا قول ہے کہ وہ "فاریاب" کا رہنے والا تھا، جو ارض خراسان کا ایک مقام ہے۔ بیہقی کہتا ہے کہ وہ ترکستان کے "فاریاب" کا باشندہ تھا۔ ابن ابی اصیبعہ بتاتا اور مانتا ہے کہ شہر "فاراب" بلاد ترک کا ایک حصہ تھا، جو خراسان میں واقع تھا۔

صاعد اندلسی اور شہر زوری کی تفتیش یہ ہے کہ "فاراب" بلاد ترک کا ایک حصہ ضرور ہے لیکن اس کی جائے وقوع سرزمین خراسان نہیں بلکہ ماوراء النہر ہے، ابن خلکان بھی اس امر کی تائید کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ "فاراب شہر، بلاساغون کے قریب نہر شاش پر واقع ہے ——— !"

ابن حوقل کا بیان!

اس سلسلہ میں ایک اہم پہلو قابل غور ہے

لیکن ابن حوقل اپنی کتاب "المسالک والممالک" میں ایک دوسری بات لکھتا ہے وہ کہتا ہے کہ فارابی "وسیج" میں پیدا ہوا تھا، یہ "وسیج" کیا ہے؟ اس کے بارے میں ابن حوقل کہتا ہے کہ ایک چھوٹا سا قلعہ تھا جو ولایت "فاراب" میں موجود تھا۔

پروفیسر بارتھولڈ نے اسلامی انسائیکلوپیڈیا (دائرۃ المعارف الاسلامیۃ) میں جو مقالہ تحریر کیا ہے اس میں انہوں نے تحریر کیا ہے کہ
"فاراب ایک بعید شہر تھا جس کی قدامت کی تردید اس طرح ہوتی ہے کہ دسویں صدی عیسوی کے مشہور سیاح اور جغرافیہ داں ابن حوقل، اصطخری نے اس

ابونصر فارابی

حالات ـــ سوانح ـــ افکار!

۲۵۹ھ ـــــــ ۳۳۹ھ

نام ـــ ابونصر محمد بن محمد بن محمد، اس خاندان کے جد اعلیٰ، محمد بن طرخان بن اوزلغ تھے۔

اب فارابی کے نسب پر گفتگو کریں گے۔

فارابی کا نسب!

فارابی کے نسب کے بارے میں مورخین کے درمیان کافی اختلاف پایا جاتا ہے، فارابی کے آباد اجداد کے اسماء اعلام میں بھی کافی اختلاف ہے، کوئی مورخ بھی نہ فارابی کی ماں کے نام کا ذکر کرتا ہے نہ اس خاتون کے حسب پر روشنی ڈالتا ہے۔

فارابی کی خاندانی کیفیت پر بھی گفتگو ضروری ہے:

فارابی کا خاندان

فارابی کے باپ کے بارے میں ابن ابی اصیبعہ کا قول ہے کہ وہ ایک لشکر کا سردار تھا، فارسی النسب تھا، لیکن عہدہ اور مرتبہ اور اپنے لشکر کے اعتبار سے وہ اتنا فرومایہ تھا کہ نہ اس کے کارناموں کا ذکر ہے نہ اس کے لشکر کی داستان ہے، نہ اسے کوئی اہمیت دی گئی ہے۔

ہیں کیونکہ اس لقب ہی سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے۔ اگر وہ فاریاب کا رہنے والا ہوتا تو فاریابی کہلاتا، فارابی نہ کہلاتا، چونکہ وہ فاراب کا رہنے والا تھا، اس لئے وہ فاریابی کے نام سے مشہور نہیں ہوا، بلکہ فارابی کے نام سے مشہور و معروف ہوا، اب ایک بات اور بھی ثابت ہوگئی یعنی یہ کہ وہ خراسانی الاصل نہیں تھا، اس لئے کہ خراسان میں کوئی شہر ایسا نہیں ہے جس کا نام فاراب ہو۔

فارابی کی پیدائش خواہ وسیج میں ہوئی ہو جیسا کہ ابن حوقل کہتا ہے، یا فاراب میں جیسا کہ بعض دوسرے مورخین کہتے ہیں، تو یہ اختلاف کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ ایک چھوٹے سے قلعہ میں پیدا ہوا جس کا نام وسیج تھا، تو بھی کوئی قباحت باقی نہیں رہتی، کیونکہ وسیج فاراب ہی کے قلعوں میں سے ایک قلعہ تھا۔

فارابی کی نشوونما! زندگی کا قافلہ چل رہا ہے:

اب فارابی کی نشوونما کا مرحلہ آتا ہے، کتب تراجم میں ہمیں کوئی ایسا ذکر اذکار نہیں ملتا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کہاں پروان چڑھا؟ اور اس نے تعلیمی و تربیتی مراحل کہاں طے کئے۔؟

بلاشبہ یہ ایک اہم سوال ہے، اور حد درجہ تشنہ ہے، لیکن گمان غالب یہ ہے کہ اس کا سبب سوا اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ حیات عامہ سے دور تھا، اور مورخین عموماً ان کا تذکرہ زیادہ تفصیل سے کرتے ہیں جو حیات عامہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کی زندگی پر ہنگامہ اور طوفان کی زندگی ہو، جو حوادث عامہ کی زندگی بسر کرتے ہوں۔

کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، البتہ مقدسی کی کتاب میں اس شہر کا نام مذکور ہے
جو دسویں صدی عیسوی کے آخر میں پیدا ہوا تھا، ! ۱۱

ضروری محاکمہ ! آگے بڑھنے سے پہلے محاکمہ ضروری ہے،

ہمارے نزدیک پروفیسر پارٹولڈ کی رائے فاراب کے بارے میں کچھ زیادہ وقیع
اور اہم نہیں ہے، کیونکہ شہر فاراب کا ذکر ابن خرداذبہ نے بھی کیا ہے، ...
کا انتقال ہوا اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ابن خرداذبہ کو ابن حوقل اور اصطخری دونوں
تقدیم زمانی حاصل ہے۔

فاراب کی حقیقت ! فاراب کی حقیقت :

بہرحال کوئی بات بھی ہو، یہ ایک حقیقت ہے کہ فاراب ایک ترکی شہر تھا ...
ماوراءالنہر میں واقع تھا، البتہ فاریاب ایک چھوٹی سی بستی تھی جو ارض خراسان کی ...
تحصیل جوزجان میں واقع تھی۔
فاراب اور فاریاب کے اس فرق نے صورت مسئلہ کی الجھن کو بڑی حد تک ...
کر دیا ہے اور ایک واضح صورت نظر کے سامنے آگئی ہے۔

فاراب یا فاریاب؟ ایک اور سوال :

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بلاد مختلفہ میں سے کس شہر کو فارابی سے ...
کیا جائے ؟ یعنی ان میں سے کون شہر ایسا ہے جو واقعی فارابی کا وطن اور زاد بوم ...
لیا جائے ؟
اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ فارابی کی نسبت فاراب کی طرف ہے فاریاب کی ...

شغلہ اور پیشہ بنا لیا۔

ان روایتوں کی جانچ پڑتال کے بعد ابن ابی اصیبعہ نے ان کی حیثیت میں شک و شبہ کا اظہار کیا ہے یا کم از کم اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے وہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی درخور اطمینان نہیں سمجھتا۔

آغاز حیات

سب سے پہلے ہمیں تاریخ، فارابی کے بارے میں جو کچھ بتاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ بغداد سے اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔

لیکن تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ فارابی نے کب اپنا وطن چھوڑا؟ اور کب وہ مدینۃ السلام بغداد میں وارد ہوا۔ لہٰذا اب ہم دوسرے وسائل اور ذرائع سے، بعض حالات و واقعات اور مورخین کے کلام کے بین السطور سے کھوج لگائیں گے کہ فارابی نے کب اپنے وطن کو خیرباد کہا؟ اور کب وہ بغداد میں داخل ہوا؟

فارابی عراق میں!

صاعد اور قفطی کا بیان ہے کہ:۔

"فارابی عراق میں داخل ہوا، اس نے بغداد کو اپنا وطن بنا لیا اس نے فلسفہ، منطق، اور اسی طرح کے دیگر علوم کی تعلیم یوحنا بن حیلان سے حاصل کی جو مقتدر باللہ کے عہد میں بہ دوران قیام بغداد فوت ہوا۔"

اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ فارابی ابو بشر متی بن یونس کا ہم عصر تھا۔

متی بن یونس!

قفطی ابو بشر کے بارے میں بیان کرتا ہے:۔

"متی بن یونس ایک نصرانی شخص تھا، اسے منطق کے فن میں بڑی دسترس حاصل تھا، یہ بغداد میں مقیم تھا، اس کی منطق دانی کا دور دور شہرہ تھا، اس نے منطق کے اصول قاعدے اور ضابطے کی منقد و شرحیں بھی قلمبند کی تھیں، اس کا اور ہمیشہ اسی فن کی تعلیم اور تفہیم تھا۔ اس کی کتابوں پر اور شروح و حواشی پر وقت کے لوگ بہت زیادہ اعتبار کرتے تھے،" ——— یہ بغداد میں ۳۲۰ھ

ہر شخص کے ساتھ کچھ نہ کچھ محرومیاں لگی ر

فارابی کی بدقسمتی!

فارابی کی ایک بدقسمتی یہ بھی تھی کہ اس کے بعد ہی ابن سینا یعنی شیخ الرئیس نمودار ہوا، اسے فلسفہ میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، اور سیاست میں بھی کافی درک کی شہرت اور ناموری کے ستارے، فلسفہ کے آسمان پر بھی چمکے اور سیاست کے بھی جگمگائے، یہ اپنے پیش رو فارابی کے مقابلہ میں زیادہ ذہین اور زیادہ خوش قسمت تھا، اس کا علم مبنی تھا فارابی کے علم پر، فارابی نے دریا کو کوزہ میں بند کیا تھا فلسفہ اور نظریہ کو اختصار کے ساتھ بیان کیا تھا جس سے صرف اہل علم کا بلند پایہ ہی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ شیخ الرئیس نے یہ کیا کہ کوزہ کو دریا بنا دیا، فارابی کے کو خوب کھول کر پوری بسط و توضیح اور شرح و تفصیل کے ساتھ بیان کیا، خوب چوڑی طویل اور ضخیم کتابیں فارابی کے نقش کردہ فلسفہ پر لکھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ نے فارابی کے اختصار کو نظر انداز کر دیا اور شیخ الرئیس کی طوالت کو پسند کرنے اس صورت حال کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ شیخ الرئیس کا نام زیادہ چمکا، اور فارابی طاق نسیاں کے نذر ہو گیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شیخ الرئیس کا علم اور اس کا بڑی حد تک فارابی ہی کے علم و فلسفہ سے ماخوذ ہے۔

ابن ابی اصیبعہ نے فارابی کے نشو و نما کے بارے میں دو روایتیں ذکر کی

۱۔ پہلی روایت آمدی سے کی ہے وہ لکھتا ہے کہ فارابی کی زندگی کا طرح ہوا کہ وہ دمشق کے ایک باغ کا نگراں اور محافظ تھا۔

۲۔ دوسری روایت میں یہ ہے کہ فارابی کی زندگی قاضی کی حیثیت سے شروع ہوئی جب اس نے علوم درک حاصل کر لیا تو یہ کام چھوڑ دیا اور اپنے نظریات و خیالات کی تعلیم و تدریس

یا بقول بعض ۳۳۰ھ کے بعد وارد ہوا تھا۔!"

ابن خلکان کی روایت ہے کہ:۔

"جب فارابی بغداد میں آیا تو ابو بشر متی بن یونس وہاں موجود تھا یہ واقعہ ۳۲۰ھ سے پہلے کا ہے، ہماری اس رائے کی تائید ابن ابی اصیبعہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے وہ کہتا ہے کہ فارابی نحو کا علم ابو بکر بن السراج سے حاصل کرتا تھا، اور ابو بکر بن السراج فارابی سے منطق کا سبق لیتے تھے۔

ابن ندیم ابن درستویہ سے روایت کرتا ہے:۔

ابن ندیم کی روایت

"ابن سراج مبرد کے نوخیز اور کم سن شاگردوں میں سے تھا یہ بڑا ذہین اور ذکی تھا، اسی لئے مبرد اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا، اسے وہ اپنے دوسرے شاگردوں کے مقابلہ میں زیادہ عزیز رکھتا تھا ہر وقت اس کی خاطر شرح و بیان کے لئے تیار رہتا تھا، اسے خلوت اور جلوت ہر موقع پر حاضر ہونے کی اجازت دے رکھی تھی، وہ اس سے بہت مانوس اور ملتفت تھا۔!"

اسی روایت میں آگے چل کر کہا ہے:۔

"مبرد کی موت کے بعد میں نے ایک روز ابن السراج کو دیکھا کہ وہ زجاج کی خدمت میں حاضر ہوا، آتے ہی سلام کیا، حاضرین مجلس میں سے ایک شخص نے زجاج سے کچھ سوال کیا، زجاج نے ابن السراج سے کہا

"اے ابو بکر تو اس سوال کا جواب دے۔!"

ابن السراج نے سائل کے سوال کا جو جواب دیا وہ غلط تھا اس پر زجاج بہت خفا ہوا اس نے بری طرح ابن سراج کو جھڑکا اور ڈانٹا اور کہا

"خدا کی قسم اگر تو میری مجلس کے بجائے میرے گھر پر آتا اور وہاں تجھے

غلطی سرزد ہوتی تو میں تجھے ضرور مارتا لیکن مجلس میں مار پیٹ مناسب نہیں سمجھتا، میں تو تجھے ذہانت اور ذکاوت میں ابوالحسن بن رجاء کے مانند مانتا تھا اور تیری غلط روی اور ناسمجھی کا یہ عالم ہے؟"

اس زجر و توبیخ کے جواب میں ابن السراج نے کہا:۔

"اے ابو اسحاق آپ نے مجھے مارا بھی اور میری تادیب بھی کی، بات یہ ہے کہ میں نے آپ کی مجلس میں منطق کی جو تعلیم حاصل کی ہے، اس نے ایک دوسری کتاب ——— کتاب سیبویہ ——— کے انہماک و اشتغال سے مجھے باز رکھا اور میں اسے بھول گیا کیونکہ اس اثناء میں منطق اور موسیقی کے اشتغال کے باعث نحو سے میں نے قطع تعلق کر لیا تھا، لیکن آپ کی اس تنبیہ نے میری آنکھیں کھول دیں، اب میں پھر بھولا ہوا علم دہراؤں گا اور وہی مرتبہ حاصل کروں گا۔ جو پہلے مجھے حاصل تھا۔!"

ابن السراج نے جو کچھ کہا تھا اسے سچ کر دکھایا، اس نے اپنے بھولے ہوئے علم ——— یعنی فن نحو ——— کو پھر سے تازہ کر لیا متعدد کتابیں تصنیف کیں اور وہ مقام حاصل کر لیا کہ جب زجاج نے اس دنیا سے منہ موڑا تو استاد کی مسند پر وہی بیٹھا اور لوگوں نے اس کی ریاست تسلیم کر لی۔!"

تائید اور توثیق قفطی کی ایک روایت سے بھی مذکورہ بالا روایت کی تائید اور توثیق ہوتی ہے وہ عبداللہ بن مرزبانی سے روایت کرتا ہے

ابن السراج نے فن نحو میں متعدد کتابیں تحریر کیں، ایک کتاب کا نام اس نے اصول رکھا، یہ کتاب سیبویہ کی کتاب سے ماخوذ تھی البتہ کتاب کی

یہ منطق کا ہے اور ابن السراج کے بعد اس کے جو شاگرد، علم کے میدان میں روشناس ہوئے جنھوں نے اپنی شہرت کا ڈنکا بجایا، وہ بھی اپنے استاد کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، یعنی ان کی تصنیفات اور خیالات پر بھی خواہ وہ فن منطق سے تعلق رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں منطق کے اثرات چھائے رہتے تھے۔

فارابی اور ابن السراج!

اس روشنی میں ملاحظہ فرمایئے کہ فارابی اور ابن السراج کے باہمی ارتباط کی نوعیت کیا تھی جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے روایت کی ہے، فارابی کا بغداد میں داخلہ ۳۲۰ھ سے پہلے پہلے ہوا، اس لئے کہ ابن السراج کا انتقال ۳۳۶ھ میں ہوا، اس روایت پر ابن اثیر، ابن انباری، قفطی ابن خلکان اور ابوالمحاسن سب کا اتفاق ہے۔

اور اگر وہ روایت صحیح ہے جو ابن ندیم نے ابن درستویہ سے کی ہے تو پھر ابن السراج کی منطق اور موسیقی میں مشغولیت ۳۱۰ یا ۳۱۱ھ سے قبل کا واقعہ ہے اور یہ دونوں وہ سنہ ہیں کہ انھیں میں سے کسی ایک میں زجاج کا انتقال ہوا۔

ابن السراج کے اس اعتراف سے کہ منطق اور موسیقی کے انہماک و اشتغال نے اسے نحو سے دور کر دیا تھا اور سیبویہ کی کتاب اس طرح بھلا دی تھی کہ وہ ایک سوال کا جواب نہ دے سکا اور استاذ کے سامنے غلطی کر کے اسے شرمندہ ہونا پڑا ——— یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ منطق اور موسیقی کے ساتھ اس کے اشتغال کا زمانہ خاصا طویل رہا ہوگا، اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فارابی کا ابن السراج سے تعلق اور ربط ۳۱۰ھ سے پہلے پہلے کا واقعہ ہے، جب یہ بات ہے تو ماننا پڑے گا کہ فارابی کا بغداد میں داخلہ اس سے بھی پہلے کا واقعہ ہوگا۔

فارابی اور حکمت و فلسفہ

ابن ابی اصیبعہ کی روایت ہے کہ حکمت و فلسفہ و منطق کی طرف فارابی کے متوجہ ہونے کا واقعہ یہ ہوا کہ ارسطا

ترتیب و تقسیم ابواب میں اس نے منطقی اصول ملحوظ رکھا، بہرحال لفظ و عبارت کو
اگر دیکھا جائے اور معنی و مفہوم پر غور کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس کی کتاب تمام
کی کتاب سے ماخوذ تھی۔"

کتاب "اصول"

اگر ہم کتاب "اصول" پر ایک نظر ڈالیں تو ہم محسوس کریں
منطق کی شگوفہ کاریاں اس میں کثرت موجود ہیں یہ رنگ
شاگردوں میں بھی رچ گیا، چنانچہ ابوالحسن علی بن عیسیٰ جو رمانی کے نام سے مشہور
ہیں اپنے کلام میں منطق کو اس بُری طرح ممزوج کر دیتے تھے کہ ابوعلی فارسی کو
کر کہنا پڑا:-

"ابوالحسن جو کچھ کہتے ہیں اگر نحو وہی ہے۔ تو پھر ہاں لینا چاہیے کہ ہم نحو بالکل
جانتے، اور اگر نحو وہ ہے جو ہماری زبان پر ہے تو تسلیم کر لینا چاہیے کہ رمانی کو
آتا ہے مگر نحو نہیں آتی!!"

خصائص

ابن جنی ابوالحسن اور ابوعلی فارسی کے شاگرد تھے، انھوں نے ایک کتاب
"خصائص" فن نحو میں تصنیف کی ہے، اس کتاب کی مصنف کے زمانے
بھی بہت شہرت ہوئی اور اب بھی یہ ایک مستند اور معیاری کتاب مانی جاتی ہے
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ متعدد اعتبارات سے کتاب کی افادی حیثیت بہت بلند
رفیع ہے، بایں ہمہ اس حقیقت کے تسلیم کئے بغیر بھی چارہ نہیں کہ کتاب کا
اور ہر ہر لفظ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس دور میں فن نحو منطق کے اثر سے بہت
متاثر ہو چکا تھا۔

ابن السراج کو زجاج کی جو ڈانٹ پڑی تھی اگرچہ وہ رنگ لائے بغیر
پھر اس نے نحو سے منہ موڑا، اور اپنی ساری ذہنی صلاحیت منطق ہی پر صرف کر دی
اس کی تمام کتاب میں ہر ہر لفظ اور جملہ پر جو رنگ بہت زیادہ چوکھا اور نمایاں

غیر معمولی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ استادانہ اور فن کارانہ مہارت حاصل کرلی تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ اس نے صرف ارسطو کے فلسفہ میں مہارت نہیں حاصل کی بلکہ اس علم کی کنہ اور اس کے اغراض و غایات تک پہنچ گیا، اب اس کی نظر علمی اعتبار سے محدود نہ تھی بلکہ ساری گہرائیوں تک پہنچ چکی تھی۔

ابن خلکان پر تنقید

لیکن ابن خلکان کی روایت ہمیں ذرا احتیاط سے قبول کرنی چاہئے، کیونکہ صاعد، قفطی اور ابن ابی اصیبعہ ابن خلکان پر زمانی اعتبار سے تقدم رکھتے ہیں اور ان لوگوں نے کہیں بھی یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ فارابی نے ابو بشر متی بن یونس سے تحصیل علم کی ہے بلکہ اس کے برعکس صاعد اور قفطی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ابو بشر متی بن یونس کی منطق میں جو کتابیں ہیں ان کا اگر فارابی کی کتابوں سے موازنہ اور مقابلہ کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ یہ دونوں یعنی فارابی اور ابو بشر اگرچہ بڑے پایہ کے تھے لیکن فارابی ابو بشر سے عمر میں کم ہونے کے باوجود علم میں اس پر کہیں فائق تھا اور ابو بشر اگرچہ فارابی سے عمر میں بڑا تھا، لیکن اس کا پایہ علمی و ذہنی وہ نہ تھا جو فارابی کا تھا، فارابی کو ابو بشر پر اس زور شور سے ترجیح دینے کے صاف معنی یہ ہیں کہ فارابی ابو بشر کا شاگرد نہیں تھا، ہاں ایک نوعمر معاصر ضرور تھا

ایک نئی بات!

فارابی فلسفہ کو مسلمانوں میں شائع و ذائع کرنے کی جو وجہ بیان کرتا ہے وہ بڑی اہم ہے اور دلچسپ بھی۔ وہ کہتا ہے :-

"اسکندریہ کے بڑے بڑے پادری ایک مرتبہ مجتمع ہوئے، انھوں نے باہمی مشورہ کیا کہ ارسطاطالیس کی کون سی کتابیں اس قابل ہیں کہ ان کے پڑھنے کو جاری رکھا جائے اور کون سی ایسی ہیں جنہیں باطل قرار دیا جائے ـــــ آخر کافی بحث مباحثہ اور رد و قدح کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ارسطو کی کتابوں

طالیس کی ایک کتاب کا کوئی جملہ کسی آدمی نے فارابی سے دریافت کیا، جواب دینے کے
لئے دوسرے کتاب کی طرف رجوع کرنا پڑا مکالمہ کے دوران میں اس فن سے دلچسپی
اور مطالعہ کی ذہن کو تحریک ہوئی بس پھر کیا تھا، فارابی نے اس طرف پوری توجہ کی
سارا وقت انہیں علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل پر صرف کرنے لگا آدمی ذہین تو
تھا بہت جلد علوم حکمت و فلسفہ و منطق پر حاوی ہو گیا اور اس درجہ کمال حاصل
کہ اس فن کا امام بن گیا اور دنیا نے تسلیم کر لیا کہ وہ بہت بڑا فیلسوف اور بہت
ماہر علوم منطق و حکمت تھا۔

ابن ابی اصیبعہ، صاعد اور قفطی اس پر متفق الخیال ہیں کہ فارابی نے بغداد میں
اس علم کی تحصیل یوحنا بن جیلان سے کی، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یوحنا ابو بشر متی
کا ہم عصر تھا، اگرچہ اس سے عمر میں کچھ کم تھا لیکن علم میں پایہ استادی کا رکھتا تھا
سے کہیں زیادہ فائق و برتر تھا۔

ابن خلکان کا اختلاف

لیکن ابن خلکان کو اس رائے سے اتفاق نہیں
اس کا یہ خیال ہے کہ فارابی یوحنا کا نہیں بلکہ ابو بشر
متی بن یونس کا شاگرد تھا، وہ باقاعدہ اس کے حلقۂ درس میں شریک ہوتا تھا
کسب فیض کرتا تھا، اس کے لائق اور ہونہار شاگردوں میں اس کا شمار ہوتا تھا، ایک
مدت تک وہ ابو بشر کے حلقۂ درس سے فائدہ اٹھاتا رہا، اس کے بعد وہ شہر حران
یہاں ایک اور ماہر علوم فلسفہ و حکمت موجود تھا، جس کا نام یوحنا بن جیلان تھا
فلسفی مذہباً عیسائی تھا اس سے بھی فارابی نے کسب علم کیا اور منطق کا فن حاصل
کیا پھر حران سے وہ بغداد واپس آیا، یہاں اس نے علوم فلسفہ میں مزید مہارت
کی، اور ارسطو کی تمام کتابیں حرفاً حرفاً اور سبقاً سبقاً پڑھ ڈالیں، ارسطو کی کتابیں
ایسے ذوق و شوق اور انہماک اور استغراق سے پڑھیں کہ ارسطو کے فلسفہ کی

نے دین کی مسند سنبھال لی اور وہیں اپنے وطن میں پاؤں توڑ کر بیٹھ گیا، اس کی ساری سرگرمیاں صرف امور دین تک محدود تھیں، اسی کام میں وہ اپنا سارا وقت صرف کرتا تھا، لیکن ابراہیم مروزی نے دوسرا راستہ اختیار کیا وہ سیدھا بغداد آیا اور یہاں درس و تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا، بغداد میں مروزی سے متی بن یونان نے علم حاصل کیا، یہی وہ شخص تھا جو اپنے وقت میں آخرہ اشکال وجودیہ ۱۱ تک کی تعلیم دیا کرتا تھا۔

ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ اس طویل بیان کے بعد فارابی کہتا ہے :-

"میں نے یوحنا بن جیلان سے تعلیم حاصل کی اور "برہان" کے آخر تک کا حصہ پڑھ ڈالا ———— !"

یوحنا بن جیلان ! اس ساری تصریح و تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ فارابی نے یوحنا بن جیلان سے تعلیم فلسفہ و حکمت حاصل کی، اگر اس نے ابوبشر متی بن یونس سے بھی پڑھا ہوتا، تو ممکن نہ تھا کہ اس کے ذکر کو فراموش کر دیتا، بلکہ جس طرح اس نے پوری صفائی اور صداقت کے ساتھ اپنے عیسائی استاذ یوحنا بن جیلان کا ذکر کر دیا ہے اسی طرح وہ بغیر کسی جھجک کے اس کا بھی اعتراف کرتا کہ اس نے ابوبشر متی بن یونس سے بھی حاصل کیا ہے، علم کا حاصل کرنا اور استاذ بنانا کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ اُسے چھپایا جائے۔

فارابی اور ترکی زبان ! ابن خلکان کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارابی جب بغداد پہنچا تو وہ ترکی زبان سے واقف ضرور تھا، لیکن صرف ترکی ہی سے نہیں اور بھی متعدد زبانوں میں وہ ماہر تھا، عربی کے سوا متعدد زبانوں میں اسے پورا عبور حاصل تھا، ان زبانوں پر اسے اتنی کامل دسترس حاصل تھی کہ وہ ان زبانوں سے اور ان کے پورے لٹریچر سے پورے طور پر مستفید ہو سکتا تھا۔

یں سے منطق کی کتابیں آخرہ اشکال وجودیہ تک پڑھنے پڑھانے میں کوئی
مضائقہ نہیں لیکن ان کے بعد جو کچھ ہے اُنھیں نہ پڑھا جائے کیونکہ ان کی
کی تعلیم ان پادریوں کی رائے میں دینِ عیسوی کے خلاف تھی اور اس
سے مذہب عیسوی کے وجود اور بقا کو خطرہ لاحق ہونے کا امکان تھا
اب وہ اس فکر میں تھے کہ اگر ارسطو کی بعض کتابیں پڑھنے کی اجازت
دیں اور بعض کی نہ دیں تو بھی ممنوعہ حصے پڑھنے والے پڑھ ہی لیں گے
کیونکہ کسی کتاب کے ہر ہر صفحہ اور ہر ہر باب پر تو احتساب نہیں ہو سکتا۔
یہاں تک کہ اسلام کا دائرہ وسیع ہوا اور عیسائیوں کا تعلیمی مرکز
اسکندریہ سے انطاکیہ میں منتقل ہو گیا، ایک عرصہ دراز تک انطاکیہ
کی مرکزی حیثیت قائم اور برقرار رہی، مرورِ دہر کے ساتھ تعلیم دینے
والے اور فن کار گھٹتے رہے، یہاں تک کہ صرف ایک شخص انطاکیہ میں
ایسا رہ گیا، جو ان علوم کی تعلیم دے سکتا تھا اس شخص سے دو آدمیوں
نے علم حکمت و فلسفہ حاصل کیا، یہ لوگ علم حاصل کر کے انطاکیہ سے
نکلے، ان کے ساتھ ارسطو کی کتابیں بھی تھیں: ان دونوں میں سے ایک
شخص حران کا باشندہ تھا اور دوسرا مرو کا رہنے والا تھا، اس سے
دو اور آدمیوں نے علم حاصل کیا، ان میں سے ایک ابراہیم مروزی تھا
اور دوسرا یوحنا بن جیلان، اور حرانی سے جن آدمیوں نے تعلیم حاصل
کی اُن میں سے ایک اسرائیل الاسقف تھا اور دوسرا قویری یہ دونوں
بغداد آئے، ان میں سے اسرائیل تو صرف دین کی تبلیغ و ترویج میں
معروف و منہمک ہو گیا اور قویری نے درس و تدریس کا حلقہ سنبھال
لیا، اب رہے یوحنا بن جیلان اور ابراہیم مروزی، تو یوحنا بن جیلان

تفہیم معانی کے ایسے راستہ پر چلتا تھا جو ہر اعتبار سے مفید مقصد تھا۔

ابن عماد کہتا ہے :-

"فارابی نے کتب منطق کی شرح کی، ان کتابوں کے مشکل اور دشوار مقامات کو حل کیا، ان کے اسرار و رموز کو بے نقاب کیا، ان کے مطلب اور معنی کو زیادہ سے زیادہ آسان بنا دیا اور ضرورت کے تمام مسائل اپنی کتابوں میں ایسی سادگی، خوبی اور روانی کے ساتھ درج کئے کہ عبارت اور زبان کا چٹخارہ بھی ملتا ہے اور مفہوم و معنیٰ کی بلندی بھی۔"!

فارابی اور عربی زبان!

حقیقت یہ ہے کہ فارابی کو عربی زبان پر وہی قدرت حاصل تھی جو کسی اہل زبان کو حاصل ہو سکتی ہے، اس کے اسلوب تحریر اور طرز انشا سے کہیں بھی یہ بات نمایاں نہیں ہوتی کہ وہ عربی میں نو آموز تھا وہ اگرچہ ترکی تھا لیکن اس کے دیس پر اسلامی پرچم کو لہراتے ہوئے دو سو سال کی طویل مدت گزر چکی تھی، لہٰذا فاراب کے باشندے قدرتی طور پر عربی سے اچھی طرح واقف تھے، یہ ایسی زبان نہیں تھی جو ان کے لئے اجنبی اور غیر مانوس ہو، ایک بات اور بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ فارابی کی ولادت سے بہت پہلے اتراک عربی شاہنشاہت کے دامن دولت سے وابستہ ہو چکے تھے، وہ عربی سیاست کے اہم ترین عوامل کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، خلافت اسلامیہ ان پر اعتماد کرتی تھی، ان کی صلاحیتوں سے واقف تھی اور ان سے فائدہ اٹھاتی تھی، عربی زبان اُن پر چھا چکی تھی، اس نے اپنی کشش سے انھیں اپنی طرف کھینچ لیا تھا، وہ عربیت میں غرق ہو گئے تھے، ان کی صحبت سے ترکوں نے عربی میں وہی دسترس اور مہارت حاصل کر لی تھی جو کسی اہل زبان کو حاصل ہو سکتی ہے، ان میں سے بڑے بڑے فقہا، شعرا، لغوی اور ادیب پیدا ہوئے بلکہ حق تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی علمی زبان عربی ہی کو

لیکن دیبوار کو اس رائے سے اختلاف ہے اس نے اپنی کتاب "الفکر
ومکانہ من التاریخ" میں ایک جگہ لکھا ہے :-

"اپنی بعض سیاحتوں کے دوران میں ایک مرتبہ فارابی بغداد آیا، وہ جب بغداد پہنچا تو عربی زبان سے بالکل ناآشنا تھا، لہٰذا یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی حیات عقلیہ وعلمیہ کا آغاز عربی زبان سے کرتا چنانچہ یہاں پہنچ کر جب اس نے عربی کی ضرورت اور اہمیت محسوس کی تب سے پہلے عربی زبان سیکھی جب اس زبان میں دسترس حاصل کر لی، تب اس نے علم وحکمت کی طرف توجہ کی اور متیٰ بن یونس کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا جو ایک عیسائی عالم تھا، اور علوم فلسفہ ومنطق میں مانا ہوا استاد تھا، !"

لیکن اس روایت کے تسلیم کر لینے میں ہمیں تامل ہے اس لئے کہ اگر اس کو مان لیا جائے تو لازم آئے گا، کہ فارابی نے جب فاراب سے بغداد کا سفر کیا تو عربی زبان سے ناآشنائے محض تھا اور اچھی خاصی عمر کو پہنچ لینے کے بعد اس نے عربی سیکھی اور اس کے بعد تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کیا، حالانکہ اس نے جو کتابیں لکھی ہیں اُن کی تعداد سو سے زیادہ ہی ہے، کم نہیں ہے۔

اس روایت کا ضعف اس بات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ فارابی کو عربی زبان پر ماہرانہ دستگاہ حاصل تھی، وہ حسن ادا خوبی تحریر، دل آویزی بیان کا مالک تھا دقیق معنی کو، سبک اور ستھرے الفاظ میں اس طرح اور اس خوبی سے بیان کر جاتا کہ پانی ہو جاتے تھے، چنانچہ اس کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علماء میں سے بعض کا قول ہے کہ وہ معانی جزلہ کو الفاظ سہلہ سے عام الفہم بنا دیتا تھا

ت پر حاوی ہو جائے، اور اس کے اسالیب پر پوری قدرت حاصل کر لے اور اس زبان کے ہر پہلو کو اپنی گرفت میں لے لے، تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جو باعث ہو یا جس سے فارابی کی علمیت اور قابلیت پر کوئی داغ آتا ہو۔ خود عرب جن کی مادری زبان عربی ہے تحصیل لغت میں عمریں صرف کر دیتے ہیں، کسی زبان کا جاننا یا نہ جاننا دوسری بات ہے، اور کسی زبان پر ماہرانہ عبور کی سعی و کوشش دوسری بات ہے، اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ بھی دوسری شق ہے، بعد میں دیکھیے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی؟ کہاں یہ بات کہ فارابی سرے سے عربی جانتا ہی نہیں تھا، کہاں یہ کہ وہ عربی زبان پر ماہرانہ اور استادانہ عبور حاصل کرنا چاہتا تھا، ان دونوں باتوں میں کتنا بڑا فرق ہے، اور اس فرق نے اصل بات کو کچھ کا کچھ کر دیا۔

ابن خلکان کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فارابی پچاس ساٹھ زبانیں جانتا تھا، اس قول میں کچھ زیادہ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا، ترکی زبان وہ اچھی خاصی جانتا تھا، زبانوں کی استعداد بہت اچھی تھی، عربی زبان پر تو اسے ایک اہل زبان کا سا عبور تھا، یونانی زبان پر بھی اسے اتنی قدرت تھی کہ وہ براہ راست اس زبان کے لٹریچر کا مطالعہ کر سکتا تھا، اس کا ثبوت اس بات سے مل سکتا ہے کہ جب وہ کسی عربی راگ کا ذکر کرتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ وہ اس کے یونانی مترادف کا بھی ذکر کر دیتا ہے، اگر اسے زبان پر ایسی غیر معمولی قدرت نہ ہوتی، تو اس کمال کا مقابلہ کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ وہ یونانی زبان سے پورے طور پر واقف تھا۔

کے احوال و مقامات

یہ بات تو اچھی طرح معلوم ہے کہ فارابی نے علم نحو ابوبکر السراج سے حاصل کیا، اور منطق کا [illegible] سے سیکھا، اور جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ متقدمین علماء نے فارابی

بنا لیا تھا۔

اس جگہ ہم دو مثالوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں، یہ مثالیں فارابی کے عہد سے تعلق رکھتی ہیں اور بلدۂ فاراب ہی سے انھیں بھی وطنیت کی نسبت حاصل ہے، پہلی مثال ابو... بن حماد جوہری کی ہے جو صحاح کے مشہور اور زندہ جاوید مصنف ہیں، دوسری مثال ابو ابراہیم اسحاق ابن ابراہیم فارابی کی ہے جو صاحب دیوان الادب کی حیثیت سے روشناس خلق ہیں، یہ دونوں حضرات بھی فارابی تھے، اور نہ صرف زبان عربی کے ... تھے بلکہ اس کے محقق اور صاحب طرز استاد بھی تھے، پھر کیا یہی حیثیت فارابی کی ... ہو سکتی؟ ضرور ہو سکتی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں اور خواہ مخواہ اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا جائے۔

شواہد کی تلاش میں ہم بہت دور نہیں جائیں گے، ایک یہ بات بھی ذہن میں ... کہ فارابی نے فارسی یا ترکی زبان میں کوئی تصنیف نہیں کی، حالانکہ کر سکتا تھا ... کیا یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اس نے عربی ہی کو اپنی علمی زبان کے طور پر اختیار کر رکھا تھا۔؟

غرض جس پہلو اور جس حیثیت سے بھی اس معاملہ پر غور کیا جائے اور جس ... سے بھی اس کی تحقیق کی جائے، یہ بات اظہر من الشمس رہے گی کہ فارابی اگرچہ ... زبان کے علاوہ وقت کی بعض دوسری زبانوں کا بھی ماہر تھا، اور انھیں بڑی ... سے اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنا سکتا تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، اس نے ... کے طور پر عربی زبان ہی کو استعمال کیا، اسی زبان کو اظہار خیال اور اظہار مطالب ... قرار دیا، اور اسی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔

جو بات مانی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ فارابی ...

فارابی اور لغت عربی! ...یں وارد ہوا تو اس کی یہ خواہش ہوئی کہ وہ ...

تو جب پہنچا اور سیف الدولہ ابن حمدان کے دربار سے وابستہ ہوگیا، سیف الدولہ کے زیر سایہ اس نے اپنی عمر کا کافی حصہ بسر کیا، پھر وہ سیف الدولہ کے ساتھ دمشق گیا، وہاں بھی اس نے کافی قیام کیا، اور بالآخر وہیں مرض الموت میں گرفتار ہوا اور اس دنیا سے رخصت ہوگیا، فارابی نے موسیقی پر جو کتاب لکھی ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یہ فیلسوف اعظم عراق میں وارد ہونے سے پہلے خراساں میں بھی اپنی زندگی کا ایک حصہ بسر چکا ہے، ابن ابی اصیبعہ کی روایت ہے کہ فارابی بغداد سے شام گیا، وہاں ایک مدت تک مقیم رہا پھر وہیں بیمار پڑا اور وفات پائی۔

ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو نصر فارابی ۳۳۸ھ میں مصر آیا پھر یہاں سے دمشق گیا اور رجب ۳۳۹ھ میں خلیفہ راضی باللہ کے زمانے میں سیف الدولہ بن حمدان کے پاس اس نے وفات پائی۔

تاریخی جرح

لیکن یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ خلیفہ راضی باللہ کا انتقال ۳۲۹ھ میں ہوگیا تھا اور فارابی کے متعلق یہ ثابت ہے کہ اس نے اپنی کتاب "المدینۃ الفاضلہ" کی تالیف کا کام بغداد میں شروع کیا، پھر ۳۳۰ھ کے آخر میں اسے لے کر وہ شام گیا، اور ۳۳۱ھ میں اس نے یہ کتاب دمشق میں تمام کی، پھر کتاب ختم ہونے کے بعد اس نے کتاب کے ابواب قائم کئے، پھر بعض احباب نے فرمائش کی کہ وہ ابواب کے علاوہ فصول بھی قائم کر دے تاکہ وہ اقسام معانی کی طرف دلالت کر سکیں اس فرمائش کو فارابی نے قبول کر لیا، اور ۳۳۷ھ میں اس نے یہ کام مصر کے اندر اتمام و تکمیل تک پہنچایا۔

ابن خلکان کا بیان!

ابن خلکان کی روایت یہ ہے کہ فارابی اپنے وطن سے بغداد آیا یہاں سے وہ حرّان گیا، اور وہاں سے پھر بغداد واپس آیا، اور بغداد میں اس نے درس و تحصیل کا سلسلہ باقاعدہ شروع کر دیا

کی برتری، علوم حکمت میں تسلیم کرلی ہے، اور وہ اسے مانتے ہیں کہ ارسطو کی کتابوں کی
شرح و تفسیر کا اس نے حق ادا کیا ہے اور اپنے خیالات علمی اور نظریات حکمی کو بڑی اعلیٰ
قابلیت سے پیش کیا ہے، تو یہ بھی ماننا پڑتا ہے، کہ لغات کے فن میں اسے غیر معمولی
حاصل تھا، یہ بات بھی سب مانتے ہیں کہ فارابی صرف منطق اور لغت ہی کا امام
بلکہ موسیقی ——— علمی بھی اور عملی بھی ——— ریاضی، طب اور دوسرے علوم
میں بھی یکتا تھا، تو اس سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ فارابی کے ابوبکر
اور یوحنا بن حیلان کے علاوہ دوسرے اساتذہ بھی تھے، جنھوں نے ان فنون میں
طاق اور شہرۂ آفاق کر دیا تھا، یہ دوسری بات ہے کہ تاریخ کے صفحات پر ان کے
درج نہ ہو سکے، اور یہ تفصیل نہ معلوم ہو سکی کہ وہ کون لوگ تھے اور ان سے کہاں کہاں
فارابی نے یہ علوم حاصل کئے تھے ——— ؟ فارابی کے احوال و مقامات
کی تفتیش سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حصول علم کے دوران میں فارابی کا کوئی مستقل
تھا، جہاں وہ جم کر بیٹھ گیا ہو، بلکہ وہ تحصیل علم کے لئے برابر ایک شہر سے دوسرے
ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا کرتا تھا، آج یہاں ہے، کل وہاں، ابھی اس
میں ہے، ابھی اس شہر میں، جہاں بھی اسے کسی اہل علم کا سراغ لگا، بس اس نے
اٹھایا، اور اس سے کسب فیض کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، غرض تحصیل علم کے زمانے میں
کوئی ایک مرکز نہیں تھا، بلکہ وہ برابر رواں دواں اور سرگرم سیر رہتا تھا۔

فارابی کے سفر و سیاحت!

فارابی کے سفروں کے بارے میں مورخین
مختلف ہیں، وہ کہاں کہاں گیا؟ کہاں کہاں
کہاں کہاں ٹھہرا؟ یہ ایک لمبی فہرست ہے اور یہ فہرست متفق علیہ بھی نہیں ہے
اس میں اختلاف بھی پائے جاتے ہیں صاعد اور قفطی کہتے ہیں کہ وہ عراق میں
داخل ہوا تو اس نے بغداد کو اپنا وطن بنا لیا، اور وہیں رہ پڑا، پھر جب یہاں سے

یہ لعن طعن اور تمسخر و استہزا کا یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ ان کی طبیعت کا رنگ بدلا، اور وہ پھر مجلس آرائی کی طرف مائل ہوئے کیونکہ شراب نے فارابی کی ہیئت کذائی کا ذکر فراموش کر دیا تھا۔

اب بے تکلفی سے شراب کا دور شروع ہوا اور پینے والوں نے بہکنا شروع کیا، سروں میں نشاط کا سودا، دماغ میں طرب خیزیوں کا ہجوم، اب ابونصر نے یہ کیا کہ بربط اٹھایا، انگلیوں کو جنبش دی، تار بولنے لگے اور نغمہ برسنے لگا، اس کا اثر یہ ہوا کہ سننے والے سو گئے، ایسا معلوم ہوتا تھا ہر شخص پر موت کی غشی طاری ہے، فارابی نے بربط پر حسب ذیل عبارت لکھ دی ——

"تمہارے پاس فارابی آیا، تم نے اس کا استقبال اس طرح کیا کہ اس کا مذاق اڑانے لگے، اس نے تمہیں سلا دیا، اور رخصت ہو گیا" ——

پھر وہ اسی طرح بھیس بدلے ہوئے الصاحب بن عباد کی مجلس سے اٹھا اور رَے سے بغداد چلا گیا۔

ابن خلکان نے ایک اس سے بالکل ملتی ہوئی اور یکساں و مماثل واقعہ کی روایت کی ہے لیکن اس میں الصاحب بن عباد کا ذکر نہیں بلکہ سیف الدولہ کا ہے۔

فارابی کا کمالِ فن! اوپر ہم نے بیہقی کی جو روایت نقل کی ہے وہ واقعہ کی حیثیت سے یقیناً صحیح نہیں ہے لیکن اس سے فارابی کے کمال فن پر ضرور [illegible] ہے مبالغہ بھی اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب کچھ بات ہوتی ہے، ورنہ [illegible] حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو اس کے غلط ہونے کا سب سے بڑا ثبوت [illegible] الصاحب اسماعیل بن عباد کی ولادت ۳۲۶ھ میں ہوئی۔ اس لحاظ سے فارابی [illegible] وقت الصاحب کی عمر بہت کم تھی، نیز یہ کہ الصاحب کی مجلس مسخروں اور

اور یہیں بغداد میں اس نے اپنی کتابوں کا بہت بڑا حصہ تصنیف کیا، جو
دمشق کا سفر کیا، لیکن وہاں زیادہ ٹھہرا نہیں، ابن ابی اصیبعہ نے فارابی کی کت
"المدینۃ الفاضلۃ" کے بارے میں جو روایت کی ہے وہی روایت اس کی ایک
کتاب "السیاستہ المدنیۃ" کے بارے میں بھی مروی ہے۔

لیکن ان دونوں کتابوں میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو مذکورہ روایتوں کی
کرتی ہو۔

بیہقی کی روایت ہے اور اس روایت کو شہرزوری نے بھی اس
ہے کہ :-

"فارابی ایک مرتبہ رے کی طرف گیا وہاں آنے کی دعوت اسے کافی
الصاحب بن عباد نے دی تھی، انھوں نے اس کے پاس ہدایا اور
صلات بھی بھیجے تھے اور اس سے ربط ضبط پیدا کرنے کا اشتیاق
ظاہر کیا تھا، چنانچہ اس نے الصاحب بن عباد کے تحائف ہدایا اور
صلات نہیں قبول کیے، ان میں سے کوئی چیز بھی اس نے نہیں لی
لیکن زمانے کے انقلاب نے کروٹ لی، اور ابو نصر فارابی کو رے
جانا پڑا، وہ رے اس حالت میں پہنچا کہ جو قبا پہنے ہوئے تھا وہ
تھی، جو ٹوپی سر پر تھی وہ بھی میلی کچیلی تھی، وہ اسی حال زبوں کے ساتھ
بن عباد کی مجلس میں پہنچا مجلس میں ندیم، مصاحب، ظریف، مسخرے اور
لہو موجود تھے انھوں نے فارابی کو دیکھ کر دربان کو ڈانٹا اور اس غریب
کے تیروں کی بارش شروع کر دی کہ اس نے غیر پسندیدہ شخص کو
میں آنے دیا، جس کی نہ کوئی حیثیت ہے، نہ شخصیت، مجلس میں جو لوگ
ہوئے تھے ان میں سے ہر شخص نے فارابی کا مذاق اڑانا شروع کیا

بے تحاشہ مارنے لگتے تھے اور اس کے آلات موسیقی چھین کر توڑ ڈالتے تھے، بیع و شرا کے معاملات میں بھی مداخلت اور اعتراض کرتے تھے، لوگ اگر عورتوں اور بچوں کے ساتھ باہر چلتے پھرتے تھے تو انھیں دیکھ کر وہ پوچھتے تھے تمھارے ساتھ کون ہے؟ تمھارا اس سے کیا رشتہ اور تعلق ہے؟ اگر ٹھیک ٹھیک جواب مل گیا تو خیر ورنہ پکڑ کر لے جاتے تھے اور پولیس کے حوالہ کر دیتے تھے کہ یہ لوگ بد چلن ہیں، پھر انھیں سزا دلواتے تھے، اگر کسی ذمی پر نظر پڑ جاتی تھی تو اُسے بھی بغیر چھیڑے اور سزا دلوائے نہیں رہتے تھے، اور اور اندھے اور معذور بھی ان کے دست تظلم سے محفوظ نہیں تھے۔

قرامطہ کا حال: دوسری طرف ہم قرامطہ کو دیکھتے ہیں، یہ دیلم کے مجوس تھے جنھوں نے ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا تھا، اور باطن میں اپنے قدیم مذہب پر قائم تھے، جب انھوں نے خلافت میں ضعف اور کمزوری، خلیفہ معتضد باللہ کے دور میں محسوس کی، تو علانیہ اپنی دعوت کا کام شروع کر دیا، انھوں نے دین کے اصول کی شرک کی بنیاد اور اصول پر تاویلیں شروع کر دیں، یہ احکام شریعت کی ایسی تاویل کرتے تھے، اور اس قسم کی حیلہ سازیوں سے کام لیتے تھے کہ شریعت مذاق بن کر رہ گئی تھی، پھر انھوں نے اپنی جماعتیں مرتب اور منظم کرنا شروع کیں، اور ہجر، احساء، قطیف اور یمامہ اور بحرین پر قابض ہو گئے، بصرہ اور کوفہ پر بھی چڑھائی کی، ان کے سردار، ابو طاہر سلیمان جنابی نے ارض جزیرہ میں قتل و نہب کا وہ بازار گرم کیا کہ عیاذاً باللہ یہ صرف اسی شخص کو امان دیتے تھے جو "فدیہ" دے کر ان کے دست تظلم سے رہا ہونے کی صورت میں استعداد رکھتا ہو، انھوں نے انبار پر بھی قبضہ کر لیا، مکہ کی دیواریں بھی ان کی چشم غارتگری سے نہ بچ سکیں، انھوں نے بیت حرام کی حرمت اور عظمت کا پاس و لحاظ نہیں کیا، ان کی سفاکی اور خوں آشامی کے مظاہرے برابر کرتے رہے، ان کی زیادتیوں اور مسلمانوں کے ثبوت میں صرف یہ ایک واقعہ کافی ہے کہ انھوں نے بیت اللہ شریف

ندیموں پر بھی مشتمل نہیں ہوتی تھی۔

اس موقع پر "دہ بور" کا بیان قابل ترجیح ہے کہ بغداد سے فارابی کے نقل مکانی کی وجہ عسرت نہیں بلکہ اس کا یہ اقدام نتیجہ تھا سیاسی فتنوں کا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ زمانہ صرف فتنوں اور ہنگاموں ہی کا زمانہ تھا، انقلابات کا، ہنگاموں کا، فتنوں کا، حوادث کا ایک تسلسل تھا، جو قائم تھا، ایک واقعہ ختم نہیں ہوا کہ دوسرا نمودار ہو گیا، ایک حادثے سے ابھی فرصت نہیں ملی تھی کہ دوسرا نمودار ہو گیا، ایک واقعہ سے اچھی طرح نپٹنے نہیں پاتے تھے کہ دوسرا اس سے کہیں زیادہ لرزہ خیز اور مہلک واقعہ ابھرنے لگا، یہ وہ زمانہ تھا کہ دین اور سیاست میں عجیب قسم کا ارتباط پیدا ہو گیا تھا، ان دونوں میں تفریق کرنا مشکل ہو گیا تھا، یہ کہنا دشوار تھا کہ اس شورش میں دینی جذبہ کام کر رہا ہے یا سیاسی جذبہ فرما ہے؟ اور بغداد ان ساری ہنگامہ آرائیوں اور طغیانیوں کا مرکز تھا، یہیں سے تحریکیں پروان چڑھتی تھیں یہیں جنم لیتی تھیں، یہیں سے ان میں حرکت آتی تھی، جوش پیدا ہوتا تھا، خونریزی روزانہ کا معمول بن گیا تھا، بات بات پر تلوار میان سے باہر نکل آتی تھی، غرض ایک عجیب افراتفری اور بے اطمینانی کا عالم تھا۔

مذہبی اختلافات

مذہبی اختلافات جو درحقیقت اصولی نہیں فروعی تھے بڑھ گئے تھے اور انھوں نے بڑی نازک اور خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔

مثلاً حنابلہ یعنی حنبلی مذہب کے پیروں نے زیادہ شدت اور درشتی اختیار کر لی تھی۔ وہ اپنے مخالفین کے ساتھ بڑا بُرا سلوک کرتے تھے اور انھیں طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں دیتے تھے اس زمانے میں ان کی قوت بڑھی ہوئی تھی، عوام پر بھی ان کا اثر تھا، اور فوج بھی ان سے کافی متاثر تھی، وہ اگر کہیں نبیذ دیکھ لیتے تو وہیں اسے چھین کر زمین پر بہا دیتے تھے، اگر انھیں کوئی مغنیہ نظر آ جاتی تھی تو

فارابی کی ہجرت!

اس پس منظر میں اگر بغداد سے فارابی کی ہجرت پر غور کیجئے، تو اندازہ ہوگا کہ اس نے ترک وطن صرف اس لئے کیا کہ وہ ... سے خائف تھا، وہ ان میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہتا تھا، وہ الگ تھلگ رہ کر سکون اور عافیت کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا، وہ خاص طور پر ابن البریدی کے فتنے سے خائف تھا جس نے ۳۳۰ھ میں بغداد فتح کر لیا تھا، لیکن وہ اپنی فتح مندی اور فیروز مندی پر قانع نہیں تھا، ابن اثیر کی روایت کے مطابق ابن البریدی کی ... زیادتیوں سے عاجز آکر عوام نے بغاوت کر دی، بس پھر کیا تھا آتش زنی، قتل و غارت، کشت و خون اور لوٹ مار کا ایسا سلسلہ شروع ہوا، جو کسی طرح رکنے ہی میں نہیں آتا تھا، دن ہو یا رات، ہر وقت اور ہر آن ہنگامے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے، شورش ہر وقت آمادہ بکار رہتی تھی، فتنہ و فساد کی گرم بازاری کا یہ عالم تھا کہ امن و سکون کا ... میں کسی کو میسر نہیں آتا تھا، اور ابن البریدی پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ قتل و غارت میں مصروف تھا، اس نے جو مظالم کئے جو ستم ڈھائے انکی مثال تاریخ کے صفحات پر ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔

فارابی دمشق میں

یہ رنگ دیکھ کر فارابی نے مجبوراً بغداد کی اقامت ترک کی اور شام کا رُخ کیا، حلب میں جا کر وہ سیف الدولہ کے ... سے وابستہ ہو گیا، وہ سیف الدولہ ہی کے پاس رہا اور اسی کے پاس ... دمشق ۳۳۹ھ میں وفات پائی، اس سے پہلے وہ سیف الدولہ کے ساتھ ... گیا تھا جسے اس نے ۳۳۴ھ فتح کر لیا تھا۔

ابن خلکان کی روایت ہے کہ دمشق میں فارابی کا قیام بہت زیادہ عرصہ تک ... [illegible]

فارابی جتنا بڑا فلسفی تھا اتنا ہی بڑا صوفی اور زاہد بھی تھا، اسے نہ جاہ و مال کی ... اور اولاد کی ... نہ اس نے شادی کی نہ اس کے کوئی اولاد ہوئی۔

سے حجر اسود اکھاڑ لیا، اگرچہ پھر بعد میں وہ واپس اپنی اصلی جگہ پر آویزاں کر دیا گیا
لیکن انھوں نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی،

یہ فتنے مذہبی حیثیت بھی ایک اعتبار سے رکھتے تھے اور سیاسی حیثیت بھی
پھر تصوف کی شاخسار سے منصور حلاج کا شگوفہ پھوٹا، حلاج کے پیرووں نے بھی
ایک طرف تو اپنے مرشد کے عجائب و غرائب کو شہرت دی، دوسری طرف امن عامہ میں
خلل انداز ہوئے، یہاں تک کہ مقتدر باللہ کو فتنے کا اندیشہ محسوس ہوا، اس نے
حیلہ سے اسے قتل کر دیا، اور اس طرح پھر ایک نئی اور فتنہ انگیز مثال قائم ہو گئی
ان ہنگاموں اور فتنوں نے عوام میں اور خواص میں ایک عجیب قسم کا اضطراب پیدا
کر دیا تھا اور یہ جو فتنے مذکور ہوئے وہ دینی اور مذہبی نوعیت کے تھے ان کے ساتھ ہی
سیاسی فتنے بھی سر ابھار رہے تھے۔

سیاسی فتنے

ان سیاسی فتنوں کو سر اٹھانے اور پنپنے کا موقع اس لئے ملا کہ
مقتدر باللہ کا دبدبہ کمزور ہو گیا تھا، اور اس خلیفہ کے بعد جو
دوسرے خلفاء مسند خلافت پر متمکن ہوئے وہ اپنے پیش روؤں سے بھی زیادہ ضعیف
اور کمزور تھے، یہ صورت حال دیکھ کر امرا اور عمال کے منہ میں پانی بھر آیا، وہ اپنے
اور اپنے حوالیوں موالیوں کے اقتدار اور حکومت کے لئے راستہ صاف کرنے لگے
چنانچہ انھوں نے متعدد بار بغداد پر حملہ کیا، چنانچہ اس دور کی تاریخ پر نظر ڈالئے
تو آپ دیکھیں گے کہ خلیفہ مقتدر باللہ، خلیفہ راضی باللہ اور خلیفہ مکتفی باللہ کا دور تو
قسمت آزمائیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا دور ہے ایک کے بعد ایک امیر [illegible]
ایک ہنگامہ کے بعد فوراً ہی دوسرا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے، ایک بات دبتی ہے
کہ دوسری ابھرنے لگتی ہے۔

هذب بفيض منك رب الكل من
كدر الطبيعة والعناصر عنصري

اے وہ ذات جو تمام اشیاء کی علت ہے۔
اور جس سے چشمۂ فیض جاری ہے،
اے تہ در تہ آسمانوں اور ان کے درمیان،
جو زمین و سمندر ہیں،
ان کے مالک،
میں نے تجھے تیری پناہ طلب کرنے والے عاصی کی حیثیت سے پکارا،
تو مجھ عاصی و خاطی کی خطا معاف فرما دے،
اور اے رب الکل اپنے فیض و رحمت سے طبیعت کا تکدر،
اور عناصر کی تکالیف مجھ سے دور کر دے۔
پھر کہتا ہے:-

لما ائتيت الزمان نكسا
وليس في الصحبة انتفاع
كل رئيس به ملال
وكل راس به صداع!
لزمت بيتي وصنعت عرضا
به من العزة اقتناع
اشرب مما اقتنيت راحا
لها على راحتي شعاع
لي من قواريرها ندامي

وہ اگر چاہتا تو سیف الدولہ کے حضور میں رہ کر، مالی اور دنیاوی اعتبار سے
ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا، اس نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا، مگر
صرف چار درہم پر اپنی زندگی بسر کرتا تھا، جب کوئی خاص ضرورت پیش آتی
رقم میں سے صرف کرتا۔

فارابی بڑا خود دار، اور خود شناس شخص تھا، وہ نہ چاپلوسی کرتا تھا، اور
داری، وہ نہ وطن کی محبت میں گرفتار تھا، نہ مال و دولت سے اسے کسی قسم کا لگاؤ
تھا، ان دونوں پر وہ صرف علم کو ترجیح دیتا تھا، علم ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھا
علم ہی سے وہ اپنی زندگی کا تانا بانا بنتا تھا، یہ بات ثابت ہے کہ ساری عمر
جو شخص سب سے زیادہ صاف گو اور بیباک تھا، وہ یہی فیلسوف کامل تھا۔

فارابی کے اشعار!

فارابی سے کچھ شعر بھی منسوب ہیں جن میں فلسفہ و حکمت
کا رنگ بھی جھلکتا ہے، ان اشعار سے معلوم ہوتا
کہ وہ عزلت نشینی اور گوشہ گیری کو بہتر اور ہنگامہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ
کرتا تھا، نیز یہ کہ لوگوں کے بارے میں اس کی رائے کچھ بہت زیادہ اچھی نہ
بلکہ ایک حد تک بری ہی تھی۔

ذیل میں فارابی کے چند اشعار نمونۃً درج کیے جاتے ہیں:۔

یا علۃ الاشیاء جمعاً والذی
کانت بہ من فیضہ المنفجر
رب السموات الطباق ومرکز
فی وسطھن من الثری والابحر
انی دعوتک مستجیراً مذنباً
فاغفر خطیئۃ مذنب ومقصر

ومن زجاجة ملئت بحکمہ
فبذا ادوّن حکمتی
وبذا ازیل هموم صدری

دو پیالوں ہی میں نے اپنی عمر گزار دی،
اور انہیں پر سارے معاملات کا انحصار کر بیٹھا،
ایک پیالہ روشنائی سے لبریز،
اور دوسرا شراب سے بھرا ہوا ہے،
ایک سے فلسفہ و حکمت کی تدوین کرتا ہوں،
اور دوسرے سے اپنے دل کے غم کو دور کرتا ہوں۔

فارابی کا مجموعۂ اشعار! ابن خلکان کا بیان ہے کہ اس نے ایک مجموعۂ اشعار میں فارابی سے منسوب چند اشعار دیکھے ہیں جو یہ ہیں۔

اخی خل حیّز ذی باطل
وکن للحقائق فی حیّز
فما الدار دار مقام لنا
وما المرء فی الارض بالمعجز!!
ینافس هذا، لهذا علیٰ
اقل من الکلم الموجز
وهل نحن الا خطوط وقعن
علیٰ نقطة وقع مستوفز

ومن قرا قيرها سماع!
واجتني من حديث قوم
قد اقفرت منهم البقاع

جب میں نے زمانے کو منقلب پایا،
اور دوستوں سے کوئی نفع نہ دیکھا،
ہر سردار کے اندر گریز،
اور ہر سر میں درد پایا،
تو میں اپنے گھر میں بیٹھ رہا اور،
اس طرح اپنی عزت و آبرو بچالی،
اب اپنی بچائی ہوئی شراب پی رہا ہوں،
جو میرے لئے سب سے اچھی ہے،
اس کے پیالوں سے مجھے انس ہے،
اور اس کی آواز سے دلچسپی،
اور میں ان لوگوں کے واقعات جمع کر رہا ہوں،
جو اس دنیا سے گذر چکے ہیں۔
فارابی کے اشعار میں فلسفیانہ رنگ بھی تھا۔
کہتا ہے:-

بزجاجتين قطعت عمری
وعليهما عولت امری
فزجاجة ملئت بجبر

شراب کا ذکر کیا گیا ہے یہ چیزیں بھی فارابی کی طبیعت اور انداز سے ذرا ہٹی ہوئی، اور غیر مانوس سی نظر آتی ہیں۔

فارابی کی زندگی!

اس میں کوئی شبہ نہیں فارابی لوگوں سے الگ تھلگ رہتا تھا اسے تنہائی پسند تھی، لیکن اس عزلت اور تنہا پسندی کا مقصد دنیا بیزاری اور مردم بیزاری نہیں تھا، بلکہ بہ اور صرف یہ تھا کہ وہ اپنے نفس کی تقویم کر سکے اور اس کی خواہش کو صرف حق کے لئے مائل کر سکے، چنانچہ جب وہ اپنی تقویم نفس میں کامیاب ہو گیا تو اس نے دوسروں کی اصلاح نفس کا کام سرانجام دینے کی سعی شروع کر دی، اور نہ طبعاً فارابی نہ دنیا سے نفور تھا نہ لوگوں سے بیزار تھا، جہاں تک شراب کا تعلق ہے ہمیں جو کچھ تحقیق ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ وہ شراب نہیں پیتا تھا یہ کھلی ہوئی بات ہے، ایسا شخص جس نے دنیا کی رغبتوں سے منہ موڑ لیا ہو، اور لہو و لعب میں کوئی حصہ نہ لیتا ہو، وہ شراب کے جام سے کیا دلچسپی لے سکتا ہے؟

وفات کہاں ہوئی؟

مورخین کا بڑا طبقہ اس پر متفق ہے کہ فارابی کی وفات دمشق میں ہوئی، وفات کا سال ۳۳۹ھ ہے، ابن ابی اصیبعہ نے بھی یہی روایت کی ہے۔ ابن ابی اصیبعہ کا قول ہے کہ:-

"جب فارابی کی وفات ہوئی تو سیف الدولہ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی، اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ امیر سیف الدولہ حمدانی فارابی کی وفات کے وقت دمشق میں موجود تھا۔"

ابن اثیر کا کہنا ہے کہ فارابی کی وفات کے وقت دمشق سیف الدولہ کے قبضہ میں نہیں تھا، اس پر کافور اخشیدی کا قبضہ تھا اور سیف الدولہ حمدانی صرف حلب پر حکمران تھا، اس بیان سے ابن ابی اصیبعہ کا بیان شک میں پڑ جاتا ہے۔

بیہقی کی افسانہ طرازیاں

بیہقی کی روایت ہے کہ فارابی دمشق سے عسقلان چلا گیا تھا، راستہ میں اسے رہزنوں نے گھیرا اس

محیط السمٰوات اولیٰ بنا
فماذا التنافی فی مرکز

اے برادر! باطل سے گریز کر
اور جویائے حقیقت بن جا،
اس لئے کہ یہ دار دارِ قرار و قیام نہیں ہے،
اور نہ انسان زبین پر بے اختیار و عاجز ہے،
ذرا ذرا سی بات پر
وہ ایک دوسرے سے لڑتا رہتا ہے،
حالانکہ ہماری حیثیت ان خطوط سے مختلف نہیں ہے،
جو ایک نقطہ پر جاکر مجتمع ہو جاتے ہیں،
ہمارے لئے آسمانوں کا احاطہ کرنے والا سب سے بہتر مرجع ہے۔
مرکز میں تنافی و تضاد تو ہے نہیں ۔

اشعار کی نسبت صحیح ہے یا غلط؟

ان اشعار کے بارے میں ابن ...
کہتا ہے کہ مجھے شک ہے ...
واقعتہً فارابی کے ہیں بھی یا نہیں؟ میں نے ان اشعار کو ایک مجموعۂ اشعار میں دیکھا ...
جو محمد بن عبدالملک الفارقی البغدادی کی طرف منسوب ہے، اس میں زیادہ ...
صدی ہجری کے شعراء کا کلام ہے!"
ان اشعار کا بڑا حصّہ ہمارے نزدیک فارابی کا نہیں ہے، غلط طور پر ...
طرف منسوب ضرور ہے، اس لئے کہ ان اشعار کے اسلوب میں جو "تکلف" ...
فلسفیانہ، اسلوب سے بالکل مختلف ہے، علاوہ ازیں ان اشعار میں زندگی ...
بے رغبتی دکھائی گئی ہے اور جس مردم بیزاری کا مظاہرہ کیا گیا ہے، اور جس ...

ے پہلی جو بات ہمیں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ فارابی ایک زاہد شخص تھا، اسباب دنیا ے نہ اسے دلچسپی تھی، نہ یہ ساز و سامان وہ اپنے پاس رکھتا تھا، لیکن بیہقی کی روایت اگر مان لی جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ بڑے دبدبے اور طنطنہ کا آدمی تھا، اس کے پاس سواری کے لئے گھوڑے بھی تھے، لڑنے کے لئے ساز و سامان جنگ بھی تھا، ہتھیار اور اسلحہ بھی موجود تھے، کپڑوں کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ تھا، راوی نے صرف ان ہی باتوں پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے گرد فرضی پوری داستان سنا ڈالی، ظاہر ہے یہ ساری کہانی من گھڑت ہے، حقیقت واقعہ سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

ایک اور بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے۔

بیہقی کی یہ روایت اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ سیف الدولہ کے شاعر متنبی کے واقعہ قتل سے ملتی ہوئی ہے، متنبی کی داستان کو راوی نے بڑی آسانی سے فارابی پر چسپاں کر دیا۔

بیہقی نے فارابی غریب کے متعلق کیا کیا افسانے تراشے ہیں ان کا اندازہ ذیل کی روایت سے ہو گا۔

بیہقی کہتا ہے :۔

ایک حکایت مشہور ہے کہ ابو نصر فارابی پر مرض مالیخولیا کا اثر ہو گیا تھا، وہ ایک مرتبہ دجلہ کے کنارے کنارے جا رہا تھا کہ ایک آدمی کھجور بیچتا ہوا نظر آیا، فارابی نے اس سے پوچھا کھجوریں کس طرح ہیں؟ کھجور والے نے جواب میں نرخ بتا دیا، فارابی نے اسے ٹھونگ دیا اور کہا "میں تم سے کیفیت پوچھتا ہوں اور تم کمیت بتاتے ہو؟"۔

۱؎

نے اُن سے کہا :۔

"میرے پاس سواری ہے اسلحہ ہیں، یہ سب لیلو اور میرا راستہ چھوڑ دو۔"

رہزنوں نے یہ چیزیں لے کر اسے چھوڑنے سے انکار کیا کیونکہ وہ اسے قتل کرنے کا ارادہ کر رہے تھے، جب اس نے دیکھا کہ یہ کسی طرح اپنے ارادہ سے باز نہیں آتے تو وہ سواری سے اتر پڑا اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا، چنانچہ جنگ ہوئی اور اس جنگ میں وہ اپنے رفقاء سمیت رہزنوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا، یہ خبر جب ... پہنچی تو رہزن پکڑے گئے، انہیں پھانسی دیدی گئی اور ابونصر فارابی کی لاش ... لا کر یہاں دفن کی گئی۔ اسی کی قبر پر ان رہزنوں کو پھانسی دی گئی۔

لیکن یہ داستان ناقابل یقین ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں مسعودی مورخین ... اعتبار سے سب سے زیادہ فارابی سے قریب ہے کیونکہ وہ فارابی کا معاصر ... فارابی کی وفات کے وقت وہ زندہ تھا، اور اس کے کئی سال کے بعد ... ہوا، لہذا اس موضوع پر اس کا بیان سب سے زیادہ مستند اور صحیح ہو سکتا ہے ... مسعودی نے اس قصہ کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا ہے اگر یہ واقعہ ہوتا تو ... کہ مسعودی اسے فراموش کر دیتا اور اس کا ذکر نہ کرتا، وہ فارابی کی وفات کا ذکر ... ہے، تاریخ وفات کا ذکر کرتا ہے، لیکن بیہقی نے جو روایت کی ہے ... اشارہ بھی نہیں کرتا، علاوہ ازیں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ... اس قصہ کا کہیں ذکر نہیں کرتا، بلکہ تمام دوسرے مورخین بھی یکسر خاموش ہیں ... تو اس کہانی کی تصدیق پر آمادہ نہیں نظر آتا، صرف تن تنہا بیہقی نے یہ روایت ... ہے اور شہرزوری نے بیہقی ہی سے لیکر اسے نقل کر دیا ہے۔

بیہقی کی روایت کی تفصیل میں اگر جائیے تو صدق دور ہوتا جائے ... شک قریب تر آتا جائے گا، اس روایت کو اگر تحقیق کی کسوٹی پر کیا جائے ...

انتخابِ کلامِ میر

میر اپنے رنگ کے یکتا اور بے ہمتا شاعر تھے، ان کے کلام میں سوز ہے، درد ہے، تڑپ ہے، ان کے منہ سے جو بول نکلتے ہیں، وہ بیانِ درد کی ایسی تصویر ہوتے ہیں کہ سننے والا کلیجہ تھام کر رہ جاتا ہے، سچ ہی تو کہا ہے انھوں نے اپنے کلام کے بارے میں،

جہاں سے دیکھئے اک شعر شور انگیز اٹھے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

دیوان کے اکثر اشعار میں قیامت کی ہنگامہ آفرینی پوری فتنہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔

کسی شاعر کا بھی سارا کلام اچھا نہیں ہوتا، میر کا طویل کلیات بھی حشو و زوائد سے خالی نہیں ہے، لیکن جہاں انھوں نے وارداتِ قلب، وارداتِ محبت بیان کئے ہیں تمام ہم سفروں سے آگے نکل گئے ہیں، ذیل میں کلام میر کا عطر مجموعہ" پیش کیا جاتا ہے:

ہمارے خیال میں بیہقی کی اس روایت پر تحقیق یا تنقید کرنا بے سود ہے
اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ روایت بھی بیہقی کی مذکورہ بالا افسانہ کی قبیل کی ہے۔

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی — تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

پر ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا — انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا
جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا — منہ تکیے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا
جس روز وہ دل زدہ دلی میں نکلتا — ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
دیوانہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک — آندھی تھا، بلا تھا، کوئی آشوب جہاں تھا

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا — ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

اب نام کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا — جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیر نگیں تھا
مسجد میں امام آج ہوا آ کے وہاں سے — کل تک تو یہی میر خرابات نشیں تھا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

تھے برے مغبچوں کے تیور لیک — شیخ میخانے سے بھلا کھسکا
ہم کسی کو جو حال میر سنے — حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

کیوں کر لوگ سے مانے یار کہ یہ عاشق ہیں — رنگ اڑ جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا / مستند ہے میرا فرمایا ہوا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا / دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں / تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر / اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھ

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ / نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

گل کی جفا بھی دیکھی، دیکھی وفائے بلبل / اک مشت پر پڑا تھا گلشن میں جائے بل

کیوں کر گلی سے اس کی اٹھ کر میں چلا جاتا / یاں خاک میں ملنا تھا، لوہو میں نہا
کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا منہ / کل میرؔ کھڑا تھا یاں، سچ ہے کہ دوا

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں / بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھ

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے / اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتش دل / ایک دو آنسو تو اور آگ لگا دیتے

اب کی جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے / دامن کے چاک اور گریباں کے

…ایک تیر شکستہ پا، ترے باغ تازہ میں خار تھا

…ے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ   پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

…وں میں تجھ سے یہی سب ناکس و نااہل   اس باغ میں ہم نے گل بے خار نہ پایا

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا،   آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
…کافر تھا جن نے پہلے میرؔ   مذہب عشق اختیار کیا

…دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

…کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا   وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا
…ون ہو آنکھوں کی راہ بہ نکلا   رہا جو سینۂ سوزاں میں داغدار رہا
…ے گیا سو گیا نہ بولا پھر   میں، میرؔ، میرؔ کر اس کو بہت پکار رہا

…تک بھی مذکور ہے ہمارا   افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا

…نزدیک رہا ہے مرا وطن   سنکر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

…آنکھوں میں کب نہیں آتا   لہو آتا ہے جب نہیں آتا!

موجیں کرے ہے بحر جہاں میں ابھی تو تو   جانے گا بعد مرگ کہ عالم حباب ت

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں   میرؔ کو تم عبث اداس کیا!

داغِ فراق و حسرتِ وصل، آرزوئے شوق
میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گ

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا
مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلو تھا م
لغزش بڑی ہوئی تھی ولیکن سنبھل گ

تمہیں تو زہد و ورع پر بہت ہے اپنے غرور
خدا ہے شیخ جی ہم بے گناہ کا بھی

یک قطرہ، خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا   قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ ک

ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک   سر سے سودائے جستجو نہ گ
سبحہ گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے   دستِ کوتاہ تا سبو نہ گ

کہو جائے گی جو اُدھر صبا! تو یہ کہیو اس سے کہ بے وفا

کس کو مرے حال سے تھی آگہی — نالۂ شب، سب کو خبر کر گیا

دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم — یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا

خوش رہا جب تلک رہا جیتا — میرؔ معلوم ہے قلندر تھا

گردش زمانہ کی جہاں میں مجھکو — جاہ و ثروت کا میسر سر و ساماں نہوا
شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب — کسی عنوان میں ہم چشم عزیزاں نہ ہوا

تمام رونے سے اکثر ہے تا صبح — تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا
لے میرؔ مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو — تو کب تک یہ موتی پرونا رہے گا!

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا — اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

ترے کوچے کے رہنے والوں نے — یہیں سے کعبہ کو سلام کیا
عشق خوباں کو میرؔ، ہم اپنا — قبلہ و کعبہ و امام کیا

سرت میں ملامت ہم نگوں بختوں کے تئیں
ہوں حباب بادہ ساغر سرنگوں ہو جائے گا،

محبت ہم کو دانست پر اپنی بھی — آخر وہ برا نکلا ہم جس کو بھلا جانا

ہوش جاتا نہیں رہا لیکن　　جب وہ آتا ہے تب نہیں
صبر تھا ایک مونسِ ہجراں　　سو وہ مدت سے اب نہیں
جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم　　پر سخن تا بہ لب نہیں

سحر گہ عید میں دورِ سبو تھا　　پر اپنے جام میں تجھ بن لہو

دل مجھے اس گلی میں لے جا کر　　اور بھی خاک میں ملا

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ زماں سے کر
کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہو گا
کہے ہیں میرؔ کو مارا گیا شب اس کے
کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے

بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر　　سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز

کہیے گا اس سے قصۂ مجنوں　　یعنی پردے میں غم سنا

معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر　　مسجد میں ہے کیا شیخ؟
دیکھے ہے مجھے دیدۂ پرخشم سے وہ میرؔ　　میرے ہی نصیبوں میں

شریف مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ　　یہ میرؔ اب جو گدا ہے

صاحب جو مار ڈالو مجھے تم دگر نہ کچھ
جز عاشقی گناہ نہیں ہے غلام کا

…ی سرگوشی یا بات نہیں گاہے
اوقات ہے اک یہ بھی اک وہ بھی زمانہ تھا

…نے کیا کیا نہ درد رات دیئے
جیسے پکتا رہے کوئی پھوڑا !

…گے سو سچ ہے ولے دے فروش کر
ہم ذکر بھی سنا نہیں صوم و صلوٰت کا

نحن مشتاق ہے عالم ہمارا
غنیمت ہے جہاں میں دم ہمارا
…کے رہتے ہیں دل پر ہاتھ اے میر
یہیں شاید کہ سب غم ہے ہمارا

…ے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
…تحمر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا
ہائے جوانی کیا کیا کہیے، شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے وہ عہد گیا، وہ موسم وہ ہنگام گیا

…رقی بے صدا چبھتی ہے دل میں
بلبل سے کوئی سیکھ لے انداز سخن کا

…ب دیر تک آیا تھا لیکن
ہمیں رستہ نہ کعبے کا بتایا

…چاہنے والوں سے اپنے
نہ جانے تجھ سے یہ کن نے کہا تھا

لے شور قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں   اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جا

جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں   وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا

مسجد ایسی بھری بھری کیا ہے   میکدہ اک جہان ہے گویا

بارے مستوں نے ہوشیاری کی ،   دے کے کچھ محتسب کا منہ

کام میں قدرت کے کچھ بولا نہیں جاتا ہے ہائے
خوبرو اس کو کیا، لیکن بہت بد خو کیا

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو   دیر سے انتظار ہے اپنا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات   اب یہی روزگار ہے اپنا

جس کو تم آسمان کہتے ہو   سو دلوں کا غبار ہے اپنا

کل میں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا   دل نے جگر کی اور اشارت کی

تڑپے ہے جبکہ سینے میں اچھلے ہے دو دو ہاتھ   گر دل یہی ہے میر تو آرام ہو چکا

کچھ زرد زرد چہرہ، کچھ لاغری بدن میں   کیا عشق میں ہوا ہے اے میر حال

اس غفیلے سے کیا کسو کی نبھے
مہربانی ہے کم عتاب بہت

رابطہ غارت دل تلک بس
نہیں اب تو بندے سے صاحب سلامت

میرے سنگ مزار پر فرہاد
رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد
نئے ٹک سنو کہ پھر مجھ بعد
نہ سنو گے یہ نالہ و فریاد

بت قصر و در و بام و خشت و گل کتنا
عمارت دل درویش کی رکھو بنیاد

لے دن کمکی کے باندھنے کے!
اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

دم وحشت محبت میں نہ رکھ میر
کہ سر جاتا ہے گام اولین پر!

رنگ ک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
سا لوگ نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

چپ رہا جو میں بولا
کس کا قصہ تھا ہاں کہے جا میر

ہے عاشق و بوالہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

ملے برسوں وہی بیگانگی تھی　　ہمارے زعم میں وہ آشنا تھا
صنم خانے سے اٹھ کعبے گئے ہم　　کوئی آخر ہمارا بھی خدا تھا

دے تو کھوڑے کھڑے مرے گھر آکے پھر گئے　　ہیں بے دیار و بے دل و بے خانماں ہو

نے چاہ وہ اسے ہو نہ مجکو ہے وہ دماغ　　جانا مرا اُدھر کو بشرط طلب ہے اب

ہر جنس کے خواہاں ملے بازار جہاں میں　　لیکن نہ ملا کوئی خریدار محبت

کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم　　ہے خدا جانیے یہ کب کی بات
گو کہ آتش زباں تھے آگے میرؔ　　اب کی، کہیے گئی وہ تب کی بات
کہتے تھے اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے لیک　　وہ آ گیا تو سامنے اس کے نہ آئی بات
اب مجھ ضعیف و زار کو مت کچھ کہا کرو　　جاتی نہیں ہے مجھ سے کسو کی اٹھائی بات

ملامت گر نہ مجکو کر ملامت　　جلے کو اور تو اتنا جلا مت
تری ناآشنائی کے ہیں بندے　　نہ وہ اب ربط نے صاحب سلامت

پھول گل شمس و قمر سارے ہی تھے　　پر تمھیں ان میں ہمیں بھائے بہت
میرؔ سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم　　ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

اب تو وفا و مہر کا مذکور ہی نہیں　　تم کس سمے کی کہتے ہو یہ کہاں

ے شب آگ سا دیکھا سلگتے　　اسے پھر خاک ہی پایا سحر تک

ائی پر ایک پتی بھی گل کی،　　نہ آئی اسیران بے بال و پر تک

یوں نہ دیکھوں چمن کو حسرت سے　　آشیاں تھا مرا بھی یاں پر سال

ے بخی کہاں تک غیروں کی اور آخر　　ہم بھی تو آدمی ہیں ٹک منہ ادھر کرو تم

ے نہاں اسقدر جفا ہم پر　　عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میرؔ　　گویا اک جنس ناروا ہیں ہم!

ر آؤ تم کو چاہیں دیکھیں تو تم کو دیکھیں　　خواہش دلوں کی تم ہو آنکھوں کی آرزو تم

ے کی بے خودی کچھ آج نہیں　　ایک مدت سے وہ مزاج نہیں
نے اپنی سی کی بہت لیکن　　مرض عشق کا علاج نہیں
شہر خوبی کو خوب دیکھا میرؔ　　جنس دل کا کہیں رواج نہیں

شکی آتی ہیں آج یوں آنکھیں　　جیسے دریا کہیں ابلتے ہیں!

کی ڈالی بناکے لاؤں لیک　　یاد رہتی ترے حضور نہیں

مرنے پہ جان دیتے ہیں وارفتگان عشق — ہے میرؔ راہ و رسم دیار وفا کچھ اور

مبارک تمھیں میرؔ ہو عشق کرنا، — بہت ہم تو پچھتائے دل کو لگا کر

پڑتے نگہ اس شوخ کی ہوتا ہے یہ احوال — رہ جائے ہے جیسے کہ کوئی جی ڈر

مانگ پناہ خدا سے بندے، دل لگنا اک آفت ہے
عشق نہ کر زنہار نہ کر واللہ نہ کر باللہ نہ کر

بزم میں منہ ادھر کریں کیونکر — اور نیچی نظر کریں کیوں کر
یوں بھی مشکل ہے ووں بھی مشکل ہے — سر جھکائے گذر کریں کیوں کر

اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی — ہوتا ہے شوق غالب اس کی نہیں

کنج قفس میں جوں توں کاٹیں گے ہم اسیراں
سیر چمن کے شایاں اپنے نہیں رہے

غصے میں عالم اس کا کیا کیا نظر پڑا ہے
تلواریں کھنچتیاں تھیں اس کی جبیں کی

میرؔ جی زرد ہوتے جاتے ہو — کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے

...مقدس آدمی ہیں، تھے سجدہ یکبف میخانے میں
صبح جو ہم بھی جا نکلے دیکھ کے کیا شرمائے ہیں

...ہے دور بھی پاتا ہوں اے شام کو تند
...ہے جو کچھ میری دعا مت پوچھو!
ہوش و صبر و خرد و دین و حواس و دل و تاب
اس کے اک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو
...آرزوئے دل جو لگے پوچھنے لوگ
...کی ادھر اُن نے کہا مت پوچھو!
خواہ مارا اُنھیں نے میرؔ کو یا آپ موا،
جانے دو یارو جو ہونا تھا ہوا مت پوچھو

...کی طرز نگاہ مت پوچھو! جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو

...لکھے گئے یاں سے ان نے اک حرف بھی لکھا نہ کبھو
...چمن تھے گل! غنچۂ دل تو وا ہوا نہ کبھو!

...اِبر ہو سبو بھی ہو گل ہو گلشن ہو اور تو بھی ہو
...کا یہ حسن قبول منہ ترا اس طرف کبھو بھی ہو

...کا ہو نہ سکا! دل سے اپنے ہمیں گلہ ہے یہ

ہماری تو گذری اسی طور عمر — یہی نالہ کرنا یہی زاریاں
فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا — مری آہ نے برچھیاں ماریاں
خط و کاکل و زلف و انداز و ناز — ہوئیں دام رہ صد گرفتاریاں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں — کھنچیں میرؔ تجھ سے ہی یہ خواریاں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میرؔ — اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

ہیں تو خوباں کو جانتا ہی ہوں — پر مجھے بھی یہ خوب جانے ہیں

قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور — اب مرے عہد میں فسانے ہیں
مشک و سنبل کہاں وہ زلف کہاں — شاعروں کے یہ شاخسانے ہیں
عشق کرتے ہیں اس پری رو سے — میرؔ صاحب بھی کیا دوانے ہیں

کچھ تمہیں ملنے سے بیزار ہو میرے ورنہ — دوستی ننگ نہیں، عیب نہیں، عار نہیں

تم کہو میرؔ کو چاہو سو، کہ چاہیں ہیں تمہیں
اور ہم لوگ تو سب ان کا ادب کرتے ہیں

گو کہ بت خانے جا رہا ہوں میں — بخدا با خدا رہا ہوں میں

کروں شرح خستہ جانی کی ﴿﴾ میں نے مر مر کے زندگانی کی !
گفتنی نہیں میرا ﴿﴾ تم نے پوچھا تو مہربانی کی !

نے جو اپنے دل سے بھلایا ہمیں تو کیا
نے نقش تو دل سے ہمارے بھلائیے
پہنچا تو ہوگا سمع مبارک میں حال میر
اس پر بھی جی میں آئے تو دل کو لگائیے

میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں ﴿﴾ تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی،
گریہ نہ کر تو اے ناصح ﴿﴾ اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

کی یاں تک کہ اے بت تجھے ﴿﴾ نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

تو ہونٹ بھی نہ ہلے اس کے روبرو
رنجش کی وجہ میر وہ کیا بات ہوگئی

کس جگہ دور جام ہوتا ہے ﴿﴾ واں یہ عاجز مدام ہوتا ہے
ہم اک حرف کے نہیں ممنون ﴿﴾ کیسا خط و پیام ہوتا ہے
تب بھی اس کے ہاں نتے پر ﴿﴾ جیسے کوئی غلام ہوتا ہے

در بار تیرے صدقے جائیے ﴿﴾ دریا کا ہیبر پائیے تیرا نہ پائیے

ہستی اپنی حباب کی سی ہے   یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے   پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میں جو بولا، کہا کہ یہ آواز   اسی خانہ خراب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں   ساری مستی شراب کی سی ہے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے   اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر

جبکہ پہلو سے یار اٹھتا ہے   درد بے اختیار اٹھتا ہے

دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج   گرا گر یہ شیشہ تو پھر چور ہے
بہت سعی کریئے تو مر رہیئے میر   بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

اے شب ہجر راست کہہ تجکو   بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے

اداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابل سیر   صنم کدے میں تو ٹک
گزار شہر وفا میں سمجھ کے کر مجنوں!   کہ اس دریا میں میر

تا دم مرگ غم خوشی کا نہیں   دل آزردہ گر سلامت ہے
تجکو مسجد ہے مجکو مے خانہ   واعظا اپنی اپنی قسمت ہے
تربت میر پہ ہیں اہل سخن   ہر طرف حرف ہے حکایت ہے
تو بھی تقریب فاتحہ سے چل   بخدا واجب الزیارت ہے

جب سامنے گئے، ہم، ہم نے اسے دعا دی
شکل ان نے دیکھتے ہی غصہ کیا زباں کی

مسجد میں تو شیخ کا فروشاں دیکھا   میخانے میں جوش بادہ نوشاں دیکھا
اک گوشۂ عافیت جہاں میں، ہم نے   دیکھا تو حملۂ خموشاں دیکھا،

جس وقت شروع یہ حکایت ہو گی   رنجیدگی یک دگر نہایت ہو گی
احوال وفا کا اپنی ہرگز مجھ سے   مت پوچھ کہ کہنے میں شکایت ہو گی

تم چھیڑتے ہو بزم میں مجکو تو ہنسی سے   پر مجھ پہ جو ہو جائے ہے ...

باولے سے جب تلک بکتے تھے سب کرتے تھے پیار
عقل کی باتیں کیاں کیا ہم سے نادانی ...

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں ؟
منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک ...

گرامی گہر میرجی تھا ہمارا   ولے عشق میں قدر ...

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ   افسوس تم کو میر سے صحبت ...

ہیں اس کی جدائی میں تصدیع بہت پائی
درد دلیشی و کم پائی بے صبری ...
تھا صبر و سکون جب تک رہتا تھا مجھے غش سا
بے تابی دل سر پر اک اور ...

مجکو مارا بھلا کیا تو نے   پر وفا کا برا کیا تو نے

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ   اب توقع نہیں ...

تجھ سے گر وہ دلا نہیں ملتا — زہر بھی تجھ کو کیا نہیں ملتا
اور سب کچھ جہاں میں ملتا ہے — لیکن اک آشنا نہیں ملتا
بے نمک چھڑکے زخم پر اپنے — ہم کو کچھ بھی مزا نہیں ملتا
دم اگر ہو مجھے غنیمت جان — عاشقِ باوفا نہیں ملتا
جب یہ پوچھا کہ مصحفی سے بھلا ق — کیوں تو اے بے وفا نہیں ملتا
ہنس کے بولا کہ او میاں اس سے — کیا کروں دل مرا نہیں ملتا

جی جائے گا رائے گاں کسی کا — یوں کرتے ہیں امتحاں کسی کا
جز آہ وہاں کوئی کرے کیا — کچھ بس نہ چلے جہاں کسی کا

قصہ کہوں کیا دلِ بیمار کا — عشق کی تب تھی نہ بچا مر گیا

سوجھا نہ ہمیں خاک بھی کچھ بے بصری سے — یاں ورنہ ہر اک ذرے میں خورشید عیاں تھا
اک چھپکا ہے سر کوئی جان کھونا ہے — ترے خرام نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا

اے شیخ مصحفی کے کہتے ہیں لوگ افسوس — کیا مفت میں گیا ہے یہ نوجوان مارا

دور سے اس کے حجاب کس دن تھا — درمیاں میں نقاب کس دن تھا
لطف کرتے تھے مجھ پہ ہر دم تم — جانِ من یہ عتاب کس دن تھا
حادثے ہوتے ہیں زمانے میں — اس قدر انقلاب کس دن تھا
مصحفی اس کام کا ہے تو ورنہ — قتلِ عاشق ثواب کس دن تھا

مُصحفی

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ، اپنے وقت کے مانے ہوئے استاد تھے، مصحفی کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ فقر و فاقہ سے مجبور ہو کر وہ اپنے اشعار مشاعرہ بازوں کے ہاتھ فروخت کر دیا کرتے تھے،

اگر یہ روایت، قصۂ جام جمشید، اور آئینۂ سکندر کی طرح محض خیال آرائی نہیں ہے بلکہ حقیقت اور واقعہ ہے، تو بھی ماننا پڑے گا مصحفی نے جو کچھ بیچنے کے قابل تھا، بیچ دیا، لیکن،

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

مصحفی کے دیوان کا اگر بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے، تو اس میں خزف ریزوں کے ساتھ ہیرے اور جواہر بھی ملیں گے، ہم نے اپنی نظر کے مطابق خزف ریزے الگ رکھ دیے ہیں، اور ہیرے جواہرات کا یہ چھوٹا سا بازار سجایا ہے۔

بہار آئی خدا جانے کہ کیا گزری اسیروں پر
نہیں معلوم کچھ اب کی برس احوال [illegible]

وے داد مری ورنہ میں کہہ بیٹھوں گا قاتل
کل حشر کے دن بھی مرا خونخوار [illegible]

دیکھا مجھے کوچے میں جو اپنے تو وہ بولا
لاؤ اسے، کل بھی پس دیوار [illegible]

تیوری کو چڑھائے وہ کبھی آگے سے مرے
جاتا ہے تو کہتا ہوں مرا یار [illegible]

کیوں قتل کیا مصحفیؔ خستہ کو تو نے
کیا چاہنے والوں میں گنہ گار [illegible]

ے یار کی قاصد مرا شتاب آیا — جواب صاف ملاحظ کا یہ جواب ملا
ار اب تو اسیر قفس کو اے صیاد — کلی چٹکنے لگی رنگ پر گلاب آیا

یا الٹا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا — یہ منہ مجھے تیرا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
ے عشق بعضے مرے کہنے کے ہیں قائل — بعضوں کا مقولہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کل دن میکدہ میں یہ صحبت ہوئی کہ رات — زاہد کے سر سے بقچہ دستار لے گیا
ے عشق گریباں سارا لہو سے تر ہے — یہ رنگ اپنا ظالم تو نے کہاں بنایا

کی اب تو میری جانب سے — اوس کے دل میں غبار رہنے لگا

دلا تیرے کوچے میں آنا نہیں ملتا — آوُں تو کہیں تیرا ٹھکانا نہیں ملتا

سانے تو تیرے عشق میں کیا کیا نہیں کیا — سب کچھ کیا ہے پر تجھے رسوا نہیں کیا

دم نے کیا سمجھ کے کیا مصحفؔ کو قتل — بیچارہ اسقدر تو گنہ گار کچھ نہ تھا

نصیبی کا گلہ ہے کہ ہم اسدم پہنچے — گر کے جب ہاتھ سے ساقی کے سبو ٹوٹ گیا

بزم میں کس کو کروں میں قتل — اتنے میں یاد اس کو مرا نام آ گیا

کیوں تیر لگاتا ہے مرے سنگ لحد پہ — اس شوخ کو کیا شوق ہے پیماں شکنی کا

کل یار کی گلی میں ڈھونڈھا جو مصحفی کو — اک لاش تو پڑی تھی پر اس کا سر نہ تھا

قوت بازوئے قاتل نے کمی کی ورنہ — کام اپنا تو تمام ایک ہی شمشیر میں تھا

وائے وہ بسمل کہ سنبھلا اور سنبھل کر رہ گیا — مرغِ بسمل کی طرح دو گام چکر رہ گیا

ہم نے تو یہی قول فلاطون سے سنا ہے — بیمار تپ عشق کا اچھا نہیں ہوتا

جی رات لبوں پہ آ رہا تھا — مرنے میں ہمارے کیا رہا تھا
کیا وقت تھا وہ بھی جب کہ ہم تم — مے پیتے تھے ابر چھا رہا تھا

جو ملا اس نے بے وفائی کی — کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا

ہم نام ہی سنتے ہیں فقط مہر و وفا کا — آنکھوں سے کہیں مہر و وفا کو نہیں دیکھا

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا — ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

یار ہوتا ہے جو اک دم بھی نظر سے پنہاں — چین پڑتا ہی نہیں مجھکو یہ اسرار ہے کیا

ح تھا یہ کہ دل نہ کسی سے لگائیے   اک قصہ خواں کی رات مجھے کیا خوش آئی بات

نہ کر اے دل تو اظہار محبت   غضب ڈھائے گا اقرارِ محبت
ہیں عاشق اور بھی لیکن نہ ہوگا   کوئی مجھ سا گنہ گارِ محبت
نہ دیکھو چشم کم سے مصحفی کو   ہے دولت خواہ سرکارِ محبت

حسرت کہ قافلہ یاروں کا چل چکا   ہم سے نہیں ہوا ابھی سازِ سفر درست

زلے میں نشتر پہ خار ہے پنہاں   پاؤں سے مرے پوچھئے منزل کی حقیقت

ہجر میں گل ہے خار کی مانند   نکہت گل غبار کی مانند
ہے خوش آئند یار کا آنا   موسم نو بہار کی مانند
خوں میں تڑپا ہے کون سا بسمل   اس دلِ بیقرار کی مانند
پھر گئیں ہم سے یار کی آنکھیں   گردشِ روزگار کی مانند

کو تیغ زن کو مرے دل کی کیا خبر   قاتل کو بیقراری بسمل کی کیا خبر
شو گیا بد ہر کو اُدھر ہی چلے گئے   آوارگان عشق کو منزل کی کیا خبر
ح شب فراق بنے ہم تو مصحفی   ہم دل جلوں کو عیش کی محفل کی کیا خبر

گو نہیں ہم شیخ تری باتوں میں آجائیں   تو اپنے مریدوں سے یہ ارشاد کیا کر

دلمیں کہتے تھے ملے یار تو کچھ اس سے کہیں　　مل گیا وہ تو نہ اک حرف زباں سے

تیغ کیسے ہوئے علم اب کہو کیوں کھڑے ہو تم　　کام تو ہو چکا تمام مضطر زار

پونچھے نہ کبھی تو نے مرے دیدۂ گریاں　　رکھا نہ کبھی تو نے مرے زخم پہ

بے نور ہے ویران ہے اب کلبۂ احزاں　　کیا کہیے کبھی جلوہ گہ طور یہی

دل جس کے حوالے کریں ایسا نہیں کوئی　　یوں یار اگر پوچھو تو عالم ہے

انداز محبت کے کوئی سیکھ لے ہم سے　　کہتے ہیں جسے عشق وہی فن ہے

کعبہ و دیر میں ڈھونڈھے جو کوئی لے کے چراغ
تجھ سا کافر نہ ملے اور مسلماں مجھ

آتش عشق سے شاید وہ ہوا تھا پیدا
شعلۂ برق جو باراں سے بجھایا

ہارے اب تم بھی لگے خون غریباں کرنے
ہاتھ میں تم نے بھی تلوار سنبھالی

مصحفی تیغ ناز خوباں سے — ہو گیا قتل بے گناہ افسوس

کس لئے آہ کیا ہوتا ہے عشق — کچھ نہ پوچھو بد بلا ہوتا ہے عشق
پھر بگانے سے کچھ اس کو نہیں — آشنا سے آشنا ہوتا ہے عشق
ماجرائے عشق تو مجھ سے نہ پوچھ — سخت کافر ماجرا ہوتا ہے عشق
آنکھیں کس پر پڑے کرتی ہیں دید — جب تلک باہم چھپا ہوتا ہے عشق
چاہئے پرہیز اس سے مصحفی — دیکھو اے ناداں برا ہوتا ہے عشق

کس سے میں نے از خود کب کیا عشق — کچھ آپی آپ پیدا ہو گیا عشق
بشر ہو کیا یاروں نے مجکو — مجھے تو دیکھنے کا اس کے تھا عشق

ہم کو چمن میں جانے سے کیا کام مصحفی — نے آشنائے بلبل و نے آشنائے گل

کس [illegible] سرگرم وفا پاتا ہوں — ان دنوں کچھ تو ہوا ہے اثر زاری دل

کرتے ہیں آپ سے جدا تجھ کو — کرتے گر فرق جسم و جاں ہیں ہم
کس [illegible] کرے آخر کار — خوب رسوا ہوئے جہاں میں ہم

[illegible] چڑھی رہتی ہے اب کچھ نہیں معلوم
اس رنجش بے جا کا سبب کچھ نہیں معلوم

کہاں گئے تھے میاں مصحفی بتاؤ تو
لگائی رات بہت تم نے انجمن میں دیر

رکھتا تھا نہ جو بت کبھی زنار کمر پر
اب اس کے بھی رہتی ہے تلوار کمر پر

سیر خنجر جو زیب فتراک ہے ہے
پھرے لوٹتا سر ہمارا زمیں پر

تیروں پہ تیر کھا کر زخموں پہ زخم اٹھا کر
آئے گلی سے اس کی ہم خون میں نہا کر

پھرتا ہے اس کے کوچے میں سرگشتہ مصحفی
آتا ہے رحم مجکو بہت اس جوان پر

وہ دن گئے کہ تھا تو شیریں مقالیوں پہ
تیری زبان کھلی ہے ان روزوں گالیوں پر

جب تک کہ دم میں دم ہے رہیگا ترا خیال
نادان ترک عشق کا مجھ پہ گمان

قاتل سے یہ کہو کہ تماشے کا وقت ہے
جاتا ہے کوئی چھوڑ کے بسمل کو ب
ملنے کی اس سے کیا کہوں کل اس نے مصحفی
دو باتیں کر کے اور کیا دل کو بے

قتل کا مصحفی خستہ کے انکار نہ کر
شاہد مقتول ہے ترا دامن فتراک

قصہ عشق ہے وہ طول و طویل !
جس کا انجام ہے نہ کچھ آغاز

…دل کو کس سے کبھی ہو کے ہم سخن — اس بزم میں کسی سے ہمیں راہ ہی نہیں
…مصحفی ہر ایک کو سخن کا غرور ہے — طرز سخن سے پر کوئی آگاہ ہی نہیں

…شے کی طرح اے ساقی — چھیڑ ہم کو نہ، بھرے بیٹھے ہیں
…کس کے ارادہ ہے کہ آپ — ہاتھ قبضہ پر دھرے بیٹھے ہیں
…جن کو بات کرنا اے مصحفی سکھایا — ہر بات میں وہ میری اب بات کاٹتے ہیں

…کی سی شورشیں نہیں ہجراں کی مصحفی — اب اس گلی میں اپنا گزر ہے بھی اور نہیں

…م نشاط سے ہمیں کیا کام مصحفی — ہم غمکدہ میں رہتے ہیں غمناک لوگ ہیں

…نے میں کم کچھ ان بتوں کی آنکھیں — یہ لوگ جس کو چاہیں دم میں شکار کر لیں

…ہیں پر جبیں سب، مہرباں کوئی نہیں
ہم سے ہنس کر بولنے والا یہاں کوئی نہیں

…نے تو جھک جھک کے کیے سیکڑوں مجرے
پر خم نہ ہوئی اس بت مغرور کی گردن!
…ہوئے پنجے کی طرح سے مرے آگے
جاتی ہے لچک شاعر مغرور کی گردن،

اے شب ہجر کہیں تیری سحر ہے کہ نہیں نالۂ نیم شبی تجھ میں اثر ہے کہ نہیں
جان پر اپنی جو کھیلا ہے جدائی میں تری بے خبر تجھکو بھی کچھ اس کی خبر ہے کہ نہیں

اب ملاقات کی وہ شکل نہیں دیکھ لیتے ہیں گاہ گاہ کہیں

مقصود ہے آنکھوں سے ترے رخ کا نظارہ جب تو ہی نہ ہو پاس تو کس کام کی

پروا نہیں جو تمکو تو پروا نہیں ہمیں پر سچ ہے کہ دونوں ہاتھوں

سچ بتا رات تو کہاں جاگا اب تلک ہے خمار آنکھوں میں
تارے گن گن کے مصحفی کاٹی سب شب انتظار آنکھوں میں

فلک جب کسی کو ہنساتا ہے مجھ پر میں ہنس کر فلک کی طرف

وہی فرقت ہیں اس کی زاریاں ہیں وہی راتیں وہی بیداریاں

روز کوچے میں اس کے جاتا ہے کہیں اے دل تری قضا تو نہیں
پوچھتے کیا ہو حال دل میرا ہے عیاں تم سے کچھ چھپا تو نہیں
مصحفی کیوں خفا سے بیٹھے ہو کچھ کسی نے تمہیں کہا تو نہیں

ملنے کی تیری ہمکو بہت آرزو ہے یار پر کیا کریں کہ مرضی اللہ کی

قصہ دردِ غریبی اس سے پوچھا چاہیے   موسم گل میں جو اپنے آشیاں سے دور ہو

گلے پر اپنے خنجر رکھ دیا خود   مرے دل کو مری ہمت کو دیکھو

اپنے عاشق کی چشم تر کو دیکھ   صدقے ہیں اک ذرا ادھر کو دیکھو
میرے آگے نہ دیکھو آئینہ   مری حسرت بھری نظر کو دیکھو

بے زری کہتے ہیں جس کو مصحفیؔ   کوئی بیماری سی بیماری ہے یہ

جتنی الفت زیادہ ہوتی ہے   دل کی حسرت زیادہ ہوتی ہے
دیکھتا ہوں جو تیری صورت کو   مجھکو حیرت زیادہ ہوتی ہے
ہر گھڑی بے مروتی تیری،   بیمروت زیادہ ہوتی ہے

دیدار پیارے منظور کسے ہے   پر منع کرے مجھکو یہ مقدور کسے ہے

شوق دیدار پیدا ہوا ہے   پھر اس دل کو آزار پیدا ہوا ہے

دیدہ ور کی چشم حقیقت میں نہیں جدا   یعنی مآل سبحہ و زنار ایک ہے

حق عشق کا اب نام نہ لے   جان رکھ لی ہے خدا نے تیری

غیبت میں بھی تصور ملتا نہیں ہے اس کا — شب ہائے ہجر میں بھی ہم میں

زبسکہ کرتے رہے بیکسوں پہ تم بیداد — تمہارے کوچہ میں اکثر دہائیاں ہی رہیں
ہمارے ان کے کسی دن موافقت نہ ہوئی — ادھر سے عجز ادھر سے رکھائیاں ہی رہیں
دریغ یار سے بچھڑے تو ایسے بچھڑے ہم — کہ تا بروز قیامت جدائیاں ہی رہیں
اب اس کے ملنے کا کیا لطف مصحفی باہم — نہ وہ سلوک نہ وہ آشنائیاں ہی رہیں

در جنت پہ بھی زنہار نہ رکھوں میں قدم — گر ذرا چین جبیں صورت رضواں دیکھوں

اے مصحفی وہاں سے ہم خوب روتے آئے — سوئے چمن گئے تھے کیوں موسم خزاں

منہ پھیر کے چلے ہو اجی پھر کے دیکھ لو — اک ناتواں کا جانا ہے جی پھر کے

شک ہے تمکو جو میری چاہت میں — تم بھی دو روز عشق کر دیکھو

مرتا ہے کوئی ایک نظر دیکھتے جاؤ — جاتے ہو کدھر پھر کے ادھر دیکھ

یہ وہ نہیں ناسور جو ہو بند کسی سے — بہنے دو مرے دیدۂ گریاں

گہ دیر میں جاتا ہوں گہ آتا ہوں حرم میں — پر دل کی تسلی نہیں ہوتی

ہر گام پہ پامال ہے، ہو کبک کہ طاؤس — انداز خرام بت طناز تو دیکھ

راہ میں مجھ کو سب مرے ساتھی جان کر ناتوان چھوڑ گئے !

ہائے جن آنکھوں سے قطرہ اشک کا گرتا نہ تھا
کیا غضب ٹوٹا کہ یوں لخت جگر آنے لگے

بلبل نے آشیانہ جب اپنا اٹھا لیا پھر اس چمن میں بوم بسے یا ہما بسے

ذلت سے مری بات بگڑتی ہی گئی جوں جوں چاہا انہیں وہ اور بھی مغرور ہوئے

لخت دل یوں ہوا میں بکھرتے ہیں جیسے ابر بہار کے ٹکڑے

تیغ ہاتھ آئے گر مجھے تو کروں! اس شب انتظار کے ٹکڑے!

دیکھا ہے آہ ہم نے کر لی حسرت کی نگاہ ہم نے کر لی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی

کدھر جائیے اور کہاں بیٹھیے بہلتا نہیں دل جہاں بیٹھیے

... مجھ کو بیتاب نہیں کرتا کب ہوک کلیجہ سے ہر بار نہیں اٹھتی

... کش کر کے پیر مغاں نے سر حلقۂ رندان مے آشام کیا ہے

مجکو پامال کر گیا ہے یہی   یہ جو دامن اٹھائے جاتا ہے

آتا ہے اب یہ دل میں کہ ایجاد کیجئے   ماتم ہیں دل کے نالۂ و شیون نئے نئے

ذبح کے وقت بھی قاتل سے کہہ دیتا ہوں   آستیں دیکھ تری خون سے تر ہوتی ہے

رونے پہ مرے جو ہنس رہے ہو   یہ کون سی بات ہے ہنسی کی
شاہد رہیو تو اے شب ہجر   جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

کب اس طرف وہ بت کجکلاہ آتا ہے   گدا کے گھر میں کہیں پادشاہ آتا ہے

کیا جانیے اکسیر کہ عنقا ہے یہ کیا ہے   ملتی نہیں جو چیز زمانے میں وفا ہے

جس سے امید وفا تھی بیوفائی اسنے کی   آشنائی کر کے پھر نا آشنائی اس نے کی

سنا ہے آگ لگی ہے چمن میں ہمنفسو!   خبر تو لے کوئی بلبل کے آشیانے کی
گلہ نہ کیجئے یاروں کی بے وفائی کا   کہ ان دنوں یہی تاثیر ہے زمانے کی

جھپکی ہے مصحفی کی ابھی آنکھ ہمدمو   تم اس کو اس گھڑی نہ جگاؤ تو خوب ہے

یار کی آواز خوش نے مار رکھا ہے ہمیں   سچ تو یہ ہے کہ گلہ ہے

یا بگڑی ہے آج مصحفیؔ سے — اس کوچے میں شور و شر بہت ہے

ایک غضب ہو تو کرے کوئی گوارا — رفتار غضب ہے تری گفتار غضب ہے

جب وہ قاتل خرام کرتا ہے! — ہر قدم قتل عام کرتا ہے!
روکے تو ہاتھ آپ یہ بسمل — کام اپنا تمام کرتا ہے!

رہتے ہیں کوچۂ جاناں کا مرتبہ — مسجودِ خلق ہے یہ عجب سرزمین ہے

ملنا بے تقریب کیونکر اس کے پاس — کچھ تو ملنے کا بہانہ چاہیے

جھپکی نہ ذرا آنکھ سپیدی — یہ شب مجھکو اختر شماری میں گزری

دشمن سے اپنے قطع مروت نہ کیجئے — یہ بھی نہ کیجئے، جو محبت نہ کیجئے

کچھ خوب نہیں یہ خود نمائی — ہاں اے بت شوخ ڈر خدا سے

مدت سے دل اضطراب میں ہے! — جی ہے سو جیسا عذاب میں ہے،

پہلو سے بار اٹھتا ہے! — درد بے اختیار اٹھتا ہے

[illegible] لب حوض پہ بیٹھا — ایسے میں تماشا ہو اگر پاؤں پھسل جائے

صاحب نظراں مژدہ کہ خورشید کی مانند   اس شوخ نے دیدار کو پھر عام کیا ہے
اے مصحفیؔ کل قافلہ یاروں کا ہے راہی   کچھ تو نے بھی چلنے کا سرانجام کیا ہے

تم شب مجھے دیتے ہوئے گالی تو گئے ہو   میں بھی کسی دن تم سے سمجھ لوں گا جو ہوگا

کس ناز کا آنا ہے کس مہر کا جانا ہے   صدقے ترے آنے کے قربان ترے جانے کے

کوئی اے مصحفیؔ اس سے یہ کہدے   دعا دیتا تجھے سائل گیا ہے

وہ نہیں ہم کہ سپر سینے پہ اپنے رکھیں   بلکہ رکھ لیتے ہیں سینے کو سپر کے آگے

کیا مجکو فائدہ ہے بھلا اس سے اے فلک   تو اس قدر جو درپے آزار مصحفیؔ ہے
میں ہوں وہ خاک راہ کہ کوچے میں یار کے   میرا سر شکستہ ہے اور پائے مصحفیؔ ہے

حیراں ہیں سارے مفتیؔ و قاضی و کوتوال   آگے ترے کسی کی حکومت کہاں رہی

اے مصحفیؔ سمجھے ہیں ہم اس شوخ کو غافل   آگاہ ہے وہ خوب وفاداری دل سے

اس نے دیکھا مجھے جو در پہ کہا   کہدو اس کو یہاں سے اُٹھ جائے

افسانۂ عشق کس سے کہئے!   اس بات میں درد سر بہت ہے

قاتل سے آرزو بھی کٹی زخم کی ہمیں — پر ہم تو کھا کے ایک ہی تلوار رہ گ

بیمار کا تمہارے کل دم الٹ گیا تھا — کہتے ہیں آج اپر پھر شب وہی کڑی ہے

لگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے — کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

پھولوں کی چھڑی جس کے ہاتھوں سے نہ اٹھتی تھی — اب نام خدا اس نے تلوار سنبھالی ہے

فہم کے ساتھ اگر ہو زاہد — بت پرستی بھی مزا رکھتی ہے

ہے ماہ کہ آفتاب کیا ہے — دیکھو تو تہِ نقاب کیا ہے

سینے میں جو دل نہیں ٹھہرتا — یارب اسے اضطراب کیا ہے

پھولوں نے خون تھوکا، غنچوں کے پھٹ گئے دل
کیسا ستم کیا ہے بلبل صدا نے تیری

تو میرے درد سے آگاہ یوں نہ ہوگا کبھی — الٰہی چوٹ کسی دن ترے بھی دل کو لگے

ساقی یہی ہے میکدۂ دہر میں مزہ — دن رات منہ سے مے کی گلابی لگی رہے

وہ نخل ہوں میں سوختۂ صرصرِ حرماں — جس میں نہ لگے پھول نہ کوئی ثمر

تو یہ ڈکی ہے عشق سے پر اس کا کیا عـلاج
بے قصد دل کسی کو اگر چاہنے لگے !
دل ہاتھ بدست مژگاں سے ہو تو یہ   اپنی شکست اُس کی ظفر چاہنے لگے .

جو ایک جلوہ ترا شیخ و برہمن   یہ توڑ ڈالے سُبحہ وہ زنار پھینک دے
ی وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل مرا پھر جائے
پھروں بھی اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے

ہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا　　کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
ے کیا ہائے زخم دل ہمارا　　دہن پایا لب گویا نہ پایا
مارا تو نے پورا ہاتھ قاتل　　ستم میں بھی تجھے پورا نہ پایا!

ہو دیتا فلک آزار گوارا تھے مگر　　ایک تیرا نہ مجھے دردِ جدائی دیتا
ں وہ ہوں صید کہ پھر دام میں پھنستا جاکر　　گر قفس سے مجھے صیاد رہائی دیتا
دے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے　　گر حریفوں کو خدا ساری خدائی دیتا

کھائے ذوق ہوں گے آج پھر لاکھوں کے خون
پھر جمایا اس نے لعل لب پہ لاکھا پان کا

یری نعش پہ ہنگامہ کیوں ہے اے قاتل　　اٹھا ہے قصد یہ بعد انفصال کے کیسا
ردم ہی اسے یاد تو نے دیکھا ذوق　　گیا وہ غیر کے گھر تجھکو ٹال کے کیسا!

ے فلک کر تو ساتھ نہ لے چل مجکو　　ورنہ میں جاکے وہاں اور مچل جاؤنگا

ے ہم اور نہ ہو رقیب جدا　　ہے اپنا اپنا مقدر جدا نصیب جدا
بیب کو مجھ سے جدا فلک نے اگر　　نہ کر سکا مرے دل سے غمِ حبیب جدا

ہ گوش شنوا باغ جہاں میں غافل　　ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا

انتخابِ کلامِ ذوق

ذوق نے اپنی زندگی میں، غالب کو ابھرنے اور چمکنے نہیں دیا، اب غالب
ذوق کو دبائے بیٹھے ہیں، یہ بات طے شدہ سمجھ لی گئی ہے، کہ ذوق کی شاعری بر
بد ذوقی تھی۔

لیکن امر واقعہ یہ نہیں ہے، ذوق کے کلام کا اگر نگاہِ ذوق سے مطالعہ کیا
جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ استادانہ پختگی کے ساتھ ساتھ، ذوق کے ہاں جذبات
خیالات بھی ملتے ہیں، اور وہ ایسے ہیں کہ پڑھنے والا، بغیر لطف لئے بغیر
کئے، آگے نہیں بڑھ سکتا۔

زمانہ ذوق کو مار رہا ہے، لیکن وہ اب تک مرنے سے انکار کر رہے ہیں

ذیل میں کلامِ ذوق کا منتخب حصہ درج کیا جاتا ہے۔

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ   صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں

جس انسان کو سگِ دنیا نہ پایا   فرشتہ اس کا ہم پایا نہ
رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم   کبھی کج فہم کو سید
احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے   نکل جاتے مگر رستہ

...ں ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر — پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

...راتیں ہیں کہ ہے چشمہ حیواں جان بخش — ہے یہی خاصیت اس کے لبِ دشنام میں خاص
...وہوش ہے جبتک کہ جوانی کے ہیں دن — یہ مرض کرتا ہے شدت انھیں ایام میں خاص

...ں کو مژدہ ہو زنداں کو ہو نوید — پھر ہیں جنوں کی سلسلہ جنبانیوں میں ہم

...روز عید شب غم سے کم نہیں — جام شراب دیدۂ پرنم سے کم نہیں
...ے دور چرخ کے فرصت نشاط — ہو جس کے پاس جام وہ اب جم سے کم نہیں
...ے زرد پہ کیا اشک لالہ گوں — اپنی خزاں بہار کے موسم سے کم نہیں
...کا غم مجھے جنت سے ہے سوا — لیکن رقیب ہو تو جہنم سے کم نہیں
...کو چشم حقارت سے دیکھیے — سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

...تو ہیں اس عالم تصویر میں سب — اک نگہ ناز سے یہ کم سخنی خوب نہیں
...نے بنائی تھی وہاں خوب مگر — تھی جو بگڑی ہوئی قسمت تو بنی خوب نہیں

...کر رکھتے قدح کش تمنا — بنیاد میکدہ مری خشتِ لحد سے ہیں
...عشق سے پوچھو رہ فنا — اس میں جناب خضر ابھی نابلد سے ہیں
...پر ثبت ہیں صد ہزار داغ عشق — ہم کرتے ذوق عشق کا دعوی اسند سے ہیں

...وحشت و بیگانگی — یا تری آنکھوں میں دیکھی یا ترے دیوانے میں

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر   جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل
بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا   لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل
وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر   اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا
ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام   اور پھر کہوں گر آج سے کل
جب کل ہو تو پھر وہ ہی کہوں کل کی طرح سے   گر آج کا دن بھی یوں ہی ٹل

* * *

ذوقِ بیمارِ محبت ہے خدا خیر کرے   کہ یہ آزار ہوا جس کو وہ جاں

* * *

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا   پر میرا جگر دیکھ کہ میں اُف
دل فقر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہے   دنیا کے زر و مال پہ میں تُف

* * *

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا   پر ذکر ہمارا نہیں آتا

* * *

ہر اک سے ہے قولِ آشنائی کا جھوٹا   وہ کافر ہے ساری

* * *

آنا تو خفا آنا، جانا تو رلا جانا   آنا ہے تو کیا آنا جانا ہے

* * *

یوں لائے واں سے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈھ کر   دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا

* * *

ریشِ سپید شیخ میں ہے ظلمت قریب   اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گماں

یوں نگہ نکلے ہے چشم یار سے — مست جیسے خانۂ خمار سے

نگہ کی اور مژہ کیا ہم تو دونوں کو بلا سمجھے — اسے تیر قضا اس کو پر تیر قضا سمجھے
ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے — اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت کو خدا سمجھے
تجھے اے سنگدل آرام جان مبتلا سمجھے — پڑیں پتھر سمجھ پر اپنی ہم سمجھے تو کیا سمجھے
سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق اس کی — کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

کنج تنہائی میں دیتا ہوں دلاسے کیا کیا — دل بیتاب کو میں اور دل بیتاب مجھے

نزع میں بھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار — جانب در دیکھ لے ہے جبکہ ہوش آجائے ہے

گدا کی پھرے جیتے وہ کعبہ کے سفر سے — تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے
سرمایۂ امید ہے کیا پاس ہمارے — اک آہ تھی سینے میں سو نا امید اثر سے
اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا — بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

آنکھ اس پُر جفا سے لڑتی ہے — جان کُشتی قضا سے لڑتی ہے

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے — بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

ہے ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش — دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

وقتِ پیری شباب کی باتیں ۔۔۔ ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
اس کے گھر لے چلا مجھے دیکھو ۔۔۔ دلِ خانہ خراب کی باتیں
حرف آیا جو آبرو پہ مری ۔۔۔ ہیں یہ چشمِ پر آب کی باتیں
یاد ہیں مہ جبیں کہ بھول گئے ۔۔۔ وہ شبِ ماہتاب کی باتیں
تجکو رسوا کریں گی خوب اے دل ۔۔۔ تیری یہ اضطراب کی باتیں
جاؤ ہونا ہے اور بھی خفقان ۔۔۔ سن کے ناصح جناب کی باتیں
سنتے ہیں اوس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم ۔۔۔ کس مزے سے عتاب کی باتیں
دیکھو اے دل نہ چھیڑ قصۂ زلف ۔۔۔ کہ ہیں یہ پیچ و تاب کی باتیں

مبصروں سے کہو دکھیں چینِ ابرو یار ۔۔۔ کہ جوہر ایسے کہاں تیغ اصفہانی میں

مونہی سے کچھ علاج دردِ فرقت ہو تو ہو ۔۔۔ غسلِ میّت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو
ہو تو ہو آباد کیونکر یہ خراب آباد دل ۔۔۔ عشق غارت گر اگر دنیا سے غارت ہو تو ہو
آج اک پگڑی ہوئی تھی میکدہ میں رہنِ مے ۔۔۔ ذوق وہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو

عبث تم اپنا بناوٹ سے منہ بناتے ہو ۔۔۔ وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

کیا قہر ہے جتنا کہ وہ چاہت سے رکے ہے ۔۔۔ اتنا ہی اسے چاہیں ہیں ہم اور زیادہ
کہتا ہے مرا شوق جراحت کہ صد افسوس ۔۔۔ اس تیغ دو دم میں نہیں دم اور زیادہ

ہاتھ اٹھاؤ عشق کے بیمارے ۔۔۔ کوئی بچتا بھی ہے اس آزار سے

رام پور کا ایک ملک الشعرا

ایسا کم دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی ہستی ایک ہی وقت میں صاحب افسر و دیہیم بھی ہو اور صاحب قرطاس و قلم بھی، انتظام مملکت اور کشور آرائی کے مراحل بھی درپیش ہوں اور افواج معانی کی سپہداری بھی ہو رہی ہو، دنیاوی دلفریبیاں "خوش باش دمے کہ زندگانی اینست" کی دعوت دے رہی ہوں اور فقر و قناعت کے بوریے پر لطف درویشی بھی حاصل کیا جا رہا ہو، ایک طرف نگارہائے شوخ و شنگ "دشمن ایمان و آگہی" اور "رہزن تمکین و ہوش" ہوں اور دوسری طرف چشم بینا "جامۂ ہستی کی آستینوں" کو نمایاں کر کے بساط عیش برہم کر دیتی ہو، کسی وقت مطرب و ساقی، نغمہ و مے، چنگ و رباب کیف سرور میں محو کر دیں، تو کبھی کبھی حقیقی جذبات کی تراوش وہ درد بھی پیدا کر دے کہ "نغمۂ شادی" "نوحۂ غم" میں بدل جائے۔

نواب یوسف علی خاں ناظمؔ فرماں روائے "دارالسردار رام پور" انہی مستثنیات میں تھے۔ وہ صاحب تخت و اورنگ بھی تھے، اور ایک جادو نگار شاعر بھی، وہ ملک چتر شاہی بھی تھے اور اقلیم سخن کے تاجدار بھی،

ناظمؔ کا اشہب قلم اصناف شاعری کے ہر میدان پر یلغار کرتا ہے، لیکن تغزل اس کا حصہ ہے، بالخصوص محاکات اور حسن بیان میں تو ید طولیٰ حاصل ہے وہ

اے شوخ تری چشم غضبناک کے ہوتے　　ہم چاہیں قضا سے اگر امداد غضب ہے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم آپ سے　　دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی　　چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

کہاں ہم اور کہاں غم، غم سے ہم کو کچھ غرض مطلب؟
مگر اے حضرت عشق آپ نے یہ مہربانی کی!

اے بس نہ اپنے آپ کو صوفی جتایئے　　معلوم ہے حقیقت ہو حق جناب کی
نکلے ہو میکدہ سے ابھی منہ چھپا کے تم　　دابے ہوئے بغل میں صراحی شراب کی

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ　　ہے برا وہ ہی کہ جو تجھکو برا جانتا ہے
اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے　　کیوں برا کہنے سے تو اس کے برا مانتا ہے

کیا فائدہ فکر بیش وکم سے ہو گا!　　ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے　　جو کچھ ہوگا ترے کرم سے، ہو گا!

تھا جبکہ جوان، تھا جوان بدمست　　جب پیر ہوا پیر خرابات ہوا!

ہے کہ ان کا کلام دیکھئے تو جس جگہ وہ دل کی بیتی بیان کرتے ہیں اسماں بندھ جاتا ہے، سننے والا یا پڑھنے والا ایک عجب خلش محسوس کرنے لگتا ہے، ورنہ اگر خالی خولی الفاظ ہوتے تو آپ لاکھ بار سنتے اور کچھ اثر نہ ہوتا۔

عام عاشقانہ مضامین

ناظم کا کلام بھی ان جذبات وخیالات سے معریٰ نہیں ہے۔ جو "قدر مشترک" کے طور پر تقریباً ہر شاعر کے ہاں باختلاف قوافی ردیف ملے گا، لیکن اپنی انفرادیت کے ساتھ،

آنے کو کہا ہے اس نے ناظم کچھ تم ہی کو اعتبار ہوگا!

سنا بھی تم نے تو کس سے سنا خدا کی پناہ کہا ہے غیر نے جو کچھ وہ میرا حال نہیں

اک جہاں تشنہ انداز خود آرائی ہے آپ جو چاہیں کریں آپکی بن آئی ہے

جلد ہم جانتے ہے ہر شخص کا نقشہ کیسا سادہ دل ہے وہ بت آئینہ سیما کیسا!

مایوسی درد و اثر، سوز و گداز اور وفا و جفا کے افسانے آپ نے شعرا کی زبان سے اکثر سنے ہوں گے، لیکن ناظم کی آہ جگر گداز بزم و انجمن ہی میں صاعقے ہو کر نہیں گرتی ہے، اس کا درد دل جب بے نیاز دعا و دوا ہو جاتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے،

میری کا بھی علاج کئی بار ہو چکا! اچھا غم فراق کا بیمار ہو چکا
اب کیوں کمی کرے تجھے کس کا لحاظ ہے رونے کا نام دیدۂ خونبار ہو چکا

جو کچھ کہتا ہے، اس انداز سے کہتا ہے، کہ گویا سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے، وہ جب درد و الم کا اظہار کرتا ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دل کی ترجمانی ہو رہی ہے، وہ جب کسی کی بے اعتنائیوں اور تنگ مزاجیوں کا تذکرہ کرتا ہے، تو اس حسرت و تاسف سے کہ اگر پتھر کا دل ہو تو وہ بھی موم ہو جائے، اور چونکہ وہ ایک باعظمت و جبروت شخصیت کا مالک ہے صاحب اقتدار و صاحب اختیار ہے، حرم سرا بھی رکھتا ہے، اور محلات بھی اس لئے کبھی کبھی شاہانہ تمکنت کا اظہار بھی زبان شعر سے ہو جاتا ہے۔

یہ خیال کیا جا سکتا ہے، کہ جب ناظم ایک عاشق ناکام نہیں تھے، جور فلک کے شاکی نہیں تھے، "کسی" کے شکوہ سنج جور و ستم نہیں تھے، تو ان کے ہاں درد و اثر، سوز و گداز اور بے تابی و بے قراری کے کیا معنی؟ انھیں تو امراء القیس کی طرح "شب وصل" کا نقشہ کھینچنا چاہیے تھا، اپنی لغزش رندانہ کی حکایتیں مزے لے لے کر بیان کرنی چاہیئے تھیں، لیکن یہ عنصر تو کم ہے، ہے تو درد و غم کی داستان "بے قراری ہائے فرقت کا بیان" اے اگر آورد نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے!

یہ خیال صحیح نہیں، یہ کیا ضرور ہے، کہ ناظم اگر رام پور کے فرمانروا تھے تو کشور دل بھی تسخیر کر چکے تھے، ہو سکتا ہے کہ دل پر ایسی چوٹ لگی ہو جس نے نشاط و مسرت کے جذبات چھین لئے ہوں، دربار میں، حرم سرا میں مصاحبوں کے مجمع میں، کاروبار سلطنت میں اپنا درد نہاں بھول جاتے ہوں، لیکن جب رات کی تاریکی مسلط ہوتی ہو تو ایک خلش محسوس کرتے ہوں، جب لوگ مصروف خواب ہوتے ہوں، وہ کروٹیں بدلتے ہوں، جب شب ماہ کی کرنیں بام و در کو جگمگا دیتی ہوں تو ان کا دل ویران و سنسان رہتا ہو اور اس وقت ہجوم جذبات میں ان کے منہ سے نالۂ موزوں نکلنے لگتا ہو، میرے اس خیال کی اس سے بھی تصدیق ہوتی

یہ تیری سخن سازیاں ہیں ندیم　　کسی پر وہ کیوں رحم کھانے لگے

عرض حال ایک ناکام تمنا حصُول مقصد کے لئے ہر امکانی کوشش صرف کر ڈالتا ہے، ناظم بھی اس سے مستثنےٰ نہیں تھے، انہیں بھی کوچۂ رقیب میں "سر کے بل" جانا پڑا، منت اعدار کرنی پڑی، خودداری کا خون کرنا پڑا، اور یہ سب کچھ محض اس لئے کہ کسی کے حریم ناز میں باریاب ہو سکیں، لیکن جب ان باتوں سے بھی کام نہ نکلا تو انھوں نے مختلف پیرایوں میں محبوب کے جذبات پر اثر ڈالنا شروع کیا کبھی رقیب روسیہ کے معائب چن چن کے بیان کئے، کبھی اپنی وفاداریوں اور جاں سپاریوں کو شفیع لائے، کہ اس زمانے میں وفا عنقا کا حکم رکھتی ہے، اگر کسی میں یہ گوہر نایاب پایا جائے، تو اس کی قدر کرنی چاہئے کبھی کبھی رفع غلط فہمی کے خیال سے یہ بھی سنا دیتے ہیں کہ اگر جفا طریوں کا یہی عالم رہا تو آپ مخلص اور بے ریا دل کاہے کو ملے گا، سب سے پہلے اپنی جاں نثاری اور وفاداری کا "سکہ" یوں بٹھاتے ہیں،

دیکھ تو بھی کہ گلہ ہے نہ خنجر لیکن　　تجھ کو اے یار کس ارمان سے ہم دیکھتے ہیں

اپنی صفائی دیتے ہیں :-

اس پہ کیجئے گمان شکوہ کا　　بات کرنے کی جس میں طاقت ہو

کہنا یہ ہے کہ ہم نے شکایت نہیں کی، لیکن انداز بیان ملاحظہ ہو کہ خواہ مخواہ رحم آجائے،

منہ ترا دیکھنا نصیب نہ ہو　　منہ سے نکلی اگر شکایت ہو

ناظمؔ غلط ہے مہر و محبت سے چشم داشت واقف نہیں ہیں اس صنم جلوہ گر سے آپ

شاعر بنے، ندیم بنے، قصہ خواں بنے پائی نہ ان کے دل میں مگر جا کسی طرح

نصیحت کا نہیں اب وقت ناصح اٹھا ہاتھ ایسی باتوں سے دعا کر

خدا بے نیاز اور بت سنگدل کہو کس سے ہم راہ پیدا کریں

یہ شعر ملاحظہ فرمایئے، رنجوری عشق کا کتنا باکمال مرقع پیش کیا ہے۔

قاصد شکستہ پا دکبوتر شکستہ بال جانے کا خط کے داں کوئی عنوان ہی نہیں

دل لاکھ لاکھ سمجھاتا ہے کہ محبوب کی سرد مہری وقتی ہے، اس کی کج ادائی التفات پنہاں کی غماز ہے لیکن

توقع اس سے کیونکر غم گساری کی پڑے ناظمؔ!
کبھی بھولے سے بھی جس نے نہ پوچھا ہو کہ کیونکر ہو

یہ حیات مستعار تو کش مکش اضطراب و اضطرار میں گزری، شاد کامی کا زمانہ ناکامی میں بسر ہوا اب تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "وہ"

پوچھنے آئیں گے پر جبکہ مجھے بات کرنے کی نہ طاقت ہوگی

"وعدۂ یار" شرمندۂ ایفا کب ہوا ہے، لیکن ناظمؔ فریب میں آگئے "محبوب ستمگار نہ اب آتا ہے، نہ جب آتا ہے" آخر بے قرار ہو کر کہتے ہیں،

وہ اپنی ضد کے ہیں پورے نہ آئیں گے ہرگز بس ان کی راہ ہم اے غم گسار دیکھ چکے

یہ شعر ملاحظہ ہو:-

جان دی گو تڑپ کے پر تم کو اک تماشہ دکھا دیا میں نے

محبوب پر احسان جتاتے ہیں،

طعن عدو، ملامت احباب، جور خلق دیتے نہ تم کو دل نہ یہ آزار کھینچتے

مسیحائی کا دم بھرتے ہو، سچ، ایسا ہی ہے لیکن
کبھی اپنے مریض غم کو بھی پوچھو کہ کیسا ہے؟

اپنی کارگزاریوں کو بھی وہ قیس و فرہاد سے کم نہیں سمجھتے اور بلا کسی انکسار کے صاف صاف عرض کرتے ہیں،

افسانۂ مجنوں سے نہیں کم مرا قصہ اس بات کو جانے دو کہ مشہور نہیں ہے

پوچھتے ہیں کہ بتلائیے سوا "خاکسار" کے اور

وہ کون ہیں کہ جو محبوب کے ستم سہ کر زبان کو زمزمہ سنج دعا نہیں کرتے

سب سے بڑی شکایت تو یہ ہے کہ ناظم صاحب کی طرح

نہ بذلہ سنج، نہ شاعر، نہ شوخ طبع رقیب
دیا ہے آپ نے صحبت میں اپنی بار کے

"اختیاراً" کبھی کبھی یہ بھی سنا دیتے ہیں کہ

جفا ادھر سے اگر بے شمار باقی ہے ادھر بھی دل پہ ابھی اختیار باقی ہے

بوالہوس کے چلنے بندے تھے وہ تو جفائے یار سے آشفتہ خاطر ہو کر اٹھ گئے، لیکن ناظم صاحب کا دم تھا جو خلوص و وفا کا نام لئے بیٹھا تھا اطلاعاً عرض کرتے ہیں،

سب اٹھ گئے ترے در سے خبر لے ناظم کی ستم کشوں میں ابھی دل فگار باقی ہے

درد و اثر درد و اثر، سوز و گداز، اور یاس و حرماں کے جذبات بھی کلام ناظم کا

ایک مخصوص حصہ ہیں، جذبات جب حقیقی ہوں، درد دل جب سچا ہو منہ سے جو لفظ نکلتا ہے، اس میں درد و حسرت کا ایک جہان پوشیدہ ہوتا ہے،

غالب کشور سخن کا فرماں روا تھا، جس زمین کو اس کی جولانی سخن نے پامال کر دیا، پھر ہر شخص کے لئے خواہ وہ کتنا ہی قادر الکلام ہو اس کا تسخیر کرنا ناممکن ہو جاتا ہے، اور اس قسم کی جرأت اگر کسی سے ہو تو اصل اور نقل کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے لیکن ناظم اپنے استاد غالب کی ایک مشہور و معروف زمین پر قدم رکھتے ہیں، اور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں انھوں نے کوئی ٹھوکر نہیں کھائی، ملاحظہ ہو،

وہی تم ہو، وہی خنجر ہے، پر انصاف کرو   ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ

جب نہ ہو کوئی جفا کش تو جفا کا کیا لطف!

کیا کرو گر نہ کرو ترک جفا میرے بعد

خط مرا پڑھ کے تمھیں رحم تو آیا لیکن،

یہ بھی قسمت کا لکھا تھا کہ پڑھا میرے بعد

اس شعر میں گو توارد کی بو آتی ہے لیکن پھر بھی حسن دیکھئے،

کس نے اس حلقۂ کاکل میں پھنسایا دل کو

کون اس چشم کا بیمار ہوا میرے بعد

یہ شعر طالب و مطلوب کی نفسیات کا صحیح مرقع ہے،

لے جاتے ہیں تو کہتے ہیں اچھی طرح تو ہو!

گویا ہمارے جی میں کچھ ارمان ہی نہیں

تاریخ کے طوفانِ تکلم سے ہر شخص واقف ہے، ناظم کو جب سابقہ پڑا تو یہ کہہ کے اپنا پیچھا چھڑاتے ہیں،

یہ اشعار ملاحظہ ہوں،

وصال دائمی کا ہے تصور! بہار بے خزاں ہے اور میں ہوں
مزا دیتا ہے تنہائی میں رونا! کہ اک دریا رواں ہے اور میں ہوں
تحمل کی نہیں اب تاب زنہار نبرد آسماں ہے اور میں ہوں

بے سود اتفاق ملاحظہ ہو،

خوش ہو رہے تھے ہم کہ بنایا ہے ہم نے یار
دیکھا تو ان کے در پہ وہ دربان ہی نہیں

یہ شعر بغیر کسی تشریح کے سنئے،

وہ سنکر درد دل کہتے ہیں پھر میں کیا کروں ناظم

خلاصہ آپ کی تقریر کا یہ ہے کہ "مرتے ہیں"

آستین بھی نچوڑ ڈالیں گے! اشک کے پوچھنے سے فرصت ہو

شاعرانہ مبالغے کے ساتھ جذبات کی یہ تصویر کشی کتنی خوب ہے، :

شب غم کی درازی قصہ کوتہ یوں سمجھ لیجئے،

یہ وہ شب ہے کہ جس کے بعد صبح روز محشر ہے

باتوں باتوں میں کتنے پتے کی بات کہہ رہے ہیں، :

وفا کی ہم نے اور تم نے جفا کی، تم اچھے، ہم برے قدرت خدا کی

جنون عشق کے باوجود یہ "حکمت عملی" کتنی داد طلب ہے۔ :

پڑھ کے خط نام غیر سے ان کو حال اپنا سنا دیا میں نے!

بہ ذیل "خمریات" یہ شعر بھی خوب ہے،

میخانے کدے کا در کھلا ہوا ناظم پھر اور کہتے ہیں تائب کرو گار کسے ؟

بکے جو اس طرح کون اس کو دانشمند جانیگا　　مجھے سودا ہی ناصح پہ کیا تجھ کو بھی سودا ہے

جفائے یار اور جور دلدار سہتے سہتے امید ہو چلی تھی کہ وہ بت خود ہی عذر جفا کرے گا، پیمان وفا باندھے گا، محبت کے جام چلیں گے، الفت کے ساغر چھلکیں گے، لیکن نتیجہ نکلا تو یہ کہ

یاں آرزوئے عذر ستم اور وہاں ہنوز　　اپنے کئے پہ یار پشیماں ہی نہیں

سہل ممتنع

شعر و شاعری میں ایک اہم چیز سلاست و روانی بالفاظ اصلاح سہل ممتنع ہے۔ ناظم اس میدان کے بھی شہسوار ہیں۔ سہل ممتنع کی تعریف یہ ہے کہ کلام روزمرہ سے اس قدر مرصع ہو کہ گمان یہ کیا جائے کہ اس سے بڑھ کر آسان اور سلیس کلام ہو ہی نہیں سکتا، پڑھنے والے کو یہ غلط فہمی ہو کہ یہ تو کیا ہے میں خود اس سے کہیں بہتر کہہ سکتا ہوں، لیکن دعوے ثابت کرنے کے لئے جب ہاتھ قلم دوات سے آشنا ہوں تو معلوم یہ ہو کہ خیال کر لینا جتنا آسان تھا عمل کر کے دکھانا اس سے کہیں مشکل ہے، دوسری سب سے اہم خصوصیت اس کلام کی یہ ہے کہ پانی کی طرح رواں ہو، تیر کی طرح بے پناہ ہو اور محبت کی طرح دل میں گھر کرتا ہو،

کلام ناظم کا آپ مطالعہ کیجئے تو محسوس کریں گے کہ ناظم اس میدان کا بھی مرد میداں ہے، "گ" و "ظ" کی ردیف بہت سخت ہے، بالعموم ایسی زمینوں میں طبع آزمائی اس وقت کرتے ہیں جب "خانہ پری" مقصود ہوتی ہے، لیکن ناظم کے اشعار ملاحظہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ الفاظ وضع ہی ردیف اور ناظم کے لئے کئے گئے تھے ملاحظہ ہو،

ہم سے چھپتی ہے کہیں بادہ پرستی ناظم　　منہ پہ واعظ کے کیا کرتے ہیں ناچار [illegible]
کیا غضب ڈھائے دیکھئے ناظم　　ہے برا چشم خوں فشاں کا رنگ

رنگ سے ان کا رنگ مل جاتا ہے، لیکن جب وہ اپنی طلاقت لسانی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں، اپنی خطابت کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں، اپنے جوش بیان اور زور بیان کا وا منوانا چاہتے ہیں، تو ذوقؔ اور سوداؔ کے ہم عصر معلوم ہونے لگتے ہیں، جن باتوں کو وہ صاف، سادہ اور دلنشیں الفاظ میں ادا کرتے ہیں، اسی مفہوم کو وہ پرجوش، زور دار اور خطیبانہ لب و لہجے میں بھی کہہ سکتے ہیں، بطور ثبوت ملاحظہ ہو،

نوبت ہے تیری گردش چشم سیاہ کی — دنیا میں دور گنبد دوّار ہو چکا،
ہے ناوک نگہ کے مقابل خدنگ آہ — اب میرا وار ردک نرا وار ہو چکا!

چاہے تجھ سے رہیں بندہ و آزاد ملول — چاہئے تجھ سے کریں کافر و دیندار لحاظ
نہ تجھے حشر کا اے فتنۂ ایام خیال — نہ تجھے خلق کا اے شوخ ستمگار لحاظ

کتنے پرشکوہ الفاظ ہیں، اپنے عشق کے متعلق اظہار رائے کرتے ہیں، :

ابتدائے عشق میں ہوں منتہی — میرا آغاز اور کا انجام ہے

اپنے محبوب سے مطالبہ کرتے ہیں، :

ستم کرو ہم پہ بے تحاشہ، لحاظ کس کا ہے خوف کیا ہے
اگر ہے گریہ تو بے اثر ہے، اگر ہے نالہ تو نارسا ہے

اپنے تئیں تسلی دیتے ہیں، :

عبث ہے اے دل فغان و زاری عبث ہے اے دیدہ اشکباری
عدو سے مانا کہ ہے لگاوٹ، مگر وہ کس سے وفا کریں گے!
رکھیں گے درباں سے ربط باہم یقیں ہے اب سب رفیق اپنے
لگی ہیں ان کی بہرا کریں گے، ہم ان کے در پر رہا کریں گے

قطعۂ ذیل روانی، سلاست، ہجوم جذبات اور وفور محبت کا کتنا کامیاب مرقع ہے!

کل کہا میں نے کہ اے نا مہربان — آدمی کو آدمی سے کام ہے!
دیکھو تو کب سے یہ تیرا دردمند — عشق میں رسوائے خاص و عام ہے
جانتا ہے تو بھی آیا یا نہیں — کوئی تیرا عاشق ناکام ہے؛
سن کے ساری داستان بولے کہ ہاں، — آپ کا یوسف علی خاں نام ہے

اشعار ذیل بھی اپنی سادگی اور کیف و اثر کی آپ ہی نظیر ہیں،

یوں تو چھڑ ان کو ہر کسی سے ہے — پر عداوت فقط مجھی سے ہے
دوست بن کر، ہمیں بناتے ہیں! — دعوئ دوستی ہنسی سے ہے
کیوں چھپاتا ہے حال رنجش غیر — ہم نے بھی سن لیا کسی سے ہے
میرا ان کا معاملہ ناظم — کچھ جدا جنگ و آشتی سے ہے

اپنے دل کی خود مخبری کرتے ہیں،

نہ بیاباں نہ خیاباں کوئی کوچہ ہوگا — جانتا ہوں دل صد پارہ جہاں رہتا ہے

یہ شعر ملاحظہ فرمایئے، ادائگی مفہوم کے ساتھ بے تکلفی زبان کا اتنا نادر نمونہ شاید ہی کہیں مل سکے،

جب کہوں کیوں خفا ہو کیا باعث — کہتے ہیں پوچھنے کا کیا باعث؟

اس سلسلے میں یہ آخری شعر بھی سن لیجئے،

کہے یہ کون کہ تم کیوں دغا نہیں کرتے — وہ کیا کہیں گے مگر یہ کہ "جا، نہیں کرتے"

زور زبان و حسن بیان

ناظم جب روانی و سلاست کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ غالب کے شاگرد نہیں معلوم ہوتے بلکہ میر تقی میر یا میر درد کے حاشیہ نشین، یا خواجہ آثر کے زلہ ربا معلوم ہوتے ہیں، یا مومن کے

یہ سوال وجواب ملاحظہ ہو :

کہئے اگر کہ طرزِ ستم ناپسند ہے — کہتے ہیں واہ آپ کی بھی کیا پسند ہے

یہ مواقع ناظمؔ کو بھی پیش آئے اور اپنی حسرت کو انھوں نے بھی مختلف اسالیب سے بیان کیا ہے، مثلاً

کل ہم ان سے مل کے کہہ آئے سب اپنا دردِ دل
پھر بھی ناظمؔ شکوۂ بیداد درباں رہ گیا

وہ تو آیا اس سے لیکن ہم نشین — دل میں کہتا ہوں کہ ناظمؔ کیا کیا؟
وعدہ پر اس سے کیوں قسم مانگی؟ — مفت بگڑی، بنی بنائی بات!

بت سے ناخوش ہے تو کیوں اٹھ نہیں جاتا ناظمؔ
دیر میں تذکرۂ کعبہ و زمزم کب تک ؛

محبوب سے اختلاف اگرچہ جذباتِ محبت، والہانہ حد تک پہنچے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھی اپنے محبوب سے اختلاف بھی کرتے ہیں، اشعارِ ذیل ملاحظہ فرمائیے، ان میں حسنِ بیان، لطفِ زبان، بے ساختگیِ الفاظ اور وارداتِ قلب کا جتنا مکمل نقشہ کھینچا ہے وہ تعریف و توصیف سے قطعاً بے نیاز ہے،

تم دیدۂ گریاں کو کہا کرتے ہو ناسور — میں ضد سے اسے ابرِ گہر بار کہوں گا
دیوانہ و سرگشتہ مجھے کہتے ہو اچھا — میں بھی تمھیں بے مہر و ستمگار کہوں گا

محاکات

شاعری محاکات کا دوسرا نام ہے، یا محاکات کو شاعری کہہ سکتے ہیں، یعنی کسی واقعے کو بالخصوص کسی ایسے واقعے کو جو محبوب سے متعلق ہو، اس طرح بیان کرنا کہ آنکھوں کے سامنے تصویر پھر جائے یہ معلوم ہو کہ یہ واقعہ اپنی تمام جزئیات و تفاصیل کے ساتھ ہمارے سامنے ہو رہا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں اور حظ حاصل کر رہے ہیں، ناظمؔ محاکات کے بھی بادشاہ ہیں، وہ جذبات کے بھی بہترین مصور ہیں، وہ احساسات عشق کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سماں بھر جاتا ہے مثلاً :-

ہوتے ہی درد دل کا بیاں اٹھ کھڑے ہوئے
یعنی یہ ایسے ہیں کہ نہ ان سے سنا گیا

ایک بار حضرت ناصحؔ اپنی رو میں ناظمؔ کے سامنے اس غارت گر صبر و شکیب کا نام لے گئے، ناظمؔ ابل پڑے :-

روکو تو سہی اب مجھے، لو، حضرت ناصح
لینا ہی نہ تھا نام "کسی کا" مرے آگے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہمارے سامنے ہی ہو رہا ہے :-

کب میں نے کسی بات پہ تکرار نکالی؟ دیکھا مجھے اور آپ نے تلوار نکالی!

ناظمؔ ایک بار حریم ناز میں باریاب ہوئے، وہاں جو کچھ پیش آیا ان کا موئے قلم اس کی نقاشی کرتا ہے،

گیا تھا کہ ان کی خوشامد کروں | وہ الٹا مجھی کو بنانے لگے
کبھی خیر مقدم، کبھی مرحبا | زباں پہ یہ الفاظ لانے لگے
کبھی میرے قرباں ہوتے رہے | کبھی مجھ کو پنکھا ہلانے لگے

تسلی خبر ملتی ہے کہ وہ کشور دل کا حسن و بصد شان کجکلاہی آ رہا ہے، دل بانسوں اچھلنے لگا، ہوش و حواس رخصت ہو گئے تو اپنے تئیں تسلی دیتے ہیں کہ اس قدر اضطراب کی کیا بات ہے'؟

ترے گھر وہ آئے ناظم تو یہ اضطراب کیا ہے
کوئی بادشاہ آیا کوئی شہریار آیا

غلط بھی اثر آہ و نالہ پر ناظم — رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

لگاوٹ غیر سے اس کی جلا کر خاک کر دیتی — سمجھتے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر سکتا ہے

شکوہ زبان کبھی کبھی حرف شکایت سے بھی آشنا ہو جاتی ہے، لیکن نہایت بکیا نہ لب و لہجے میں'؛

میں تو اٹھنے ہی کو تھا بزم سے کیا ہو جاتا — جام مے غیر کو دیتے تم اگر میرے بعد؛

شکوہ بطور طنز:

میری دشنا کی داد نہ جرم عدو سے بحث — کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں

شبستان میں رہو، باغوں میں کھیلو، مجھ سے کیوں پوچھو
کہ راتیں کس طرح کٹتی ہیں دن کیوں کر گزرتے ہیں؛

طنز یاں دعوائے الفت و محبت، محبوب پر کبھی کبھی "چوٹ" بھی کر جاتے ہیں'؛

ان کا خیال تھا کہ سنیں گے خبر کچھ اور — اچھا ہوا مریض محبت، برا ہوا

گھر بیٹھے ہوئے تم جو مجھے کہتے ہو مجنوں   ہیں تم کو نہ لیلیٰ اسے سر بازار کہوں گا؛
تم چاند سے مکھڑے پہ کیا کیجو نازش   ہیں کاکل مشکیں کو شب تار کہوں گا

ایک بار بزم محبوب میں جو پہنچے تو باز پرس ہوئی اور حکم دیا گیا کہ تشریف لے جایئے، ناظم رخصت ہونے سے پیشتر بالفاظ ذیل "صدائے احتجاج" بلند کرتے ہیں،

محلس کو توڑ دیجئے، ہیں سب کے ساتھ ہوں   لیکن مجھے نہ بزم سے تنہا اٹھایئے!

شان عاشقانہ

ناظم کو اپنی عاشقانہ شان پر پندار ہے، فخر ہے : —

وعدہ گر روز کئے جایئے گا   روز سمجھوں گا کہ آج آیئے گا

اپنے متعلق "صفائی" دیتے ہیں،

عبث ہے خوف شکایت بس آ کے مل جاؤ
رہے ہیں یاد ستم ہائے بے شمار کے

گزرے گی شغل حیلہ تراشی میں شب مجھے
جانا ہے بزم یار میں کل بے طلب مجھے

کہتے ہیں، :

تمھاری ہر بات دلنشیں ہے، کسی طرح کا گلہ نہیں ہے
جو داد دیجئے تو آفریں ہے، جو ظلم کیجئے تو مرحبا ہے

اسے ہم بھی جھوٹا سمجھتے ہیں لیکن!   خوش آتی ہیں باتیں بنانی کسی کی
پھر رہا ہے وہ آج کچھ خوش خوش   تو نے ناظم سے کیا کہا ہو گا!

چھیڑ چھاڑ ناظم شوخ و شنگ طبیعت کے مالک ہیں، محبوب پر بھی کبھی کوئی فقرہ کس دیتے ہیں، دل کی بھڑاس نکالنے کا کوئی نہ کوئی موقع نکال ہی لیتے ہیں، فرماتے ہیں، :

پنے مقصد کے لئے تو بھی مگر لائے رجوع   کاش مجذوب کہیں سب ترے دیوانے کو

نکلت کیا ہے گر صورت میں مہر و مہ سے بہتر ہو
طریق ظلم میں بھی دو قدم گردوں سے بڑھ کر ہو

رہا ناظم کوئی دن اور زندہ   ترے ناوک نے سنتا ہوں خطا کی

ناظم کبھی نہ کوچے میں تیرے قدم رکھے   بیچارہ کیا کرے کہ یہی رہ گزار ہے

دیکھو تو کہ وہ غصہ میں کیا کرتے ہیں ناظم
کیوں ان سے کبھی شکوۂ بے جا نہیں کرتے

شوخی شعرا کا ایک اہم موضوع رندی و سرمستی، شوخی و بذلہ سنجی اور واعظ و ناصح کے ساتھ جنگ و جدل ہے، بلا استثنا ہر شاعر نے بقدر زور طبیعت واعظ و ناصح کی پگڑی اچھالی ہے، آوازے کسے ہیں اور ان بیچارو کو ہر طرح آماجگاہ زور طبع بنایا ہے، ناظم بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں، وہ بھی اپنی رندی و سرمستی کی حکایتیں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، انھیں بھی جب واعظ و ناصح سے پالا پڑتا ہے تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے وہ فقرے کستے ہیں

خدا کا خوف ہو تو دل کی بے تابی پہ رحم آئے
وگر نہ رقص مرغ نیم بسمل بھی تماشا ہے

تم خوش ہوئے ہو بزم میں آنے سے غیر کے
یہ بھی خبر نہیں ہے کہ ناظم خفا گیا

آئے تھے پونچھنے مرے آنسو کدھر چلے
گھبرا گئے تراوش خون جگر سے آپ!

پتے کی باتیں ناظم چونکہ ایک تجربے کار عاشق ہیں، راہ محبت کے گرم و سرد سے واقف ہیں اس لیے مجوبات کہتے ہیں اس شان سے کہ

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے

مثلاً کہتے ہیں :

ملتا ہے امتحان وفا میں مزا ہنوز
ناظم اگرچہ تجربہ سو بار ہو چکا

ناظم وفائے وعدہ کی امید ہے کسے
مرنا بھی اس فریب میں دشوار ہو گیا

بھید کے معلوم کرنے کے لیے غمخوار ہیں
عاشق زار اس کے ہیں کہنے کو تیرے یار ہیں

سادہ رویوں کو غلط کہتے ہو ناظم سادہ دل
ان کو بھولا کون کہتا ہے بڑے ہشیار ہیں

ہے وہ تقریب فراق اور یہ تمہید وصال
وصل سے لطف سوا نامہ و پیغام میں ہے

پڑھتا ہے شراب پی کے لاحول ناظم رندوں میں پارسا ہے

حقائق ناظم صرف ایک عاشق ناکام ہی نہیں ہیں کہ جن کا صحیفۂ زندگی عشق و محبت کی داستانوں، ہوا و ہوس کی شکایتوں اور رندی و سرمستی کے ولولوں سے لبریز ہو، بلکہ وہ صحیح معنوں میں ایک شاعر ہیں، ان کی نظر فطرت کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے، اور وہ سب کچھ دیکھتے ہیں جو ایک مفکر دیکھ سکتا ہے، جب وہ حقائق و معارف، اسرار و نکات، اور حکمت و موعظت پر کچھ کہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، ایک نکتہ رس اور دقیقہ سنج فلسفی ہے جو رموز فطرت کی گرہ کشائی کر رہا ہے، منصور اور نعرۂ منصور پر تقریباً ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے، لیکن ناظم نے اس مسئلہ پر جو بات کہی ہے وہ نہ صرف اپنے انداز بیان کے اعتبار سے بہت خوب ہے بلکہ نفس مسئلہ پر انھوں نے جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی دقّت نظر پر شاہد ہے :۔

اے نواسنج انا الحق ترا دعویٰ سچ ہے
لیک دستور نہیں قطرہ کو دریا کہنا

اس موقع پر مجھے اکبر الہ آبادی کا بھی ایک شعر مجھے یاد آگیا، انھوں نے بھی بہت معقول بات کہی ہے، فرماتے ہیں :۔

حضرت منصور "انا" بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ
دار تک تکلیف فرمائیں جو اتنا ہوش ہے

اکبر صاحب کہتے ہیں کہ منصور "حق" کے ساتھ "انا" بھی کہہ رہے ہیں، جب ان میں اتنا ہوش ہے کہ "انانیت" اب تک باقی ہے تو وہ مستحق دار ہیں، یہ بات تو وہی کہہ سکتا ہے، جس کے ہوش و حواس گم ہو چکے ہوں اور آنا واصل بالحق

کہ شاید ناصح صاحب یا واعظ صاحب بھی ہنسے بغیر نہ رہتے ہوں، لیکن ابتذال و سوقیت کی ہوا کبھی نہیں لگنے دی، درحقیقت یہ وادی ہے بھی بہت خار دار، ابتذال شوخی میں بہت کم فرق ہے، ذرا ابتذال کا رنگ آیا، کہ شعر نظر سے گرا، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ شاعر نظر سے گرا،

لیکن ناظم نے سنجیدگی اور ظرافت کو ساتھ ساتھ نباہنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے، مثلاً"

واعظ و شیخ سبھی خوب ہیں کیا بتلاؤں
میں نے مے خانہ سے کس کس کو نکلتے دیکھا

لی محتسب نے گھر کی تلاشی تو کیا ہوا
نکلا سبوئے کہنہ میں سرکہ بھرا ہوا

زاہد کو کیوں شراب کا یارب مزا پڑا
رسوائے شہر و کوچہ و بازار ہو گیا

حرمتِ مے میں سنا کیجئے واعظ کا بیان
بحث نادان سے کیوں کیجئے دانا ہو کر

معقول ہی سہی وجد کا حیلہ مگر اے شیخ
اچھا نہیں باایں ہمہ تمکین و حیا رقص

معرفت عالم و عابد کو کہاں ہے ناظم
بس یہ اتنے ہیں کہ اوراد و مسائل جانیں

اس بت کا کوچہ مسجد جامع نہیں ہے شیخ
اٹھئے اور اپنا یاں سے مصلا اٹھائیے

مجلس اہل ورع نور کا دریا ہی سہی دل لگی صحبت رنداں مۓ آشام میں ہے

تسبیح و ورد و دلق و مصلّٰے نہیں پسند چنگ و رباب و ساغر و مینا پسند ہے

ندرت تشبیہ تشبیہ و استعارے کو صحیح طور سے استعمال کرنا بھی ایک کمال ہے،

ناظم پامال تشبیہ میں بھی ایک خاص بات پیدا کر دیتے ہیں، !

ے وہ ایسا ہی سہی پر ہے تنزل در پیش

بد شگونی ہے جو تجھ کو مہ کامل سمجھیں

توارد ناظم کے کلام کا تمام و کمال مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دیوان میں ایسے اشعار بھی ہیں جو غالبؔ سے یا بعض اور شعرا کے اشعار سے ٹکراتے ہیں۔ :

ناظم کا شعر ہے،

پڑھ کے خط نام غیر ان کو حال اپنا سنا دیا ہم نے !

اسی مفہوم کا ایک مشہور شعر یہ بھی ہے،

سناتے ہیں انھیں افسانۂ قیس بہانے ہیں بہ عرض مدعا کے

ناظمؔ :- الفت بری بلا ہے کہ ناظمؔ با ایں تمیز کرنی پڑی رقیب کی بھی التجا مجھے !

مومنؔ :- اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل

میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ناظمؔ :- لگاوٹ غیر سے اسکی جلا کر خاک کر دیتی

سمجھتے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بے مہر کس سے ہے

ہو چکا ہو کہ یہ سمجھ رہا ہو کہ میں اس حقیقت سے مل گیا، لیکن جو شخص اس منزل پر پہنچ جائے گا وہ "من و تو" کے امتیاز سے بیگانہ ہو جائے گا، اور جو ابھی اس منزل میں ہیں کہ آپ کو "انا" کا احساس ہے تو آپ دار تک تکلیف کیجئے،

ناظم کہتے ہیں "انا الحق کا دعویٰ صحیح ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ قطرہ کو دریا کہنا کب مناسب ہے ایک قطرے کو یہ کب زیب دیتا ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرنے لگے کہ دریا میں ہوں، معلوم ہوتا ہے تم اپنی حقیقت ہی نہیں سمجھتے۔

کون ہوگا کہ نہ ہو معتقد فصل بہار　　موسم اچھا ہے یہ کہئے یہ موسم کنگ

جو خود برے ہیں کیوں مجھے اچھا کہیں گے وہ　　آئینہ کو فروغ نہیں زنگبار میں

تم اپنی چال سے بدنام ہو گئے ناظم　　یہ اہل صومعہ چھپ چھپ کے کیا نہیں کرتے

ہم تو پروانے کے قائل ہیں کہ چپکا جل جائے
بلبل نغمہ سرا عاشق غوغائی ہے!

عیش و مستی

اوپر کہا جا چکا ہے کہ ناظم کی زندگی کا ماحول عیش و عشرت تھا، چنگ و رباب تھا، ساغر و مینا تھا، لیکن اس ماحول سے بغاوت کر کے انھوں نے ایک نئی "شاہراہ" نکالی تھی جو وادی نجد میں جا کر ختم ہو جاتی تھی، لیکن پھر بھی وہ زندگی جس میں ان کی پرورش ہوئی تھی کبھی کبھی "خوش باش دمے کہ زندگانی اینست" کی دعوت بھی دے دیتی ہے، اور بعض بعض مواقع پر ان جذبات عیش و مسرت کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے، نمونہ،

شراب و شاہد و مطرب سے کام رکھ ناظم　　کسے خبر ہے کہ انجام کار کیا ہوگا!

زمانے میں تو شاعری، رعایت لفظی، ضلع جگت، اور پھکڑ بازی ہی میں منحصر ہو کے رہ گئی تھی، لیکن ناظم اس معاملے میں فرد فرید ہیں، میں نے ان کے پورے کلام کا مطالعہ کیا ہے، اور اس موضوع پر ان کے جو اشعار میں نے جمع کیے ان میں عیب تلاش کیے، لیکن اس کا اعتراف ہے کہ کم از کم میری نظر میں کوئی شعر نہیں کھٹکا، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑے کمال کی بات ہے کہ رعایت لفظی جیسی صنعت میں کسی شاعر نے سیکڑوں اشعار کہے ہوں اور ایک بھی ایسا نہ ملے جو مہمل کہا جا سکے یا جس سے لطف زبان میں ذرا بھی رکاوٹ پیدا ہوتی ہو، نمونتہً چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمایئے وہ الفاظ خط کشیدہ ہیں، جن سے اس صنعت کو ظاہر کیا گیا ہے:۔

کیوں آئے ہو تربت پہ مری ساتھ عدو کے   میں مردہ ہوں مردہ کو بلانا نہیں اچھا

ناظم نہ رکھو اس آہوے وحشی سی چشم لطف   جس میں نہیں ہے اُنس وہ انسان ہی نہیں

محو نظر بندی بچشم وہ طالع کو مل گئی   بے دخل کس کو بخشش پروردگار میں

تم بھی بن جاؤ گے لیلی کی نظیر   نہ کہو قیس کا ہمسر مجھ کو

رخصت عرض حال کیا مانگوں!   کہو نہ بیٹھیں کہیں کہ "رخصت ہو"

بے وفائی کا داغ کیسا ہے   ہم نے مانا کہ ماہ طلعت ہو

منہ ترا دیکھنا نصیب نہ ہو   منہ سے نکلی اگر شکایت ہو

غالبؔ :- رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

فاظمؔ :- کبھی نے کسی بات پہ تکرار نکالی   دیکھا مجھے اور آپ نے تلوار نکالی
غالبؔ :- ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے!

فاظمؔ :- یار محفل میں نہ ملتا تھا کسی دن اور اب
روز دو چار گھڑی رہتی ہے خلوت مجھ سے

میرؔ :- کئی بار آنا ادھر لطف سے   عطا پر عطا ہے کرم پر کرم پر!
فاظمؔ :- ملے گی محشر میں داد ہم کو بندھا ہے یہ اعتقاد ہم کو
ملی نہ واں بھی مراد ہم کو تو پھر بتاؤ کہ کیا کریں گے

غالبؔ :- وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع تھی کہ واں ہو جائے گا

فاظمؔ :- عاشق ہوا اس آفت جاں پر مرا ندیم
جب خوب میرا محرم اسرار ہو چکا!

غالبؔ :- ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
ہو گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

ایہام گوئی ایہام گوئی یا رعایت لفظی کا اگر موقع سے استعمال کیا جائے تو لطف کلام دوبالا ہو جاتا ہے، قدیم شعرا کے دواوین اٹھا کر دیکھیئے تو معلوم ہوگا، کہ تقریباً ہر شاعر نے اس "صنعت لطیف" سے اپنے کلام کو زینت دینا چاہی ہے، لیکن جب اس قسم کے اشعار کا استقصا کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ۹۵ فیصدی اشعار نہایت مہمل طور سے خراب ہو کے رہ گئے ہیں ایک

کیا اس نے قتل اوروں نے معاف   عبث اہل شہر اس کا چرچا کریں

خدا کو دینی ہے جان ہمدم، نہیں ہے مرنے کا مجھ کو کچھ غم
یہی ہے رونا کہ میں نہ ہوں گا تو پھر وہ کس پر جفا کریں گے

ڈرتے ہیں محتسب سے بھلا آئے تو سہی   اچھی کہی کہ ساغر و مینا اٹھائیے

کرتے ہیں عبث غرور کیا آپ؟   ہیں کوئی جناب کبریا آپ؟

وعدے نے ترے زیست کی توقیر بڑھائی
مرتے ہیں پہ مرنے کی تمنا نہیں کرتے

شہرت نہیں مجنوں کے برابر یہ مسلّم   پر کوئی نہ جانے ہمیں ایسے بھی نہیں ہم

خضر ہے وادیٔ محبت کا   کیوں نہ ناظم کے ہم قدم ہو ہیں

چند اور اشعار ناظم کی وہ مشہور نظم جو "میں نے کہا کہ دعویٰ الفت مگر غلط" سے شروع ہے، اور وہ غزل جس کا آغاز "وہ حسن نہیں نام خدا اور ہی کچھ ہے" سے ہوتا ہے طوالت کے خیال سے قصداً نظر انداز کر دی ہیں اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں بہت مشہور ہیں، یہاں یہ ضرورت نہیں تھی کہ ان کا دوبارہ ذکر کیا جائے۔ اس صحبت کا مقصد تو صرف غیر معروف اشعار کی رونمائی تھی اور بس۔

وہ اُٹھے محفل سے ناظم مجھ کو آتا دیکھ کر اور میں سمجھا کہ اُٹھتے ہیں مری تعظیم کو

تکلف کیا ہے گر صورت میں ہر دم سے بہتر ہو
طریق ظلم میں بھی دو قدم گردوں سے بڑھ کر ہو

پھوٹی دیکھی جو صراحی مے کی میں نے جانا مری قسمت ہوگی

اس کو یوں خاک پہ لے محتسب شرع نہ پھینک
حرمت بادہ بہت مشرب اسلام میں ہے

بہت کہنے سے آجاتی ہے ضد انسان کو ناظم نہ کر تکرار ان سے گو مزا تکرار میں آئے

مردہ زندوں کو تری آن سے ہم دیکھتے ہیں زندہ مردوں کو تری تان سے ہم دیکھتے ہیں

خط مرا پڑھ کے نہیں رحم تو آیا لیکن یہ بھی قسمت کا لکھا تھا کہ پڑھا تیر بعد

متفرق اشعار

ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں، ان میں سے ہر شعر کے اندر کوئی نہ کوئی خوبی ضرور موجود ہے لیکن چونکہ منتخب اشعار کی تعداد کم ہے اس لئے کسی مخصوص عنوان کے ساتھ دو ایک شعر کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا، :

تم کرو ترک جفا کب امکان! ہم کریں ترک وفا کیا باعث!

مرگئے ہم تو مٹ گئے سب رنج   یہ بھی اچھا ہوا بُرا نہ ہوا !

ٹوکا جو بزمِ غیر سے آتے ہوئے انھیں   کہتے بنا نہ کچھ وہ قسم کھاکے رہ گئے

ہے ایک درِ پیرِ مغاں تک تو رسائی   ہم بادہ پرستوں کا کہاں اور ٹھکانا

شوقِ مے دل میں لب پہ ہجوِ شراب   ہم پہ روشن ہیں سب جناب کے رنگ

رندوں نے پچھاڑ کر پلا دی   واعظ کے نہ چل سکے بہانے

کہتا ہے انھیں یہ کہ نہ ہم ہوں گے مخاطب   پر کہتے نہیں زلف بناتے ہیں لگے ہیں

انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار   ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی !

پھر بھی ہے تم کو مسیحائی کا دعویٰ دیکھو   مجھ کو دیکھو مرے مرنے کی تمنا دیکھو

روٹھنا آپ پہ کون آپ نے یہ بھی نہ سنا   آپ کی جان سے دور آپ سے شکوا ہے مجھے

پرسشِ حال پہ ہے خاطرِ جاناں مائل   جرأتِ کوششِ اظہار کہاں سے لاؤں

کیا بے پروا کو خودبین وخودآرا کردیا   کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

حسرت کے چند نشتر

ہندوستان کے غزل گو شعرا میں حسرت موہانی، غزل سرائی کے امام مانے جاتے ہیں، اگر حسرت نہ ہوتے، تو ملک میں غزل کی شاعری ختم ہو چکی ہوتی،

ذیل میں کلامِ حسرت کے چند نشتر درج کیے جاتے ہیں:-

حضورِ مجھ پہ نہ خدا منع کریں عطا اپنی کہ مستحق ہوں جفا ہائے التزامی کا

نگاہِ یار بھی کس کس ادا سے لطف کرتی ہے
تغافل ہائے پیدا میں نوازش ہائے پنہاں ہیں

مایوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا

عاشقی میں ہے زیب فرقِ جنوں طرۂ افتخار بدنامی!

تجھ کو پاسِ وضع ذرا نہ ہو ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا

چمن بے نظیر

اردو کی ایک بہت پرانی اور نایاب کتاب "چمن بے نظیر" عرصہ ہوا نظر سے گزری تھی، کتاب کے مصنف کا نام "محمد ابراہیم بن شہاب الدین" ہے کتاب دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں فارسی کا منتخب کلام ہے، دوسرے حصہ میں اردو کا، جس میں میر، غالب، جرأت، سوز، مومن، درد، انشا، سودا، مصحفی، ذوق، نظیر اکبرآبادی، صہبا، نسیم، اور بہادر شاہ ظفر جیسے یگانۂ روزگار استادوں کے کلام کا انتخاب درج ہے،

میں نے اس چمن بے نظیر سے، ایک ننھا سا گلزار الگ بنایا ہے جن کی رسائی "چمن بے نظیر" تک نہیں ہو سکتی، وہ یقیناً اسے بھی بہت کچھ سمجھیں گے۔

خواجہ میر درد

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

محتسب آج ترے ہاتھوں سے میخانہ میں
دل نہ تھا کوئی کہ شیشہ کی طرح چور نہ تھا

قصۂ شوق کہوں درد کا افسانہ کہوں   دل ہو تاب ہو میں تو اس شوخ سے کیا کیا کہوں

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی   دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر   ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

رنج راحت ہو سکونِ غمِ ہجراں کی قسم   یادِ جاناں کی قسم جلوۂ جاناں کی قسم
خوف سے جور کئے جائیں وہ اربابِ وفا   خوش بہر حال ہیں عیشِ غمِ پنہاں کی قسم

حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے   اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

بھلا دیتی ہیں سب رنج و الم حیرانیاں میری   تری تمکین بے حد کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

باہوس زبوں ہوتے تو دور اگر ہوتا   ہم کچھ نہ تجھے کہتے مجبور اگر ہوتا

مجھ کو جتنا ہی تم سے انس بڑھا   جس قدر تم کو اجتناب ہوا

دل نے چھوڑا ہے نہ چھوڑے ترے ملنے کا خیال
بار ہا دیکھ لیا ہم نے ملامت کر کے

میرؔ

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا   تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

دیکھ میرا رونا اس نے ہنس دیا   برق چمکی ابر باراں تھم رہا!

ایضاً

دیر و حرم میں کیونکہ قدم رکھ سکیگا میرؔ   ایدھر تو اس سے بت پھرے اودھر خدا پھرا

نظیرؔ

کھڑا تھا اک بت پری وش، نرالی سج دھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو دس برس کی پہ قہر آفت غضب خدا کا

جو شکل دیکھو تو بھولی بھالی جو باتیں سنیئے تو میٹھی میٹھی
پہ دل وہ پتھر کہ سر اڑا دے جو نام لیجے کبھی وفا کا

جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت، کہ چلتے چلتے قدم قدم پر
کسی کو ٹھوکر، کسیکو جھڑکی، کسیکو گالی پٹ لڑاکا !

یہ راہ چلنے میں چلبلاہٹ کہ دل کہیں ہے نظر کہیں ہے
کہاں کا اونچا کہاں کا نیچا، خیال کس کو قدم کی جا کا

اٹھائے آنکھیں وہ بے حجابی کہ پھر پلک سے پلک نہ مارے
جو غنچہ پی کرے تو گویا کھلا سراپا چمن حیا کا

یہ چنچلاہٹ، یہ جھنجھلاہٹ، خبر نہ سر کی، نہ تن کی سدھ بدھ
جو چیرا بکھرا، بلا سے بکھرا نہ بند باندھا کبھو قبا کا

کسی گھڑی میں یہ شتابی کہ مثل بجلی کے اضطرابی،
یہاں جو چمکا چمک چمک کر، کہیں جو لپکا تو جا جھپاکا

دردؔ کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانا — اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

مومنؔ خاں

مل ایسے شوخ کو مومنؔ نے دیدیا کہ وہ ہے — محب حسینؑ کا اور دل رکھے شمر کا سا

میرؔ

چمن میں گل نے جو کل دعوئ جمال کیا — جمال یار نے منہ خوب اس کا لال کیا
لگا نہ دل کو کہیں کیا نہیں سنا تو نے — جو کچھ کہ میرؔ کا اس عاشقی نے حال کیا

نظیرؔ اکبر آبادی

ملا آج مجکو وہ چنچل چھبیلا — ہوا رنگ سنکر رقیبوں کا نیلا
کیا جس نے مجھسے عداوت کا پنجہ — سنلقی علیہم عذاباً ثقیلا
نکل انکی زلفوں کی کوچہ سے اے دل — تو پڑھتا قم اللیل الا قلیلا
کہستاں میں ماروں اگر آہ کا دم — فکانت جبالا کثیبا مہیلا
نظیرؔ اس کے فضل و کرم پر نظر رکھ — فقل حسبی اللہ نعم الوکیلا

دردؔ

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
حیف کہتے ہیں ہوا تاراج گلزار جہاں — آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا
ہو گیا مہماں سرائے کثرت موہوم آہ — وہ دل خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا
بھول جا خوش رہ عبث وہ سابقے مت یاد کر — دردؔ یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

مزہ رکھتا ہے زخم خنجر عشق! کبھی اے بوالہوس کھایا تو ہوتا
جو کچھ ہونا سو ہوتا تو نے تقدیر وہاں تک مجھکو پہنچایا تو ہوتا!

درد

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا کہ نہ ہنستے میں رو دیا ہوگا!
اس نے قصداً بھی میری باتوں کو نہ سنا ہوگا گر سنا ہوگا
دل زمانے کے ہاتھ سے سالم کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا
دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

میر

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا
امیدوار وعدۂ دیدار مر چلے آتے ہی آتے میر قیامت کو کیا ہوا
جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف اے کشتۂ ستم تیری غیرت کو کیا ہوا

سوز

وہ ساعت کون سی تھی یا الٰہی کہ جس ساعت دوچار اس سے ہوا تھا
میں اپنے ہاتھ اپنے دل کو کھویا خداوندا میں کیوں عاشق ہوا تھا
وہ مجھکو ذبح کرتا تھا خوشی سے میں اس کی تیز دستی تک رہا تھا

میر

اے دوست کوئی مجھ سا رسوا نہ ہوا ہوگا دشمن کے بھی دشمن پر ایسا نہ ہوا ہوگا

نہ وہ سنبھلا لا کسی کے سنبھلے، نہ وہ منایا منے کسی سے
جو قتل عاشق پہ آ کے مچلے تو غیر کا پھر نہ آشنا کا
نظر ہٹ جا، پرے سرک جا، بدل کے تیور چھپا کے
جو دیکھ لیوے گا وہ ستمگر تو یار ہوگا ابھی جھگڑا کا!

نسیم

گر ہم نے دل صنم کو دیا پھر کسی کو کیا
اسلام چھوڑ کفر لیا پھر کسی کو کیا
ہم نے تو آپ اپنا گریباں کیا ہے چاک
آپی سیا بیا نہ سیا پھر کسی کو کیا
اپنی تو زندگی میاں مثل حباب ہے
گو خضر لاکھ برس جیا پھر کسی کو کیا
دنیا میں آ گئے ہم نے بھلا یا بُرا نسیمؔ
جو کچھ کیا سو ہم نے کیا پھر کسی کو کیا

سودا

کہتا ہے نگہ سے یہ ترا گوشۂ ابرو
دیکھے جو کوئی خون گرفتہ تو لگا لا
مانگا جو ہیں دل کو تو کہا بس یہی اک دل؟
جتنے ہی تو چاہے مرے کوچے سے اٹھا لا

مومن

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا
نہ ہے تو کسی کا، نہ ہوگا کسی کا
نہ میری سنے وہ نہ ہی ناصحوں کی
نہیں مانتا کوئی کہنا کسی کا
وہ کرتے ہیں بیباک عاشق کشی یوں
نہیں کوئی دنیا میں گویا کسی کا

ظفر

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا!
کوئی یاں تک اسے لایا تو ہوتا!

سوداؔ

اسلام چھوڑ ہم نے کیا کفر اختیار   تو بھی وہ بت نہ رام ہوا اے خدا عجب
کی سیر ملک ملک کی سوداؔ نے بھی ولے   اے شیخ میکدہ کی ہے آب و ہوا عجب

ایضاً

دست ہر چند ہمارا ہے مؤذّن لیکن   دشمن خواب ہے جوں مرغ سحر آخر شب
تماشا عیش جہاں کا جو تو دیکھا چاہے   بزم مستاں پہ نظر غور سے کر آخر شب

میرؔ

کیسی مسجد، کیسا میخانہ، کہاں کے شیخ و شاب   ایک گردش میں تری چشم سیہ کی سب خراب

ظفرؔ

ملے ہے راہ اگر دل کو تو ہو جاوے گی   بے خبر تجکو محبت کی خبر آپ سے آپ

میرؔ

کیا ازل میں ملا نہ لوگوں کو   تھی ہماری بھی میرؔ کیا قسمت

ایضاً

سر بسر مست جہاں سے جا غافل   پاؤں تیرا جہاں پڑے ٹک سوچ
ہمیں آنا پڑا ہے یاں کیوں تو   یار اگلے گئے کہاں ٹک سوچ
ہونٹ اپنا ہلا نہ سمجھے بن   یعنی جب کھولے تو زباں ٹک سوچ
گل رنگ و بہار پردے ہیں   ہر عیاں میں ہے وہ نہاں ٹک سوچ

ٹک گورِ غریباں کی کر سیر کہ دنیا میں　　ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہوگا

ظفرؔ

دیکھ مجھکو بتِ بے پیر نے منہ پھیر لیا　　آج مجھ سے مری تقدیر نے منہ پھیر لیا
عقل نے ہوش نے تقدیر نے منہ پھیر لیا　　بس مری آہ سے تاثیر نے منہ پھیر لیا
میں تو تڑپا بھی دمِ قتل نہیں اے قاتل　　کیا سبب جو تری شمشیر نے منہ پھیر لیا

حسنؔ

قمارِ محبت میں بازی سدا　　وہ جیتا کیا اور میں ہار گیا

سوداؔ

تجھ قید سے دل ہو کر آزاد بہت رویا　　لذت کو اسیری کی کر یاد بہت رویا
سوداؔ سے یہ میں پوچھا دل میں بھی کسیکو دوں　　وہ کر کے بیاں اپنی روداد بہت رویا

سوداؔ

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر　　لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا
سوداؔ نگاہِ دیدۂ تحقیق کے حضور　　جلوہ ہر ایک ذرّے میں ہے آفتاب کا

آتشؔ

ہر حال میں ہے اپنے مرا یار دلفریب　　گفتار دل فریب ہے رفتار دل فریب
مژگان چشم یار کی تعریف کیا کروں　　جاں کاہ، جاں خراش، دل آزار دلفریب

تو اور آرائش خمِ کاکل　　میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
ہوں گرفتار الفت صیاد　　ورنہ باقی ہے طاقت پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے　　ناز کھینچوں بجائے حسرت ناز

انشا

صدقے اس ناز کے انشا سے یہ کہنا چل بے
چوٹ لگتی ہے، ہوا درد، مرے ہونٹ نہ چوس

ایضاً

شفا اب اس نے تصدق سر اپنے دی مجکو　　ہزار شکر کہ سب دفع ہو گئے امراض
وگرنہ دیکھ کے انشا کی نبض ہوتا تھا　　غریق بحر تحیر مسیح سا نباض!

سودا

فضل حق جس کی طرف ہو تو اسے بخشے ہے　　دور ساغر کی طرح گردش ایام نشاط
دل جنوں کا ہے اسیری کے مزے سے آگاہ　　ہے قفس بیچ انہیں عیش و نہ دام نشاط

ایضاً

شُغل ہوں نہ کریں رند تیری داڑھی کا　　تبرکات ہیں داخل ہر ایک مو واعظ

انشا

بیٹھا ہے آج مجلس رنداں میں شیخ یوں　　طوطی کے پاس جیسے کوئی ہم قفس ہو زاغ

سودا

کسے چھپے ہے کے رسوا ہو وہ بیمار عشق　　عشق کو یارو چھپا سکتا نہیں انکار عشق

فائدہ سر جھکے سے پیری میں — پیری سے آگے اے جواں تک رہ جا

سوداؔ

نہ جائیو کبھی اے شیخ بزم رنداں میں — کہ تو وقار طلب ان کی بے زبان گستاخ

میرؔ

ہیں مکان و سراؤ جا خالی — یار سب کوچ کر گئے شاید
شور بازار سے نہیں اٹھتا — رات کو میرؔ مر گئے شاید

دردؔ

کیا کہوں دل کا کسی سے قصۂ آوارگی — کوئی بھی بے ربط ہوتی ہے کہانی اس قد
دردؔ تو کرتا ہے معنی کے تئیں صورت پذیر — دسترس رکھتے ہیں کب بہزاد و مانی اس قد

میرؔ

اپنے مزاج میں بھی ہے میرؔ ضد نہایت — پھر مر ہی کے اُٹھیں گے بیٹھیں گے ہم جو

سوداؔ

پوجوں ہوں میں جس بت کو خدا کا ہے تراشا — آذر نہیں لایا وہ مرے واسطے گھڑ کر

غالبؔ

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز

سودا

غرض کفر سے کچھ نہ دیں سے ہے مطلب   تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں!
نوشتے کو میرے مٹاتے ہیں رو رو   ملائک جو لوح و قلم دیکھتے ہیں
خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھاوے   کہ جو دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں

انشا

شیخی اتنی نہ کر اے شیخ کہ رندان جہاں   اونگلیوں پر تجھے چاہیں تو نچا سکتے ہیں
گروہ فقرا کو نہ سمجھ بے جبروت   ذات مولائی میں یہ لوگ سما سکتے ہیں

میر

جنون میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں
نہ چوب گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں
صنم کی زلف میں کوچہ ہے سر بستہ ہر اک مو پر
نہ دیکھی ہوں گی تو نے خضر یہ ظلمات میں گلیاں
دوانہ ہو گیا تو میر آخر ریختہ کہہ کر!
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

درد

ہر شام مثل شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثل صبح گریباں دریدہ ہوں

مومنؔ

ٹھانی تھی جی میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم ✻ پہ کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم ✻ منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

میرؔ

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے ✻ سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

نظیرؔ

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم ✻ بس ترستے ہی چلے افسوس پیمانے کو ہم
مے بھی ہے مینا بھی ہے ساغر بھی ہے ساقی نہیں ✻ دل میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم
باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

میرؔ

کئی بار آنا ادھر لطف سے ✻ عطا پر عطا ہے کرم پر کرم
خطرناک تھی وادیٔ عشق میرؔ ✻ گئے اُس پہ بھی ہم قدم پر قدم

دردؔ

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر ✻ اے دردؔ آ کے بیعت دستِ سبو ک

سودا

باتیں کدھر گئیں وہ تری بھولی بھولیاں
دل لیکے بولتا ہے جواب تو یہ بولیاں

حیرت نے اس کو بند نہ کرنے دی پھر کبھو
آنکھیں جس آدمی نے ترے منہ پہ کھولیاں

سودا کے دل سے صاف نہ رہتی تھی زلف یار
شانے نے بیچ پڑکے گرہ اس کی کھولیاں

نظیر

دل کی بے تابی نہیں ٹھہرنے دیتی ہو مجھے! دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

میر

عام حکم شراب کرتا ہوں
محتسب کو کباب کرتا ہوں

ٹک تو رہ اے بنائے ہستی تو
تجھ کو کیا ہی خراب کرتا ہوں

جی میں پھرتا ہے میرؔ وہ میرے
جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں

جرأت

ہم تو کہتے تھے نہ عاشق ہو اب آنا تو بتا
جاکے ہم روتے ہیں پہروں پس دیوار کہ تو ؟

دہشت عشق بری ہوتی ہے دیکھا ناداں
ہم چلے دشت کو اب چھوڑ کے گھر بار کو

میرؔ

ضعف بہت ہے میرؔ تمھیں کچھ اس کی گلی میں مت جاؤ
صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

سوزؔ

مری جان جاتی ہے یارو سنبھالو کلیجے میں کانٹا لگا ہے نکالو!
نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو!

میرؔ

اب دھواں یوں جگر سے اٹھتا ہے جیسے پُرپیچ کوئی کاکل ہو!

انشاؔ

چھیڑنے کا تو مزا تب ہے کہو اور سنو بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو
تم کہو گے جسے کچھ کیوں نہ کہیگا تم کو چھوڑ دیویگا بھلا، دیکھ تو لو اور سنو

مومنؔ

اللہ ری گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر مومنؔ چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کیساتھ

دردؔ

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

سوداؔ

کیا ضد ہے خدا جانیے مجھ ساتھ وگرنہ
کافی ہے تسلی کو مری، ایک نظر بھی

نظیرؔ

دارا رہا نہ جم، نہ سکندر سا بادشاہ
تخت زمیں پہ سیکڑوں آئے چلے گئے!

آدم رہا، نہ کوئی پیمبر نہیں رہا
وہ بھی اسی زمیں میں سمائے چلے گئے

میرؔ

خوش رہیں دیوانگی میرؔ سے سب — کیا جنون کر گیا شعور سے وہ

مومنؔ

وہ چلا جان چلی، دونوں یہاں تک کھسکے — اوسکو تھاموں کہ اسے؛ پاؤں پڑوں کس کس کے

دردؔ

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے یہ کہ جہاں تو سما سکے
قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے — اوس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

مومنؔ

آج اس بزم میں طوفان اٹھا کے اٹھے — یاں تلک روئے کہ اوسکو بھی رلا کے اٹھے
اف رے گرمی محبت کہ ترے سوختہ جاں — جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اٹھے

میرؔ

کشورِ عشق کو آباد نہ دیکھا ہم نے — ہر گلی کوچے میں تھے اوجڑے پڑے گھر کے

جرأتؔ

چونک پڑا سنتے ہی آواز یار — میں یہی سمجھا کہ پکارا مجھے

گل کدہ

میرؔ

مجکو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں ۔۔۔ ہیں جوں نسیم بادہ فروش چمن نہیں
کل جاکے ہم نے میرؔ کے در پر سنا جواب ۔۔۔ مدت ہوئی کہ یاں وہ غریب الوطن نہیں

سوداؔ

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے ۔۔۔ دعوےٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
ہیں حضرت سوداؔ کو سنا بولتے یارو ۔۔۔ اللہ رے اللہ رے کیا زور بیاں ہے

شعر سوداؔ حدیث قدسی ہے ۔۔۔ چاہیے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

سوداؔ خدا کے واسطے کر قصہ مختصر ۔۔۔ اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

تو ہی کچھ اپنے سر پہ نہ یاں خاک کر گئی ۔۔۔ شبنم بھی اس چمن سے صبا چشم تر گئی

یہ کہہ کر مر گئی بلبل قفس میں ۔۔۔ نہ ہو بندہ کسی بندہ کے بس میں

مجھ چشم سے اب اشک نہیں آئے گا ناصح　　آوے بھی غم دل سے تو لخت جگر آوے

میرؔ

کہیں جس سے کروں تیری بیوفائی کا　　جہاں میں نام نہ لے پھر وہ آشنائی کا

سوداؔ

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفت دیں کو　　خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

میرؔ

یک محروم چلے میرؔ ہمیں دُنیا سے　　ورنہ عالم کو زمانہ نے دیا کیا کیا کچھ

سوداؔ

اُنے سوداؔ کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں　　یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں؟

بارے میں معلومات اس درجہ قلیل اور تشنہ کیوں ہیں ؟ میں جانتا ہوں اسٹالن کے بارے میں کچھ لکھنا اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کرنا ہے۔ "بیڈنی کا مقالہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے" "اسٹالن بڑے بھیانک طریقے سے بھونکنے لگے"۔ شاعر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، لیکن میں اس کے لیے پہلے سے تیار ہوں۔" "ایسے موقع پر توقع یہ کی جاتی ہے کہ حالات و سوانح کا ایک دروازہ کھل جائے گا۔ لیکن اس کے بجائے بیڈنی کہتا ہے کہ میں نے ایک جلسہ میں تقریر کی جس میں لینن نے بھی حصہ لیا تھا۔ میں نے لینن کا ذکر ذاتی اور مزاحیہ انداز میں کیا مجمع مسرخوشی سے ناچ اٹھا۔ خود لینن کی یہ کیفیت تھی کہ قہقہے لگا رہا تھا۔" "اس طرح مستقبل میں اسٹالن کے حملہ سے محفوظ رہنے کے لیے لینن کو سپر کے طور پر شاعر نے استعمال کر لیا۔ ممکن ہے اس نے یہ حرکت احساس تحفظ کے ماتحت کی ہو، لیکن نہیں تجربی طور پر وہ اس کی خدمت میں خراج پیش کرتا ہے، تم اسٹالن کو تباہ کر سکتے ہو، لیکن اسے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ کوئی شخص بھی اسٹالن کو اپنی انگلیوں پر نہیں نچا سکتا۔"

اسٹالن ——— شاعر کہتا ہے ——— لینن کو عقاب کہا کرتا تھا، "بیڈنی کے خیال میں یہ تعریف تحت الشعوری خود کرداریت کا نمونہ ہے۔ ۱۹۲۹ء کے شاعرانہ انشا پرداز کو اس قسم کی آزادیاں حاصل تھیں، ——— ایک مرتبہ اسٹالن نے کہا کہ لینن کا ہر جملہ بولتا نہیں گولی مارتا ہے۔" ——— آیا یہ عسکری انداز گفتگو بھی "خود کرداریت" کا نمونہ ہے یا نہیں اس کے بارے میں بیڈنی نے رائے زنی کی جرات نہیں کی، وہ اسٹالن کے بھونکنے سے بہت خائف تھا اس نے پسپا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ مقالہ جو اوپر خلاصہ کے طور پر پیش کیا گیا

اسٹالن کی شخصی زندگی!

اسٹالن انسانی خصوصیات سے بالاتر ہو کر ایک مشینی قائدہ بننا چاہتا ہے، وہ نہ صرف اپنے ماتحتوں اور عوام سے دور رہنا چاہتا ہے بلکہ وہ نگاہ عوام سے اپنی زندگی کے حقایق کو مستور رکھنا چاہتا ہے: "اسٹالن کے بارے میں کچھ کہنا بہت مشکل ہے!" ایبل نیوکینزے۔ اسٹالن کے سارے عمر کے رفیق نے ۲۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء کے پردوا میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "اسٹالن لینینسٹ پارٹی کی گذشتہ سی سالہ تاریخ کا تانا بانا بنا ہوا ہے۔!" اس کی زندگی پارٹی کی زندگی ہے۔ ایک شخص کی نہیں۔! نیوکینزے اس شخص کے بارے میں جس کا وہ ۲۹ سال تک رفیق کار رہا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اسٹالن ایک خاموش طبع انسان ہے اور مادی آسائشوں سے دہ میل نہیں کھاتا۔

پردوا کے اس شمارہ میں ڈیمیان بیڈنی نے جو مشہور روسی شاعر اور اسٹالن کے عزیز دوست تھے اس بات کو صاف کر دیا کہ اسٹالن کے

یہ وہ فطری رازداری ہے جو ایک درندہ رات کو شکار کے لئے نکلتے وقت برتتا ہے رازوں سے بھرا ہوا گھر ڈکٹیٹر کو پسند آتا ہے جہاں حقائق کو بے نقاب کرنے والی سرچ لائٹ نہیں پہنچ سکتی۔

یہ بات ہر شخص جانتا ہے اور اسے راز رکھا بھی نہیں جا سکتا کہ جب ۴۰ سال کی عمر میں اسٹالن اپنے حریفوں سے نبرد آزما تھا، وہ جنسی اعتبار سے بہت متاثر تھا اس بارے میں وہ اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ وہ غیر جذباتی سا ہو گیا تھا۔ وہ اتنا "عملی" آدمی بن گیا تھا کہ شرکائے کار کی کراہت اور نفرت کا شکار بن گیا تھا۔ اسی وقت سے ایک تغیر پیدا ہوتا نظر آیا۔ جس ملک میں، جذبات فوجی طاقت سے وابستہ ہوں اور خوبصورت عورتیں خفیہ پولیس کے ہاتھ میں ہوں وہاں کوئی زبان مخالفت میں ایک لفظ بھی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتی چنانچہ گذشتہ ۲۰ سال سے اسٹالن کے خلاف کسی قسم کی لب کشائی نہیں کی گئی شدید نفرت بدکرداری اور آوارگی کے چھوٹے سے چھوٹے حصہ کو برباد کر سکتی ہے۔ لیکن اسٹالن کے خلاف یہ نفرت ظہور پذیر نہیں ہوئی اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ یا تو وہ تائب ہو گیا یا کہن سالی نے اس کو اس قابل نہ رکھا یا پھر رازداری کی طرح اپنی جنسی خواہش پوری کرتا ہے کہ وہ ظاہر نہیں ہوتیں) بہر حال کچھ بھی ہو اسٹالن کی نجی اور جنسی زندگی افواہوں کی زد سے باہر ہے!

بچپن اور عنفوان شباب میں اسٹالن کو کیف انگیز گھریلو زندگی بسر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ بچپن میں اس کی خاندانی زندگی غربت، باپ کی شراب نوشی اور تشدد پسندی کے باعث یکسر تاریک رہی۔ آیا جوزف (اسٹالن) اپنی ماں سے محبت کرتا تھا؟ اس کا کوئی ثبوت اور شہادت موجود نہیں۔

بہت بے تکے پن سے اس کہانی پر ختم ہو جاتا ہے، بیڈ نی جولائی ۱۹۱۷ء میں پرواده کے دفتر واقع پیٹرو گراڈ میں اسٹالن کے ساتھ موجود تھا۔ بجزیرہ کرنستاد کے ملاحوں نے شہر سے باہر یہ معلوم کرنے کے لئے فون کیا کہ آیا وہ آنے والے سیاسی مظاہرے میں حصہ لیتے وقت اپنی بندوقیں بھی ساتھ رکھیں؟ "ساتھیو اس بارے میں تم خود ہی سب سے بہتر جانتے ہو!" اسٹالن نے جواب دیا، "لیکن ہم جیسے اہل قلم ہمیشہ اپنے ہتھیار اپنے پاس ہی رکھتے ہیں وہ ہمارے قلم ہیں۔ جہاں تک تمہارے ہتھیاروں کا تعلق ہے تم خود بہتر طور پر فیصلہ کر سکتے ہو، ساتھیو!" — بیڈ نی کو لطف آگیا، "اسٹالن نے ——— بیڈ نی کہتا ہے ——— اپنی چالاکی ظاہر کر دی ——— اسٹالن نے بندوقیں لے چلنے کی اجازت نہیں دی۔ ممکن تھا اس طرح اسے کسی زحمت سے (بعد میں) دوچار ہونا پڑتا، لیکن اس کی رائے کیا تھی اسے واضح طور پر اس نے بتا دیا ——— !

یہ ہے اسٹالن کی ذاتی کہانی جو اس کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر پرودا کے خاص نمبر میں آٹھ صفحوں پر شائع ہوئی تھی، اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سیاسی ہے، در قصر کریملن کے بے حیات سرکاری اسرار خانہ میں دبکی ہوئی ہے۔!

روس میں اسٹالن کی بے شمار سوانح عمریاں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان میں بھی آپ کو اسٹالن کی بیوی بچوں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں ملے گا۔ اسٹالن اس طرح دنیا کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ نجی زندگی ہی نہیں رکھتا۔ اس کی زندگی سیاست ہے جذبات نہیں جس طرح وہ سیاسیات میں پر اسرار ہے زندگی کے بارے میں بھی وہ اسی اصول پر عمل پیرا ہے

بھیجدیا۔

محبت اور جذبات کے سلسلہ میں اسٹالن کی استعداد اس کی فطرت کے لحاظ سے محدود تھی ہی لیکن وہ بھی اس کے ایک پریشان خاطر انقلابی ہونے کے باعث محدود ہوگئی۔ ۱۵/اپریل ۱۹۰۲ء کو وہ پہلی مرتبہ گرفتار ہوا اور مارچ ۱۹۱۷ء میں وہ آخری مرتبہ رہا ہوا۔ اس طویل مدت کے دوران میں وہ آٹھ برس اور ساڑھے پانچ ماہ تک زار کی جیل میں رہا یا جلاوطنی کے علاقوں میں بھٹکتا رہا ۲۲ سے ۳۷ سال کی عمر کی مدت میں اس کی آدھی زندگی اسیری میں گذری۔ ان حالات میں کوئی ایسا شخص بھی، جو اسٹالن کے مقابلہ میں زیادہ استعداد اور صلاحیت کا مالک ہوتا، اچھی خانگی زندگی نہیں بسر کر سکتا تھا۔

پہلی مرتبہ گرفتار ہونے کے بعد اسٹالن نے پونے دو سال سائبیریا میں بسر کئے وہ ۵/جنوری ۱۹۰۴ء میں وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا۔ طفلس واپس آیا اور یہاں آکر اس نے پہلی شادی کرلی، اس کی بیوی کا نام کیتھرائن تھا، وہ جارجیہ کی رہنے والی تھی۔ وہ خدا کی پوجا کرتی تھی۔ اور اس کا خاوند الحاد کی تلقین کرتا تھا۔ شوہر نے بیوی کے مذہبی معتقدات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ یہ شادی اس کے دوستوں کے بیان کے مطابق کامیاب شادی تھی ۱۹۰۶ء میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام جیکب رکھا گیا۔ سال ہی بھر کے اندر کیتھرائن تپ دق میں مبتلا ہو کر وفات پاگئی۔ اسٹالن کا ایک بچپن کا دوست جو تجہیز و تکفین میں شریک ہوا تھا لکھتا ہے کہ اسٹالن نے ماتم گساری کے عالم میں سیدھا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھا اور جنازہ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، اس تن بے جاں نے میرے سنگین دل کو ملائم کر دیا تھا، یہ مر گئی اور

پندرہ سال کی عمر میں (اپنی ماں، اور وطن گوری سے رخصت ہوکر طفلس
میں داخل ہوگیا پھر وہ اپنی ماں کے ساتھ رہنے کے لئے کبھی واپس نہیں گیا
وہ شاذونادر ہی اسے خط لکھا کرتا تھا اور شاذونادر ہی اس سے ملتا تھا ایک دفعہ مشہور امریکی صحافی
نکربوکر سے طفلس میں (۱۹۳۰ء) میں اس نے کہا کہ قیصر کریملن میں وہ صرف
ایک مرتبہ اسٹالن سے جاکر مل سکی ۔ سوسو ایک مرتبہ میرے پاس ۱۹۲۱ء میں
آیا تھا اور دوسری دفعہ آج سے ۴ سال پہلے،" وہ کہنے لگی البتہ وہ سو میل پر
سال جاتا ہے ۔" میرا خیال ہے وہ اب بھی وہیں ہے ۔" طفلس سے بری طرف
ایک گھنٹہ پرواز کی مسافت پر ہے، پھر بھی" سوسو " نے نہ کبھی اسے بیٹوں
کیا۔ نہ اپنی ماں کو اپنے راحت کدہ میں بلایا، نہ اسے کبھی خط لکھا۔

۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۷ء کے طویل وقفہ کی دو ملاقاتوں کے بعد ۱۷ اکتوبر
۱۹۳۵ء کو طفلس میں اسٹالن جاکر اس سے ملا اس نے ایک اخباری نمائندہ
سے اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے جو ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے پروردا میں چھپ
چکا ہے، کہا " وہ بالکل خلاف توقع (میرے پاس) آیا، بغیر اطلاع دئے
آٹھ برس کی طویل مدت کے بعد بیٹے کا دیدار کرنے والی بوڑھی ماں نے
کہا ۔ دروازہ کھلا، یہ یہی دروازہ اشارہ کرتی ہوئی وہ بولی۔ دیکھتی کیا
ہوں۔ وہ سامنے کھڑا ہے   بڑی دیر تک وہ میرا بوسہ لیتا رہا میں نے
بھی اسے پیار کیا!

یہ مختصر سی ملاقات والدین سے حسن سلوک کے وعظ و پند کا سوویت
پروپیگنڈہ بن گئی۔

جون ۱۹۳۷ء میں اسٹالن کی ماں مرگئی ماسکو کے اخبارات میں اس خبر کی
کوئی اشاعت نہیں ہوئی۔ البتہ جنازہ کے لئے اسٹالن نے ایک پھولوں کا

اسٹالن کی زندگی کا ایک دور ختم کر دیا۔ اب وہ زار کے تصر کریملین کا ایک مستقل مکین تھا۔ ۱۹۱۸ء میں اسٹالن نے دوسری شادی کی۔ اس دوسری بیوی کا نام نذیزا سرجیونالی لوپیف تھا۔

نذیزا کے والد سرج اور اس کی بڑی بہن آنا نے اپنی یادداشتیں قلم بند کی ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں یہ کتابیں ماسکو میں چھپیں ان میں الی لوپیف خاندان کو اسٹالن کا دوسرا خاندان بتایا گیا ہے۔ شاید یہ واحد خاندان تھا جس کے ساتھ اسٹالن کو کچھ تعلق خاطر تھا۔ الی لی پیف یعنی سرج دراصل وسطی روس کا ایک کسان تھا، وہ طفلس میں ریلوے کی مرمت کے ایک کارخانہ میں مستری بن گیا۔ پھر وہ باکو کے بجلی گھر میں کام کرنے لگا۔ اس نے اولگا فیڈورنکو سے شادی کر لی جو یوکرین کی رہنے والی ایک عورت تھی لیکن اس کی ولادت طفلس میں ہوئی تھی وہ جارجیا کی زبان سے واقف تھی۔ اسی سہارے اسٹالن کے تعلقات اس خاندان سے استوار ہوئے۔ اس کے بطن سے چار اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے پال اور فیدیا، دو لڑکیاں انا اور نذیزا۔ یہ خاندان طفلس کا رہنے والا تھا۔ یا باکو کا لیکن جب یہ لوگ پیٹسبرگ میں آئے تو ان کا گھر انقلابی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ سرج نے ابتدائے عمر ہی سے بالشویک تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس نے قانون توڑے کئی مرتبہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کو لئے جیل بھی گیا۔

بچپن ہی سے آنا اور نذیزا انقلابیوں کے مشہور و معروف ہمدرد دوستوں کے بالشویک پارٹی کے لئے چندہ جمع کرنے جایا کرتی تھیں۔ اس روپے سے ان کی ماں اناج اور کپڑے خریدتی تھیں۔ اور لڑکیاں بنڈل بناتی تھیں جو بذریعہ ڈاک سائبیریا کے نظر بندوں کو بھیج دیئے جاتے تھے۔

اس کے ساتھ ہی تمام انسانوں کے لئے میرے لطیف جذبات بھی مر گئے۔

یتیم جیکب کو کتھرائن کے والدین نے پالا پوسا۔ نوعمری میں وہ کئی سال تک اسٹالن کے ساتھ قصر کریملین میں مقیم رہا۔ جہاں اسٹالن اس کی سگریٹ نوشی کے باعث اسے خوب پیٹا کرتا تھا پھر وہ اپنے باپ سے جدا ہو کر زندگی بسر کرنے لگا۔ اور بعد میں تو وہ اسٹالن سے اپنے تعلق کا ذکر بھی پسند نہیں کرتا تھا کچھ عرصہ تک سائبیریا میں ایک ریلوے لائن پر کام کرتا رہا۔ ایک معمولی ریڈیو مستری کی حیثیت سے دوسری جنگ عظیم میں بھی کام کیا۔ نازی افواج نے اسے قید کر لیا، اور ایک رپورٹ کے مطابق اس نے ایک جرمن کیمپ میں خودکشی کر لی۔

اسٹالن دوسری مرتبہ ۲۵ مارچ ۱۹۰۸ء کو گرفتار ہوا اور سوا برس کی جیل کاٹی۔ بعد میں اسے ۲۳ مارچ ۱۹۱۰ء سے ۶ ستمبر ۱۹۱۱ء تک یعنی سوا برس سزا کاٹنی پڑی۔ پھر ۹ ستمبر ۱۹۱۱ء سے ۲۹ فروری ۱۹۱۲ء تک یعنی تقریباً ۶ ماہ جیل میں رہا، بعد ازاں ۲۲ اپریل ۱۹۱۲ء سے یکم ستمبر ۱۹۱۲ء تک یعنی تقریباً پانچ مہینے اس نے جیل میں گزارے اور آخر میں ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے مارچ ۱۹۱۷ء تک یعنی ۴ سال کی مدت اس نے قید و بند میں بسر کی۔ اس کی نظر بندی کا زمانہ زیادہ سائبیریا کے دیہاتی میں گزرا۔ جہاں جلاوطنوں کو اس کی آزادی تھی کہ جس مرد یا عورت سے چاہیں ملیں۔ جو چاہیں شغل اختیار کریں۔ بشرطیکہ وہ حد بندی کے علاقے سے باہر نہ جائیں ——— اسٹالن جیسے عادات و خصائل کے شخص کے لئے آزادی اور جلاوطنی کی بین بین زندگی نے اسے مستقل جذباتی تعلق سے محروم کر دیا۔ بالشویک انقلاب کی کامیابی نے زار کے بے بس قیدی کی حیثیت سے

کی تلاشی لے گی۔ وہ صبح سے شام تک جاگتا رہتا تھا۔ وہ جیکب سویڈلوف
کی معیت میں جو بعد میں سویت روس کا پہلا صدر بنا۔ ـــــ سڑکوں کا
گز بنا ہوا تھا۔ اس شخص کے ساتھ وہ سائبیریا سے بھاگا تھا۔ عام طور
پر رات بھر یہ دونوں ایسی گلیوں میں گھوما کرتے تھے۔ جہاں آمدوروند
شاذونادر ہی نظر آتے تھے۔ اگر یہ کسی چائے خانہ کی طرف سے گذرتے
تو یہ اندر گھس پڑتے چائے کی ایک کیتلی کا آرڈر دیتے اور گھنٹوں
اسے مزے کا کرتے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ یہ (چائے پیتے پیتے) آئل کلاتھ
سے ڈھکی ہوئی میز پر سر جھکا لیتے اور سو جاتے۔

(لوئی فشر کی کتاب "اسٹالن" سے ترجمہ)

ان تحفوں کے وصول کرنے والوں میں ایک اسٹالن بھی تھا۔ جنوری ۱۹۰۴ء میں جب اسٹالن سائبیریا سے بھاگا تو وہ سیدھا الی لیوئیف کے گھر پہنچا۔

پھر ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۱ء میں جب جیل سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا تو سینٹ پیٹرزبرگ کے اسی گھر میں دونوں مرتبہ آن موجود ہوا۔ دوسری مرتبہ جب وہ بغیر اطلاع کے یک بیک آیا تو انا نے اس کی دستک پر دروازہ کھولا۔ وہ بیان کرتی ہے کہ وہ ایک کالا اوور کوٹ پہنے تھا۔ اور ایک ٹوپی، دبلا پتلا زرد رو۔"

۱۹۱۲ء کے موسم سرما میں اسی طرح ایک مرتبہ پھر الی لیوئیف کا گھر جلاوطنی کے اسٹالن کی راہ فرار ہی کی منزل بنا۔ "ہم اسٹالن کو اچھی طرح جانتے ہیں۔" انا لکھتی ہے۔ "ہم جانتے ہیں وہ سادہ مزاج اور خوش طبع انسان ہے اگرچہ عام طور پر خاموش، اور سنجیدہ، وہ اکثر ہنسی مذاق کرتا ہے، وہ بڑا ہی کی آنکھوں سے بھرپور انداز میں مضحکہ خیز کہانیاں سناتا ہے، لوگوں کے ہنسانے کا فن اسے بہت مرغوب ہے"

جاڑوں کے اسی موسم میں اسٹالن نے انا اور نذیزا کو جن کی عمریں علی الترتیب پندرہ اور گیارہ سال کی تھیں نیز ان دونوں کے بھائی فیدیا اور ایک خادمہ کو ایک تیز رفتار سلیج پر بیٹھایا اور دریا کے لیے چل پڑا۔ جب وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچا تو اس نے کہا۔ "ٹھہرو! میں یہاں اتر جاتا ہوں۔ تم لوگ گھر واپس جاؤ!"

سینٹ پیٹرزبرگ میں اسٹالن کا قیام غیر قانونی طور پر تھا۔ وہ پولیس سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ پولیس اس کی تاک میں تھی وہ ہر وقت اس کا اندیشہ تھا کہ وہ جانے بوجھے انقلاب پسندوں کے گھروں اور کسی قسم کے مشتبہ ٹھکانوں

ور بوہرے ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں، بوہروں کے داعی مطلق ملا طاہر سیف الدین
کا یہ عالم ہے کہ باں ضعف و پیری، جاڑا، گرمی، برسات، ہر موسم میں فجر تک کی نماز
باجماعت ادا کرتے ہیں، اور اس نماز کے لئے ہر روز کئی میل کا سفر کرتے ہیں، خود
بھی داڑھی رکھتے ہیں اور فرقہ میں جو شخص داڑھی نہیں رکھتا ______________
اس کا نکاح تک نہیں پڑھاتے، مذہبی مراسم پر نہایت سختی سے عمل کرتے ہیں، اور
کسی ایسی بات کو پسند نہیں کرتے جو خلاف مذہب ہو، ان کے فرقہ میں، ایک
بہت بڑی جماعت ہے، جو غداروں پر مشتمل ہے اور تخت امامت کو فرش زمین بنائے
بیٹھی ہوئی ہے، اس کے برعکس، آغا خان، عید بقر عید کے سوا کوئی نماز (عام طور پر)
نہیں پڑھتے، داڑھی نہیں رکھتے، ریس کھیلتے ہیں، کلب میں جاتے ہیں، عورتوں سے
حجاب نہیں کرتے، ولی عہد، پرنس علی نے جب امریکی ایکٹریس ریتا ہوریتھ سے
شادی کی، تو خود آغا خان نے دعائے خیر و برکت دی، اور اپنے پیرس کے محل میں
بہو کو بلایا اور اس کے سر پر دست شفقت پھیرا، غرض مذہب اور اس پر عمل کا
جہاں تک تعلق ہے آغا خان کے ہاں اتنا ہی ہے جتنا دال میں نمک، لیکن آغا
خانیوں یعنی خوجوں کا یہ حال ہے کہ اپنے امام حاضر کے نام پر پروانہ وار قدا ہوتے
ہیں، یہ موسم دیکھئے، یہ اقتصادی بحران دیکھئے، یہ سفر کی بے پناہ مشکلات دیکھئے، لیکن
افریقہ، انڈونیشیا، برما، سیلون، کشمیر، ہند، شام، لبنان، زنجبار اور دوسرے
مقامات سے دس بارہ ہزار خوجے صرف اس لئے کراچی آئے ہیں کہ اپنے
امام حاضر کا جلوہ دیکھیں"!

تم جسے یاد کرو پھر اسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

آغا خان کا اور خوجوں کا بالکل یہی حال ہے"! — اس سے بڑھ کر بھی کوئی

آغاخان!

کراچی میں آغاخان کی پلاٹینم جوبلی ہو رہی ہے۔

آغاخان دنیا کے خوش قسمت ترین انسانوں میں ہیں۔ صحت و توانائی کے اعتبار سے دولت و ثروت کے اعتبار سے مرجعیت اور محبوبیت کے اعتبار سے۔ غرض جس اعتبار سے بھی انھیں پرکھیں حسرت اور ناکامی کا کہیں گذر نہیں، کامرانی اور کامگاری ہر جگہ موجود!

طبی اور سائنسی اعتبار سے تقلیل عمر کے جتنے اسباب ہیں۔ وہ سب ان میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بہت زیادہ موٹے ہیں نہ ورزش کرتے ہیں نہ پیدل چلتے ہیں خوب کھاتے ہیں، رات کے جاگنے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ قلب کے مریض ہیں لیکن عمر —— تقریباً ۷۷ سال!

کچھ تعلیم نے، کچھ نئی نئی تحریکوں کے وجود نے کچھ اقتصادی اسباب نے تقریباً تمام فرقوں میں زبردست "حزب اختلاف" قائم کر دی ہے خود

کے وفد کے ممبروں سے ملنے ہوٹل میں آتے، اور جاتے وقت بغیر رسید لئے، اور بغیر اعلان کئے کوٹ کی دونوں جیبوں سے مٹھیاں بھر بھر نوٹ نکالتے انڈیل کر چلے جاتے!

سر آغا خان ایک غلام ملک — بھارت — کے باشندے تھے، لیکن جینوا کی مجلس امم لیگ آف نیشنز کے صدر بنے، دنیا میں یہ پہلی مثال تھی کہ ایک غلام ملک کا باشندہ آزاد قوم کی مجلس کا صدر بنا، یہ غلامی کا اثر نہیں تھا، یہ بات ہوتی تو شاید مسٹر ساشتری اور نواب بھوپال اس اعزاز کے زیادہ اہل سمجھے جاتے یہ شخصیت کی کارفرمائی تھی۔ آغا خان کی بھاری بھرکم شخصیت ہمیشہ نمایاں رہی، لندن کی گول میز کانفرنس میں جہاں گاندھی جی قائد اعظم مسٹر ساشتری اور مسز نائیڈو کا طوطی بول رہا تھا۔ وہاں آغا خان کی دانشمندی، فراست اور ذہانت سکہ جما رہی تھی، کئی بنیادی امور کی کمیٹیاں تھیں، جن کی کامیابی، صرف آغا خان کی صدارت کی رہین منت تھی، !

آغا خان کے کردار میں چند باتیں ایسی ہیں جن کا خاص طور پر تذکرہ ضروری ہے!

آغا خان کا مذہب تبلیغی مذہب ہے۔ عیسائی مشن جس طرح دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں، اسی طرح آغا خانی بھی، دنیا کے ہر گوشہ میں، غیر مسلموں کو اپنے حلقہ اور جماعت میں شامل کرتے رہتے ہیں۔ لیکن آغا خانی مشن کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو اپنے حلقہ میں داخل کر سکے! —

اسی سلسلے کی دوسری کڑی یہ ہے کہ آغا خان اگرچہ اپنے عقائد کے اعتبار سے جماعۃ المسلمین سے بالکل الگ ہیں، لیکن یورپ میں، یا جماعت سے باہر کہیں بھی مذہب اسلام اور فلسفۂ اسلام پر اظہار خیال کرتے ہیں، تو ایک خالص مسلمان کی شان سے، ایسے مواقع پر ان کی تقریریں ایسی جچی تلی ہوتی ہیں کہ مولانا سید سلیمان

خوش قسمتی ہوسکتی ہے؟

یہ تو تھا آغاخان اور خوجوں کا حال ـــــ اب ایک نظر آغاخان پر بہ حیثیت ایک شخص کے ڈالیے!

ہندوستان کے مسلمان آغاخان کے کارناموں کو فراموش نہیں کر سکتے مسلم لیگ کی تعمیر وتاسیس میں آغاخان کا اتنا ہی حصہ ہے، جتنا ایک بانی اور معمار کا ہوتا ہے۔ مسلمانانِ ہند کو مجلس آئین ساز میں جداگانہ نیابت اس وفد نے دلوائی جو شملہ میں لارڈ منٹو سے (۱۹۱۲ء) میں ملا تھا۔ اور اس وفد کے رکن رکین آغاخان ہی تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا قیام قطعاً ناممکن تھا، اگر آغاخان، اپنا ہزاروں روپیہ خرچ کر کے اور مولانا شوکت علی کو فرلو دلا کر سارے ہندوستان کا دورہ کر کے تیس لاکھ روپیہ فراہم نہ کرتے،

آغاخان نے ملکی سیاست میں حصہ لیا اور بین الاقوامی سیاست میں بھی، لیکن دبدبہ اور وقار کے ساتھ انھوں نے لاکھوں روپیہ چندے کے طور پر مسلمانوں کے تعلیمی اور تعمیری امور میں فراخ دلی کے ساتھ دیا۔ وہ اپنی رائے پر ہمیشہ قائم رہے لیکن اپنی رائے مسلط کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، مولانا شوکت علی اور آغاخاں کا راستہ بالکل جدا تھا، اس میں مفاہمت کا امکان نہ تھا لیکن آغاخان جب بمبئی آتے۔ شوکت صاحب سے ضرور ملتے، اور رخصت کے وقت ان کی موٹی سی جیب میں ایک ہزار کا ایک نوٹ ضرور ڈال دیتے، مشیر حسین قدوائی وفدِ خلافت کے ساتھ لندن گئے تھے، یہ وفد سیٹھ چھوٹانی اور حسن امام کی قیادت میں گیا تھا۔ قدوائی صاحب کا بیان ہے کہ آغا خان اگرچہ مذہبی اعتبار سے مسئلہ خلافت پر کوئی رائے رکھتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کی عمومی سیاست سے ان کی دلچسپی کا یہ عالم

کی سیر کو رہے تھے فون کرکے حقیقت حال دریافت کی، آغاخان نے ، اس افواہ کی سخت الفاظ میں تردید کی ، اپنا ذاتی رجحان ، قائداعظم کی طرف ظاہر کیا، پھر کیا تھا بات بن گئی - حبیب ابراہیم رحمت اللہ نے راؤ جی کے جھوٹ کا پول کھول دیا۔ سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا قائداعظم کے پولنگ بوتھ پر یہ عالم تھا کہ خوجہ جماعت کے وہ افراد جو بستر مرگ پر دراز تھے ، جو بڑھاپے اور علالت کے باعث لب گور تھے - کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ آئے اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی پرچی ڈالی اور دو دو آدمیوں کے سہارے سے گاڑی تک پہنچے اور واپس گئے نہ ان پر تکان کا اثر تھا ، نہ نقاہت کا ، یہ معلوم ہوتا تھا کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے کر شادان فرحاں واپس جا رہے ہیں !

زبانت آغاخان پر ختم ہے -

آغاخان کا پاکستانی رجحان ہمیشہ سے نمایاں تھا ، انھوں نے کبھی پاکستان کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا ، جب کبھی موقع آیا اس نظریہ کی حمایت کی، قیام پاکستان کے بعد قائداعظم کو مبارکباد کا ایک پر اثر تار بھیجا ، جس کے ایک ایک حرف سے ان کا ذاتی تاثر جھلک رہا تھا ، اور ——

اور تقسیم ہند کے معاً بعد "اپنی قومیت" بدل دی ! —— وہ "ایرانی نیشنل" بن گئے ، حکومت ایران نے ایک کیمونکے میں انھیں ایرانی باشندہ تسلیم کر لیا دشواری اس لیے پیش نہیں آئی کہ ایران کے سابق شاہی خاندان سے ان کا نسلی رشتہ بہرحال ایک حقیقت تھی —— یہی بات ملا طاہر سیف الدین بھی کر سکتے تھے ، وہ بھی آسانی سے ، مصر ، یا یمن کے نیشنل بن سکتے تھے لیکن وہ سوچتے رہ گئے ، اور آغاخان کر گزرے ، نتیجہ یہ ہے کہ آج بھارت میں

ندوی یا مولانا مودودی بھی، اگر لب کشائی کرتے تو یہی کہتے ،!

دوسری بات یہ کہ جبلیوں کے سلسلے میں ان کی قوم نے لکھوکھا روپیہ جمع کیا، اور ان کی خدمت نذر عقیدت کے طور پر پیش کر دیا، لیکن — آغا خان نے اس رقم "خلیہ" میں ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ فوراً قوم کے چند سر برآوردہ اصحاب پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی، اور اس کمیٹی کو ہدایت کر دی کہ وہ قوم کی تعمیری تعلیمی، اقتصادی اور سماجی فلاح وبہبود دیرا اس فنڈ کی رقم منافع خرچ کرے، اس طرح اصل سرمایہ بھی محفوظ رہا۔ اور متعدد ممالک میں قوم کی فلاح وصلاح کے لئے صدقہ جاریہ کا بھی انتظام ہوگیا۔

غیر منقسم ہندوستان میں ۱۹۴۶ء کا انتخاب، بڑا معرکہ آرا، اور فیصلہ کن تھا مسلم لیگ اگر کامیاب ہوجاتی تو پاکستان کا قیام یقینی تھا۔ اور ناکامی کی صورت میں ایک تصوّر محال، بمبئی میں خوجوں کی کافی آبادی ہے۔ جس حلقہ سے قائداعظم کھڑے ہوئے تھے، اس حلقہ میں خاص طور پر ان کی آبادی بہت زیادہ تھی، ایک سرگرم اور بااثر خوجہ مسٹر محمد بھائی راؤجی قائداعظم کے سخت مخالف تھے۔ ایسے حالات میں آغا خان نے مناسب نہ سمجھا کہ اپنی جماعت کو پابند کردیں۔ انھوں نے ہر شخص کو آزادی دے رکھی تھی جسے چاہے ووٹ دے، راؤجی نے اس سے فائدہ اٹھایا، اور مشہور کر دیا کہ آغا خان بھی قائداعظم کے مخالف ہیں۔ یہ بات اس لئے باور کرلی گئی کہ قائداعظم اور آغا خان کا سیاسی مسلک بھی جدا تھا اور باہمی تعلق بھی نہیں تھی۔ مسلم لیگ کے سرگرم کارکن، اور قائداعظم کے وفادار لفٹنٹ خوجہ جماعت کے ایک دوسرے سر برآوردہ اور بااثر شخص مسٹر ابراہیم رحمت اللہ (موجودہ گورنر سندھ) نے آغا خان کو جو اپنی بیگم کے ساتھ، آگرہ کے تاج

لائے، مزار پر ایک بورڈ سا لگا تھا، اور اس پر عربی حروف میں مرقوم تھا۔

اِذا جاءنصرا اللہِ و الفتح ، !

(جب خدا کی نصرت اور فتح آئی !)

آغا خان نے عبارت پر ایک نظر ڈالی۔ اور ذرا سے تامل کے بعد اثر انگیز لہجہ میں فرمایا۔

" نہیں یہ ٹھیک نہیں، اس آیت کی بجائے، اگر یہ آیت لکھ کر نصب کی جائے تو زیادہ بہتر ہے،"!

پھر آیت پڑھی،

انّا فتحنا لك فتحنا مبینا، !

(ہم نے تجھے فتح مبین مرحمت فرمائی، !)

اس ذرا سی ترمیم نے معنویت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا، ــــ جس بات پر مفسر قرآن مولانا شبیر احمد عثمانی، اور مولانا احتشام الحق تھانوی کی بھی نظر نہیں پہنچی، آغا خان نے باتوں باتوں میں اسے بیان کر دیا ! ـــــ اس سے نہ صرف آغا خان کی غیر معمولی ذہانت پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم پر ان کی کتنی اچھی نظر ہے، ! ـــ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو قرآن کے مفہوم و معنی کا ادا شناس ہو۔

آغا خان کو پاکستان سے محبّت ہے، انھیں اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہے، ان کا مولد کراچی ہے، وہ جب آتے ہیں، لاکھ، ڈیڑھ لاکھ روپیہ مختلف مدات میں پاکستانی عوام کو دے جاتے ہیں، مشرقی بنگال کی ایک مل میں انھوں نے تقریباً ایک کروڑ روپیہ لگایا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں پاکستان

آغاخان کی کروڑوں روپے کی املاک، کسٹوڈین کی گرفت سے آزاد ہے وہ اپنے بیش قیمت جواہرات جب اور جتنے چاہتے ہیں لے آتے ہیں۔ کوئی باز پرس نہیں کر سکتا۔ ایک مرتبہ دلی کے ہوائی اڈے پر، کسٹم والوں نے کچھ چون وچرا کی تھی۔ لیکن ایرانی سفیر کی بروقت مداخلت نے یہ قضیہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور بیچارے ملاجی ہیں کہ بھارت گورنمنٹ کی زد پر ہیں، آج یہ پابندی، کل وہ زمان زبان حال سے کہتے ہیں ؎

آپ گھبرائیں نہیں، جور سے توبہ نہ کریں!
آپ کے سر کی قسم داغ کا حال اچھا ہے

اور زبان حال سے جو کچھ کہتے ہیں، وہ سنا نہیں جا سکتا۔ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے،

غم دنیا سے گر فرصت ملی بھی سر اٹھانے کی
فلک کو دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی

مضمون ختم کرنے سے پہلے آغاخان کی، ذہانت، اور قرآن کریم پر وسعت نظر کا ایک واقعہ ضرور بیان کروں گا ــــ یہ واقعہ دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی!۔

۱۹۴۹ء یا ۵۰ء میں آغاخان پہلی بار پاکستان آئے، قائداعظم کا انتقال ہو چکا تھا!

آغاخان نے فیصلہ کیا کہ وہ قائداعظم کے مزار پر جائیں گے اپنے خدم حشم کے ساتھ وہ مزار پر پہنچے، فاتحہ پڑھا، پھولوں کی چادر چڑھائی، مجاوروں اور فقیروں میں کچھ رقم تقسیم کی، پھر ایک گشت لگایا، گشت ختم کر کے پھر مزار کے پاس تشریف

بچّہ کی نفسیات

ڈاکٹر آرنلڈ جیسیل نفسیات اطفال کے سب سے بڑے ماہر ہیں۔ انھوں نے سالہا سال تک بچّہ کی ذہنی و جسمانی حالات کے تغیر اور نشو و ارتقار کو گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اگر بچہ کے نشو و نما کے انداز اور اس کی جسمانی و دماغی ضروریات کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو اس کی تربیت اور انداز عمل کا مسئلہ قطعی طور پر حل ہو سکتا ہے۔ اس علم کے بغیر جو والدین بچہ کے اندر سرزنش اور زد و کوب سے بچہ میں باضابطگی اور تمیز و سلیقہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ بچہ کوئی بالغ تو ہے نہیں۔ وہ ایک نامی جسم کا ہیولیٰ ہے جو بتدریج دماغی و جسمانی ترقی کے مختلف مراحل طے کرتا ہے اور ہر مرحلہ پر اس کے جسم و دماغ کی ضرورتیں مختلف اسباب کی بنا پر بدلتی رہتی ہیں۔

اس کا ضبطِ اعضاء، اس کا دماغ، اس کا اخلاق اور اس کا حوصلہ تدریجی رفتار سے رفتہ رفتہ ترقی پاتا ہے۔ سب سے پہلے لوح دماغ

کے استحکام اور فروغ سے بڑی دلچسپی ہے۔

پلاٹینم جوبلی کے سلسلہ میں اگر آغاخان ایک کام کر جائیں تو ان کا نیک عمل ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ کراچی میں آغاخان کالونی کی داغ بیل ڈالی جائے، زمین کی خریداری اور مکانات کی تعمیر پر سارا روپیہ ان کے متبعین صرف کریں۔ یہ مکانات مناسب کرایہ پر پاکستانی عوام کو دیدیئے جائیں۔ اس طرح اصل سرمایہ محفوظ رہے گا۔ پاکستان کے عوام کو آرام حاصل ہوگا اور روپیہ لگانے والوں کو نفع ملتا رہے گا!

فروری ۱۹۵۴ء

بچہ کی نشوونما کے ساتھ اس کی فطرت کے ہر حصہ اور ہر پہلو کا نشوونما ہوتا ہے۔ اس میں جذبۂ خودی بھی شامل ہوتا ہے، خوف بھی، جذبۂ محبت بھی اور شوقِ تجسس بھی، نیز ماں باپ کے، کھیل کے ساتھیوں کے، جنسی رشتوں کے اور اپنے مذاق کے اچھے بُرے جذبات بھی۔

اس لئے دو ڈھائی سال کی عمر میں بچہ دوسرے بچہ کے ہاتھ سے زبردستی کوئی چیز چھین لے تو ہمیں فوراً اس کی فطرت کے متعلق فیصلہ صادر کر کے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ اس طرح اگر ۴، ۵ سال کی عمر میں دوسروں کے متعلق زبان سے برے الفاظ و کلمات نکالتا ہے، ڈینگیں مارتا ہے، یا لمبی لمبی بے سر و پا باتیں کرتا ہے تو اسے اس کی فطری نشوونما کے ارتقاء کا قدرتی تقاضہ سمجھنا چاہیئے۔ اگر چھ سال کی عمر میں وہ زبان درازی کرتا ہے یا دوسروں پر ہاتھ اٹھاتا ہے یا کبھی محبت اور کبھی تشدد کا مظاہرہ کرتا ہے تو یہ بھی اس کی عمر کا طبعی اقتضاء ہے نہ کہ فطرت کا خاصہ۔

اس کے بعد جب بچہ آٹھ سال کا ہوتا ہے تو اس میں معقولیت اور رواداری کا نیا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ اچھے بُرے اور نیک و بد میں تمیز کرنے لگتا ہے۔ دس سال کی عمر سے اسے معاشرتی معاہدوں سے دلچسپی شروع ہو جاتی ہے اور شخصی و شہری ضمیر بیدار ہونے لگتا ہے۔ اگر پانچ اور دس سال کی عمروں کی کیفیت کا مقابلہ کیا جائے تو اس میں نسبتاً توازن نظر آئے گا۔ اس سن میں اسے اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ میں بھی دنیا میں اور خاندان میں ایک جگہ رکھتا ہوں دس سال اچھے خیالات اور سلیقہ مندی پیدا کرنے اور تعصب و تنگ نظری سے بچنے کی بہترین عمر ہے۔

پر جو نقوش مرتسم ہوتے ہیں ان کا ذریعہ آنکھیں ہوتی ہیں۔ اس وقت شعور بالکل خفتہ ہوتا ہے۔ چار مہینے میں اس کی نظر ٹھہر جاتی ہے اور کسی چیز کو توجہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ دس مہینے میں وہ اسے چھونے اور اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ پندرہ مہینے میں اسے اٹھا کر دوسری جگہ رکھنا چاہتا ہے، ڈیڑھ سال کی عمر میں وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو تلے اوپر رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ گویا اس کے گننے کے شعوری فعل کا پیش خیمہ ہے اس طرح بتدریج اس کے حسیات اور شعوری قوی بیدار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ چار برس کے بچے کے دل میں قصے کہانیاں سننے اور کہنے کا جذبہ قدرتاً پیدا ہوتا ہے تو ہم اسے جھوٹ بولنے پر سزا نہیں دیں گے۔ کیونکہ قصے کہانیاں حقیقت و واقعیت سے دور اور بے اصل ہوتی ہیں اور جس طرح یہ بے اصل باتیں اسے پسند آتی ہیں۔ اسی طرح وہ دوسری بے اصل باتوں کی طرف بھی طبعی میلان رکھتا ہے۔

اس طرح اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ جب بچہ سات سال کا ہوتا ہے تو اس کے دل میں ذاتی ملکیت کا قدرتی جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اسے اپنی اور پرائی چیز میں امتیاز کراتا ہے۔ اور اس کی تسکین کے لئے وہ دوسروں کی چیزوں کے حاصل کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھتا تو ہم اسے کسی چیز کے چرانے پر ہرگز سزا نہیں دیں گے۔ بلکہ اس کا جائز طریقہ پیدا کر کے ناجائز طریقہ سے روکنے کی کوشش کریں گے۔ اور یہ سمجھیں گے کہ یہ نشوونما کا ایک گذر جانے والا دور ہے۔ جو ہر بچہ پر طاری ہوتا ہے۔

خوش طبعی سے کام چل سکتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف کہتے ہیں کہ بچہ کے ساتھ محبت کا اظہار نہایت ضروری ہے اس سے بچہ کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ میں بھی کچھ اہمیت رکھتا ہوں اور دوسروں کو میری بھی ضرورت ہے۔ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ جن بچوں کی تربیت میں والدین کا محبت اور شفقت آمیز برتاؤ شامل نہیں ہوتا وہ دیر میں چلتے ہیں، دیر میں بولتے ہیں اپنے اظہار میں مستعد نہیں ہوتے، اجنبیوں سے ڈرتے اور جھینپتے ہیں۔ اور ان بچوں سے بہت پسماندہ نظر آتے ہیں۔ جن کی تربیت میں ان کے والدین کی محبت اور شفقت آمیز برتاؤ کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔

بچہ کی ابتدائی نشوونما کی خصوصیات کے تعین میں نسلی ورثہ کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اور اس میں باپ دادا کے متوارث جبلی اوصاف بھی شامل ہوتے ہیں۔ موجودہ معاشرہ کے غیر مبدل دباؤ کے ماتحت بھی یہ ورثہ بچہ کی انفرادیت پر اپنی چھاپ لگا کر اس کی شخصیت کو متمایز رکھتا ہے اس طرح بچہ کی عمر کے ابتدائی دس سال کے جسمانی و دماغی نشوونما کے مطالعہ کا ایک واضح نہج مقرر ہو گیا ہے۔ لیکن دوسرے دس سال یعنی عنفوان شباب کا معاملہ ابھی بچوں اور بڑوں دونوں کے لئے مشکل بنا ہوا ہے اور بیس سال سے کم عمر کے نوجوانوں کی نفسیات کے مطالعہ کے سلسلے میں جو خود اپنے مخلوط جذبات کا شکار اور بالغوں کی دنیا سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ بہت زیادہ کام باقی ہے۔

آگے چل کر ڈاکر جیل لکھتے ہیں، مجھے ایسے بچوں سے بڑی ہمدردی ہے اور ان کا تصوّر کر کے میرے جسم میں جھر جھری آجاتی ہے جن کے والدین ہر وقت کی لعنت ملامت سے ان کا ناک میں دم رکھتے اور تشدد سے کام لیتے ہیں۔ ان طریقوں کی ناکامی بالکل آشکارا ہے۔ میں اپنے طویل مشاہدہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ لعنت و ملامت اور مار پیٹ سے کبھی کسی بچے کو باتمیز اور سلیقہ شعار نہیں بنایا جا سکتا۔ وہ باتمیز اس وقت بنے گا جب اس کے سامنے مناسب موقعوں پر تمیز و ادب اور سلیقہ شعاری کی مثالیں آئیں گی اس کے ساتھ شفقت و محبت کا سلوک کیا جائے گا۔ اور اچھی غذا اور صحت بخش ماحول مہیا ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا میں بدی کا حصّہ زیادہ ہے لیکن بچوں کی فطرت میں نیکی اور اچھائی درجہ اولیت رکھتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ اسے پکڑ لیا جائے ضائع نہ ہونے دیا جائے۔ اور پکڑا اسی وقت جا سکتا ہے جب بچہ کی نشو و نما کی علامتوں کو سمجھ لیا جائے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ استاد اور والدین عملی سوجھ بوجھ میں تو نشو و نما کے ارتقاء تسلیم کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ لیکن اخلاق و عادات اور مقابلہ کے اسکول کے کاموں میں بسا اوقات بچہ کو غلط سمجھتے ہیں اور اسے قصوروں کی پاداش میں سزائیں دیتے ہیں جو شعور کی ناترقی کی بنا پر سرزد ہوتے ہیں اور کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ وہ بڑوں کے تصورات کے مطابق نہ رہے اور اتنی بات نہیں سمجھتے کہ بچہ جو کچھ کرتا ہے اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ بچہ ہے۔

پھر بسا اوقات اطاعت و فرمانبرداری کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہوتا اور معذرت کا مطالبہ ایسے موقعوں پر کیا جاتا۔ جہاں ذرا سی ظرافت

ہی تو فوراً محسوس ہونے لگتا ہے،

> غلط یہ لفظ، وہ بندش بُری، یہ مضمون سُست!

اس وادی میں قدم رکھنے سے پہلے وہ محقق نظر آتے ہیں، لیکن قدم رکھنے کے بعد ان کی حیثیت مناظر کی رہ جاتی ہے، مناظرہ کرنے والا حق و صداقت کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی بات کی پچ کو، وہ جیتنے کے لئے ہر داؤں استعمال کرتا ہے، اس کی قطعاً پروا نہیں کرتا کہ حق مجروح ہو رہا ہے یا باطل ابھر رہا ہے، نیاز صاحب کا کمزور پہلو یہی ہے۔

نیاز صاحب نے فرمایا ہے :۔

> "اس سے غالباً جعفری صاحب کو بھی انکار نہ ہوگا کہ اس وقت تک جو شخص اسلام نہیں لایا اور آئندہ جو شخص اسلام نہیں لائے گا وہ ان کے نزدیک بھی گمراہ ہے اور مرنے کے بعد اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، یہ ہے وہ پہلی مذہبی تنگ نظری، جس پر مُلاّئیت کی تعمیر قائم ہوئی!"

ہاں مجھے اس سے انکار نہیں کہ جو شخص مسلمان نہیں وہ گمراہ ہے، اور میرا یہ عقیدہ بھی ہے کہ مرنے کے بعد (بشرطیکہ کفر نادانی پر نہیں بلکہ طغیان و سرکشی پر مبنی ہو) اس کا ٹھکانا جہنم ہے، لیکن میں اس عقیدہ کو پہلی، دوسری، یا آخری، بلکہ سرے سے "تنگ نظری" ماننے سے انکار کرتا ہوں، اسلام ایک حقیقت پسند مذہب ہے، وہ اپنے منکر کو کافر کہتا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم قرار دیتا ہے، لیکن وہ انسان کی فہم و فراست سے یہ توقع بھی رکھتا ہے کہ اگر وہ ٹھنڈے دل سے اسلام پر غور کرے گا، تو مسلمان بنے بغیر چارہ نہیں، اسی لئے سزا کا فیصلہ

"نیاز" مندانہ گذارشات

جولائی کے "ریاض" میں مُلّائیت پر میں نے اظہارِ خیال کیا تھا، "نگار" لکھنؤ کے مدیرِ محترم حضرت نیاز فتحپوری کو یہ بات پسند نہ آئی، انھوں نے اگست کے "نگار" میں ملاحظات کے تمام صفحات اسی موضوعِ جمیل کے رد میں تحریر فرمائے ہیں، نیاز صاحب کو میں اپنا بزرگ سمجھتا ہوں، ان سے میرے خاندانی مراسم ہیں، وہ ذاتی طور پر ہمیشہ مشفقانہ برتاؤ میرے ساتھ کرتے رہے ہیں، میرے دل پر ان کی شفقت و نوازش کا گہرا نقش ہے، اور مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ گہرا ہوتا جا رہا ہے، بایں ہمہ فکر و نظر کی دنیا میں جس طرح ہر بڑا یہ حق رکھتا ہے کہ چھوٹے کو ٹوکے

ٹوک دو گر غلط کہے کوئی

اسی طرح ہر چھوٹا بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہی کہے جسے وہ حق سمجھتا ہے

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق

نیاز صاحب جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اسے باغ و بہار بنا دیتے ہیں، فلسفہ ہو یا سائنس، ادب ہو یا انشاء۔ افسانہ ہو یا تنقید، ہر موضوع پر ان کے قلم کی گلکاریاں سماں باندھ دیتی ہیں، لیکن مذہب اور مذہبی مسائل پر جب وہ خامہ فرسائی کرتے

شروع ہوئیں تو وقت کے علماء نے سختی سے ٹوکا، اور اس وقت تک چین نہ لیا، جب تک یہ تیاریاں مسلم حکومت نے بند نہ کر دیں، فقہ کی کتابیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اگر غیر مسلم حکومت سے قبل از وقت مسلم حکومت معاہدہ توڑنا چاہے تو لازم ہے کہ وہ اس وقت تک جنگ نہ چھیڑے جب تک غیر مسلم حکومت پھر اتنی ہی مسلح اور طاقتور نہ ہو جائے جتنی صلح کے وقت تھی، پھر بھی اگر اسلام پر، یا علماء پر تنگ نظری کا کوئی الزام لگاتا ہے تو بلاشبہ وہ شخص اتنا جری ہے کہ دن کو رات بھی کہہ سکتا ہے، پھول کو ببول بھی کہہ سکتا ہے۔

آگے چل کر نیاز صاحب نے فرمایا ہے:-

> "چونکہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ مذہبی سیادت و رہنمائی صرف علمائے دین کا حق ہے، اس لئے رفتہ رفتہ مسلمانوں میں وہی PRIEST HOOD پیدا ہو گئی ہے جو کسی وقت عیسائیوں میں پائی جاتی تھی، اور علوم دین عوام کے لئے شجر ممنوع ہو کر رہ گیا، !"

بے شبہ مذہبی سیادت و رہنمائی صرف علمائے دین کا حق ہے، اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں، اگر ریاضی، سائنس اور انجینیرنگ وغیرہ کے مسائل اور مشکلات کی گرہ کسی زرگر، کسی شاعر، کسی ادیب یا کسی ماہر موسیقی سے حل نہیں کرائے جا سکتے بلکہ کسی ایکسپرٹ ماہر ہی سے حل کرائے جا سکتے ہیں تو مذہبی مسائل میں بھی عقدہ کشائی کا حق اسی کو مل سکتا ہے جو اس فن کا ماہر ہو، لیکن جتنی مذکورہ بات سچ ہے اتنا ہی یہ خیال غلط ہے کہ مسلمانوں میں عیسائیوں کی سی پریسٹ ہڈ قائم ہو گئی ہے، اور اس سے زیادہ یہ غلط ہے کہ علم دین عوام کے لئے شجر ممنوع ہو گیا ہے، پریسٹ ہڈ کے معنیٰ یہ ہیں کہ بغیر پادری یا پنڈت کے شعائر مذہبی

وہ عالم آخرت پر رکھتا ہے، زندگی کی آخری سانس تک قبول حق کا موقع دیتا ہے،
اور مسلمانوں کو تاکید کرتا ہے کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ فراخدلانہ
اور روادارانہ برتاؤ کریں، اور بدقسمتی سے مجھے ایسی بہت سی روشن اور تابناک مثالیں
یاد بھی ہیں، مجھے معلوم ہے قرآن نے لکم دینکم ولی دین کہہ کر تنگ نظری کا
دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے، میں جانتا ہوں، لا اکراہ فی الدین
کہہ کر اسلام نے دنیا کو پہلی مرتبہ آزادئ فکر و خیال کی نعمت عطا کی، مجھے معلوم ہے
داعئ اسلام ؐ نے اسلام کے بدترین دشمنوں تک کے ساتھ کیسا روادارانہ
برتاؤ فرمایا؟ کفار مکہ کی ستم رانیوں، اور انسانیت سوز سفاکیوں کا جواب فتح کر
کے بعد جو ملا تھا تاریخ نے اسے اپنے سینہ میں محفوظ کر لیا ہے، لا تثریب علیکم
الیوم انتم الطلقاء، پھر اسلام نے جب عہد خلافت راشدہ میں حجاز سے
باہر قدم نکالا تو مفتوح یہودیوں، عیسائیوں اور دوسرے کافروں کے عقائد
اور معابد کا اس درجہ پاس و لحاظ کیا کہ عیسائیوں کے اصرار کے باوجود گرجا میں
نماز پڑھنے سے عمرؓ نے انکار کر دیا، کہ کہیں مسلمان اسے مثال نہ بنا لیں
حمص کے عیسائیوں کو فاتح مسلمانوں نے جب جزیہ واپس کر کے رخت سفر باندھا
تو وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر آسمانی باپ سے دعا کرتے تھے کہ ان مسلمانوں کو عیسائیوں
پر غالب کرنا بنوامیہ، اور بنو عباس نے خود مسلمانوں پر قیامت کے ظلم توڑے
لیکن کیا کسی معاہد یا ذمّی کے ساتھ بھی کوئی زیادتی کی؟ اندلس کی سرزمین پر جب
مسلمانوں نے فاتحانہ یلغار کی تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ یہودیوں کو عیسائیوں
کی غلامی سے نجات دلائی، اور جبری تبدیلی مذہب کا سلسلہ بند کر دیا، جو
عیسائیوں کے معمولات میں شامل ہو چکا تھا، عہد بنوامیہ میں، جب عیسائیوں
سے مدت صلح ختم ہونے کا وقت قریب آیا، اور احتیاطاً جنگی تیاریاں

صرف مسلمان برہمنوں کو ہی سکھایا جاسکتا ہے؟ مسلم عوام میں سے جو علم دین سیکھنے
کی کوشش کرے گا، اس کی زبان کاٹ لی جائے گی، آنکھیں پھوڑ دی جائیں گی اور
کانوں میں پگھلا ہوا، کھولتا ہوا، سیسہ ڈال دیا جائے گا؟ پاکستان کو چھوڑیئے
ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند ہے، مدرسہ مظاہرالعلوم ہے، خود جس شہر
لکھنؤ کو یہ شرف حاصل ہے کہ نیاز صاحب وہاں مقیم ہیں، وہاں ندوۃ العلماء
ہے، فرنگی محل ہے، سلطان المدارس ہے، ان میں ایک درسگاہ (ندوہ) میں
نیاز صاحب تعلیم بھی حاصل کر چکے ہیں، آخر وہ کون سی درسگاہ ہے، جو صرف
برہمنوں کے لئے مخصوص ہے، اور جہاں مسلم عوام یعنی شودروں کو داخل
ہونے کی اجازت نہیں؟ بلکہ حقیقتہً کیا یہ صورت حال نہیں ہے کہ علوم دین
حاصل کرنے والوں میں غالب ترین اکثریت عوام ہی کی ہے، اس لئے کہ
امراء تو حصول دنیا کی راہ میں اسے ایک روڑا سمجھنے لگے ہیں! —— پھر بھی
اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ علوم دین کا حصول عوام کے لئے شجر ممنوع بن چکا ہے
تو کون اس پر یقین کرے گا سوائے اس کے جسے یہ یقین ہو کہ سیاہ رنگ سفید ہوتا ہے
اور سفید سیاہ! —————— اور میں مانتا ہوں دنیا میں ایسے
لوگ بھی ہیں —————— !

اسی سلسلۂ بیان میں نیاز صاحب نے فرمایا ہے :-
"ہمارے علماء جس وقت اسلام کے عہد ماضی کا ذکر کرتے
ہیں تو ان کے سامنے نہ ابن رشد ہوتا ہے، نہ بوعلی سینا، نہ
رازی، نہ غزالی، بلکہ صرف مالک بن انس، ابوہریرہ، ابوسعد
اور اسی قبیل کے چند محدث اور فقیہہ، جن کی روایات کے
سہارے یہ گروہ خود زندہ ہیں، لیکن دوسروں کو جینے نہیں دیتے!"

ادا نہ ہو سکیں، مثلاً گرجا میں عبادت پادری کرائے گا، مندر میں پنڈت کے بغیر پوجا
مکمل نہیں ہو سکتی، نکاح، طلاق میت کے مراسم، اور مرنے کے بعد کے معاملات
پورے نہیں ہو سکتے، جب تک پادری یا پنڈت رہنمائی کے لئے موجود نہ ہو
کیا نیاز صاحب دیانتداری کے ساتھ فرما سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی بھی یہ کیفیت ہے؟ کیا
نکاح اسی وقت منعقد ہوگا جب قاضی آئے؟ کیا نماز کی امامت صرف عالم دین
کا حق ہے؟ کیا مردے کی لاش سڑتی رہے گی جب تک مولوی صاحب
تشریف لائیں؟ مشکل، دقیق، اور مشتبہ مسائل میں علماء کی رہنمائی بے شک ضروری
ہے، لیکن کیا ان کی بجاآوری اور تعمیل کے لئے بھی مولوی یا مولانا کی موجودگی
ہے؟ ہر مسلمان اگر مسائل اور اصول سے واقف ہے، امام ہو سکتا ہے
کے فرائض انجام دے سکتا ہے، شعائر دینی کی تکمیل کر سکتا ہے
مذہبی معاملہ کی انجام دہی کے لئے ہرگز ہرگز کسی مولوی، مولانا یا ملا
نہیں ہے، پریسٹ ہڈ کے معنی ہیں بندے اور خدا کے مابین واسطہ
اگر پادری اور پنڈت نہ ہو تو بندہ کسی طرح خدا سے ربط نہیں پیدا کر سکتا
کا ہر عمل رائیگاں، اس کا ہر اخلاص بیکار، اور اس کی ہر سعی بے نتیجہ ہے
کے برعکس اسلام اس طرح کا کوئی واسطہ نہیں تسلیم کرتا، یہی وجہ ہے کہ
میں کبھی بھی پریسٹ ہڈ نہ پیدا ہوئی، اور نہ کبھی پیدا ہو سکتی ہے، ہمارا
لئے ہے کہ ہم پوچھیں تو بتائے، اس لئے نہیں ہے کہ خدا کا نائب
مقام بن کر ہر کام کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لے، پھر سب سے
نیاز صاحب نے یہ فرمائی ہے کہ علم دین مسلمانوں کے لئے شجر ممنوعہ
ہے! بار بار کوشش کرنے کے باوجود اس مختصر سے جملہ کا مفہوم
آیا، آخر کس خانقاہ، یا دار العلوم کی طرف سے یہ فتویٰ شائع ہوا ہے

ہوتی! آخران روایات میں وہ کونسا زہر ہے جو غیر علماء کو ہلاک کر دیتا ہے، اور وہ کون سا تریاق ہے جو علماء کو حیاتِ جاوداں بخش دیتا ہے،

کچھ تو کہیئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

آگے مزید ارشاد ہوا ہے:۔

"جعفری صاحب نے دبی زبان سے علماء سو کے وجود کا بھی اقرار کیا ہے، لیکن زیادہ تر ان کی قصیدہ خوانی ہی کی گئی ہے، وہ ایک کارنامہ بھی ایسا نہ پیش کر سکے جس سے ان علماء کی پیشانی کا داغ ناکامی دھل سکتا۔"

اس ارشاد عالی کے جواب میں "کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم" کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ سوال اگر ترکیہ، البانیہ، افغانستان، عراق، اور ایران وغیرہ میں کیا گیا ہوتا تو واقعی جواب دینا مشکل ہو جاتا، لیکن کتنے ستم کی بات ہے یہ سوال اس دیس میں کیا جا رہا ہے، جہاں علماء کے شاندار کارناموں کا ایک سلسلہ ہے جو صدیوں سے چلا آ رہا ہے، کیا نیاز صاحب جیسی عظیم و عبقری کو مجھ جیسا شخص بتائے کہ علماء ہند کے کارنامے کیا ہیں؟ کیا سید احمد، اور سید اسماعیل شہید کے کارناموں سے نیاز صاحب ناواقف ہیں؟ کیا مولانا قاسم، مولانا گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے کارنامے جب بتائے جائیں، تب نیاز صاحب جانیں گے؟ کیا مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حسین احمد مدنی کے کارنامے اتنے غیر دقیع ہیں کہ ان سے نیاز صاحب کا واقف ہونا ان کے لئے باعث توہین ہے؟ پھر کیا مولانا ابوالکلام آزاد، کے وجود سے بھی نیاز صاحب انکار کر دیں گے؟

گفتگو کا ایک طرز یہ بھی ہے کہ مغالطہ دیا جائے، نیاز صاحب کی یہ بات اسی
قبیل سے ہے، انھیں اپنے قارئین کی فکر وفہم پر اعتماد کامل ہے کہ وہ بڑی آسانی
سے مغالطہ میں آجائیں گے، لہذا پوری دلیری سے وہ ایک غلطیات غلط
ہیں پیش کر رہے ہیں، سب سے پہلی تو یہ ہے کہ نیاز صاحب نے روایت
کے علاوہ جن آئمۂ فن کا اسم گرامی لیا ہے، وہ تقریباً سب کے سب وقت کے
بڑے عالم ہی تھے! ——— ناظرین نگار کے بارے میں تو میرا کچھ
عرض کرنا مناسب نہ ہوگا، لیکن نیاز صاحب کے بارے میں وہ اگر انکار کریں تو میں
نہ مانوں گا، کہ ان حضرات کو وہ عالم نہیں سمجھتے! ——— دوسرے
علوم سے قطع نظر، خالص مذہبی علوم میں ابن رشد کی "بدایۃ المجتہد
رازی کی تفسیر کبیر، اور غزالی کی احیاء علوم الدین کا پایہ کس صاحب علم سے مخفی
رہا یہ طعن کہ علماء نے علماء کو فراموش کر کے صرف "چند" محدثین وفقہا کو یاد
سو یہ دلچسپ تو ضرور ہے، لیکن اس کی دلچسپی اتنی ہی بے ثبات ہے، جتنا
دعویٰ ——— حقیقت منکشف ہونے کے بعد حیرت کے سوا
پلے نہ پڑے گا۔

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُرپیچ وخم کا پیچ وخم نکلے!

نیاز صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے، علمائے اسلام ترجیح بلا مرجح کے قائل کبھی
رہے، وہ ہر ایک کا مقام پہچانتے ہیں، جہاں موقع ہوتا ہے وہ ابن رشد
کرتے ہیں، جہاں ضرورت ہوتی ہے ابوہریرہ کا! ———
نیاز صاحب نے فرمایا ہے کہ روایات کے سہارے علماء خود تو زندہ
لیکن دوسروں کو نہیں جینے دیتے، ضروری تھا کہ اس کی کچھ تشریح

ملائیّت کا فتنہ

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا

مشرقی پاکستان کے گورنر میجر جنرل اسکندر مرزا نے ایک موقعہ پر فرمایا، پاکستان کا دشمن نمبر ایک کمیونزم ہے، اور دشمن نمبر دو ملائیت، کمیونزم کے بارے میں ارشاد ہوا کہ اگر میرا بس چلے تو اسے سارے پاکستان میں ممنوع قرار دے دوں، ملائیت کے بارے میں وہ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ یہ نہیں معلوم، کم از کم انھوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس بارے میں کچھ فرمائیں، اسکندر مرزا صاحب کے ان خیالات میں کوئی ندرت نہیں ہے، حکومت کے ایوان سے اکثر اس طرح کے فتوے نشر ہوتے رہتے ہیں، گورنر جنرل صاحب بھی اس عنوان بلیغ پر کئی مرتبہ اظہار خیال کر چکے ہیں، ارباب حل و عقد میں سے بھی کئی صاحبان طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ملائیت ہے کیا؟ کمیونزم کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ ایک ایسا نظام ہے جو سرمایہ داروں سے سرمایہ چھین لیتا ہے، جو [illegible] افراد کا حق ملکیت ضبط کر لیتا ہے، جو آزادی رائے، آزادی تقریر [illegible] اجتماع کا دشمن ہے جو مذہب کا مخالف ہے، جو جبری تعمیر کا قائل ہے [illegible] دعوی کے نام پر فرد کو مشین بنا دیتا ہے، اور پھر بھی اس کا پورا صلہ نہیں

نیاز صاحب سے کچھ بعید نہیں کہ وہ یہ سب کچھ کر گزریں، اور اس پر مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوگی، لیکن کیا تاریخ بھی اپنے صفحات پھاڑ کر خودکشی کرلے گی؟ مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا سید امیر علی، اور اس عہد کے دوسرے بزرگوں کے مجاہدات، انگریزی استعمار کے دل پر نقش ہیں، اور اس نقش کو جب انگریزوں کی سنگینیں اور تلواریں نہ کھرچ سکیں، تو نیاز صاحب کے ناخن بھی (خواہ کتنے ہی تیز کیوں نہ ہوں) نہیں کھرچ سکتے، وہ نقش کبھی نہیں مٹ سکتا۔

جس کو کیا ہو کبھی مرد خدانے تمام

اور یہ نقوش مردان خدا ہی کے تمام کئے ہوئے ہیں! ——— اگر ان علماء کی پیشانی کا داغ ناتمامی نیاز صاحب دھونا چاہتے ہیں، تو کل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ مصفا کو دیکھ کر وہ فرمائیں "یہ گدلا ہے، اس میں چونا ڈال دو تاکہ یہ سفید ہو جائے، پھر اسے تارکول میں حل کر دو، تاکہ اس کی سفیدی چمک جائے۔

نیاز صاحب کو علماء سے اگر رنجش ہے تو وہ سمجھ میں آسکتی ہے جب کبھی وہ اس گروہ پر تند و تیز لب و لہجہ میں تنقید کرتے ہیں تو میرا دل ان سے ہمدردی کرنے لگتا ہے، لیکن یہ بات میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی کہ یہ رنجش اتنی بڑھ سکتی ہے کہ وہ حقائق کو بھی چیلنج کرنے لگیں گے۔ ——— کیا حریف کے مقابلہ میں اس سے بڑی بھی کوئی شکست ہو سکتی ہے؟

(دسمبر ۱۹۵۴ء)

کے ممبر منتخب ہوسکیں، یہی حال برہمنیت کے ہاتھوں جین مت کا ہوا، لہذا جب ہمارے سامنے کوئی برہمنیت کا نام لیتا ہے، تو ہم کانپ جاتے ہیں، اور ہر ہندو کو خدا کا ثنا خواں پاتے ہیں کہ وہ اُس زمانہ میں نہ پیدا ہوا، لیکن کیا اسکندر مرزا صاحب از راہ بندہ پروری ارشاد فرمائیں گے کہ ملائیت کی تاریخ بھی اتنی ہی سیاہ ہے؟ بلکہ ملائیت کی کوئی "تاریخ" ہے بھی؟ ہمارے سامنے اسلام کی ۱۴ سو برس کی مکمل ترین اور مستند ترین تاریخ موجود ہے، یہ تاریخ دوستوں نے بھی لکھی ہے، اور دشمنوں نے بھی، اس تاریخ میں کہیں بھی ملائیت نام کا کوئی فتنہ نہیں نظر آتا، بلکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ملوک و سلاطین اور آمرین مطلق نے جب حق کا راستہ چھوڑا، اور باطل کے راستے پر گامزن ہوئے تو وہ علمائے حق ہی تھے، جنھوں نے امیر معاویہ کے دربار میں، عبد الملک بن مروان کے ظلم کدے میں، حجاج بن یوسف کی تلوار کے سامنے، ہارون الرشید اور مامون الرشید اور معتصم باللہ کی قہرمانیت کے سامنے اور ہندوستان میں جلال الدین اکبر بلکہ اکبر سے بھی بہت پہلے خلجی، اور تغلق کے مواجہ میں، حق بات کہی، اور کسی قیمت پر مداہنت کے لئے آمادہ نہ ہوئے، اور وہ حق بات کیا تھی؟ یہ کہ قرآن کو اپنا راہ نما بناؤ، سنت رسولؐ کو اسوۂ حسنہ قرار دو، ذمیوں اور غیر مسلموں کے ساتھ عدل و رواداری کا برتاؤ کرو، کیا یہی وہ ملائیت ہے جس سے میجر جنرل صاحب بالقابہ برہم ہیں؟ جناب والا، اگر یہ ملائیت نہ ہوتی تو آج اسلام بھی نہ ہوتا، پاکستان بھی نہ ہوتا، مسلمانوں کا ایک آزاد اور خود مختار — وطن بھی نہ ہوتا ——————!

اسکندر مرزا صاحب میں اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے تھی کہ وہ صاف اور واضح الفاظ میں اُن علماء یا ملاؤں کی مذمت کرتے، جو مذہب کی غلط ترجمانی کرتے ہیں، جو مذہب کے نام پر دھوکہ دیتے ہیں، جو مذہب کی آڑ میں زمام حکومت

لیکن ملائیت کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے، ہماری طرح اور بھی بہت سے لوگ نہیں جانتے، اسکندر مرزا صاحب کو بتانا چاہیئے تھا کہ وہ کس قسم کی ملائیت ہے جس سے وہ پناہ مانگ رہے ہیں؟ بلا شبہ ہم پاپائیت شاہی THEOCRACY سے واقف ہیں اور تاریخ یورپ کا ایک ایک صفحہ اس لرزہ خیز حقیقت کا آئینہ دار ہے، کہ پادریوں نے خدا کا نام لے لے کر بندوں پر کیسے کیسے قیامت خیز مظالم توڑے، علم و تحقیق کے دروازے کس کس طرح بند کئے؟ حق گوئی اور صداقت کو کس کس طرح کچلا؟ آزادی رائے، آزادی فکر، آزادی خیال، اور حریت نطق و کلام کو کس کس طرح استبداد و قہرمانیت کے شکنجہ میں کسا؟ گمراہی عیاشی اور عوام دشمنی کے کس کس طرح مظاہرے کئے، اور جب ہمارے سامنے کوئی تھیاکریسی کا نام لیتا ہے تو ہم کراہت کے ساتھ یہ لفظ سنتے ہیں، اور حقارت کے ساتھ اس کو ٹال دیتے ہیں، ہم برہمنیت سے بھی واقف ہیں اور تاریخ ہند قدیم کا ایک ایک حرف اس ہولناک تاریخ کے کارناموں کا گواہ ہے، ہمیں معلوم ہے کہ برہمنیت نے مذہب کا نام لے کر کس طرح مذہبی علوم کی اجارہ داری حاصل کر لی، اور اس اجارہ کے حاصل کرنے کے بعد کس طرح عوام کو، اور عوام کے مختلف طبقات کو اس طرح پامال کیا جس طرح ہاتھی کے پاؤں تلے چیونٹی پامال ہوتی ہے، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ برہمنیت ہی تھی جس نے دنیا کے بہت بڑے اور بھارت کے سب سے اچھے اور عوامی مذہب —— بدھ مت —— کو اس طرح جلاوطن کیا کہ آج بھارت سے باہر کروڑوں بودھ موجود ہیں، چین، جاپان، برما، لنکا، ہند چینی اور متعدد مقامات پر ان کی حکومت قائم ہے، لیکن بھارت میں بودھ مت کے پیرو، اتنی آبادی بھی نہیں رکھتے کہ کسی صوبہ کی اسمبلی یا ڈسٹرکٹ بورڈ، بلکہ میونسپلٹی تک

ایک قوم تین زبانیں

بالآخر پاکستان کی مجلس دستور ساز نے فیصلہ کر دیا، کہ پاکستان کی تین سرکاری زبانیں ہوں گی، اردو، برائے بیت، بنگالی برائے نام، اور انگریزی، تا قیام قیامت! —— سچ کہا محمد علی صاحب نے، انگریزی چھوڑ کر، ہم دنیائے مغرب سے اپنا رشتہ تو قطع نہیں کر سکتے، —— گویا مغربی دنیا سے اگر رشتہ کٹ گیا، تو پھر اس زندگی کا مصرف کیا ہوگا؟

سدھاریں شیخ کعبہ کو، ہم انگلستان دیکھیں گے،
وہ دیکھیں گھر خدا کا، ہم خدا کی شان دیکھیں گے

اس فیصلے کے بعد، سادہ لوح قوم کو درس دانش دیتے ہوئے، محمد علی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ، کسی ایسی زبان کی تلاش و جستجو بھی جاری رہے، جسے پاکستان کی زبان بن سکے، یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ، اس وقت تک یعنی فی الحال تو پاکستان کے پاس کوئی ایسی زبان نہیں ہے، اگر آئندہ چل کر معرض وجود میں آگئی، تو اسے قبول کر لیا جائے گا! جس کا وجود، محمد علی صاحب کو نظر نہیں آ رہا ہے، یہ وہ زبان ہے، جسے قائد اعظم نے پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا، قائد ملت نے جس کے بارے میں

ہاتھ میں لینے کی تیاریاں کرتے ہیں، جو مذہب کا نعرہ لگا کر اختیار و اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں، جو عوام کو گمراہ کرتے ہیں، عوام کی جہالت اور حُسنِ عقیدت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، سو اگر ایسے کچھ لوگ ہیں تو ان کا نام لے کر ان پر تنقید کیجیے، انھیں موردِ الزام قرار دیجیے، انھیں جیل میں بند کیجیے، انھیں پھانسی پر لٹکایئے لیکن ملائیت کا نام لے کر اسلام پر تہمت نہ لگایئے، ملائیت نے ایک انسٹی ٹیوشن (ادارہ) کی صورت میں کبھی بھی مسلمانوں میں فروغ نہیں پایا، علمائے حق کی جماعت کے ساتھ کچھ علمائے سوء بھی پیدا ہوتے رہے اور یہ ہمیشہ حقارت اور ذلت کی نظر سے دیکھے جاتے رہے، یہ کبھی کوئی مقام نہیں حاصل کر سکے، نہ تاریخ نے انھیں معاف کیا، نہ تاریخ سازوں نے ان پر رحم کیا، اسکندر مرزا صاحب اگر علمائے سوء سے برہم ہیں تو ہم ان کے ساتھ ہیں، لیکن انھیں اس کی تصریح کر دینا چاہیے تھی، انھوں نے مطلق طور پر ملائیت کا نام لے کر ـــــ غالباً نادانستگی کے عالم میں ـــــ اسلام کی توہین کی ہے، اور اسلامی تاریخ سے اپنی ناواقفیت کا ناقابلِ تردید ثبوت پیش فرمایا ہے، ـــــ اسلام کے پرکھنے کا معیار موجودہ مسلمان نہیں ہیں، بلکہ اسلام کے تعلیمات و ہدایات اور اصول ہیں اسی طرح علماء کے پرکھنے کا معیار علمائے سوء نہیں ہیں بلکہ وہ کردار ہے، وہ عمل ہے، وہ حقانیت اور صداقت ہے، جس نے علمائے حق کو ہر دور میں بلند رکھا ہے، یہ نازک اور لطیف فرق اسکندر مرزا صاحب، اور ان کے دوسرے ہم خیالوں کو ہمیشہ نظر میں رکھنا چاہیے! ٥

(جولائی ۱۹۵۷ء)

اثرانگیز اور دوررس ہوتی ہے، بھارت اس راز کو جانتا تھا۔ اسی لیے
نے اردو کو ختم کر دیا، اور ایک ایسی زبان ـــــ ہندی ـــــ سرکاری
زبان بنائی جو ابھی تک زیرِ تشکیل و تخلیق ہے، پاکستان اس راز سے ناواقف
بنا وہ اپنی زبان کو موت کے حوالے کر رہا ہے، آہ!
اس میں کوئی شبہ نہیں یہ فیصلہ ناقابلِ قبول ہے، اسے ہرگز نہیں قبول
کیا جا سکتا، پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہے، نہ بنگالی، نہ
انگریزی، لیکن اس مطالبہ کو منوانے کے لئے، ہم نے اب تک کیا کیا ہے؟
جلوس اور ہڑتال سے یہ مسئلہ طے نہیں ہو سکتا، ضرورت ہے کہ کامل احتیاط
غور و فکر اور صلاح و مشورہ کے بعد، ایک عملی پروگرام مرتب کیا جائے
جو تعمیری بھی ہو، اور تخلیقی بھی، اور اس پروگرام کا دائرہ عمل، مشرقی پاکستان
تک وسیع ہو، ہمارا خیال ہے، اگر مشرقی پاکستان میں، اردو، کا ٹھوس بنیادوں
پر پروپیگنڈا کیا جائے، اور وہاں کے باشندوں کو اردو کی افادیت، اہمیت
ہمہ گیری کا ثبوت بہم پہنچایا جائے، اردو رسم الخط کی آسانی اور نیم مذہبی حیثیت
سمجھائی جائے، تو یقیناً وہاں بھی اردو کے حامیوں کا ایک موثر گروہ پیدا
ہو سکتا ہے، جس کی تائید اردو کے وزن کو اتنا زیادہ کر دے گی کہ لوگ خود
اس مبہم، متضاد، اور مہمل، فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو جائیں گے"! ٭

(جون ۱۹۵۴ء)

بالفاظ واضح اعلان کیا تھا، کہ پاکستان کی سرکاری زبان کیا ہوگی، ۱۹۳۸ء میں فضل الحق صاحب توکسی شمار قطار میں نہیں تھے، لیکن فضل الحق نے، اسی زبان کے رنگ تقسیم ہند کا مطالبہ کیا تھا، گاندھی، جواہر لال، پٹیل اور کھارے سے، جو کمی جنگ لڑے تھے، !

بابائے اردو، مولوی عبدالحق صاحب نے اس فیصلہ کو" مبہم، متضاد، اور مہمل" قرار دیا ہے، اور اس قوم کی بدنصیبی میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے، جس پر اس طرح کے مبہم، متضاد اور مہمل فیصلے، عائد کئے جائیں، اور وہ انھیں قبول کرنے پر مجبور ہو جائے،

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو؟

جس طرح افراد کو، اعمال بد کی سزا قدرت کی طرف سے ملتی ہے، اسی طرح قومیں اور ملتیں بھی، فطرت کی تعزیر سے نہیں بچ سکتیں، یہ ہماری قومی غلطیوں کا نتیجہ ہے کہ آج محمد علی، شوکت علی، اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، شیخ الہند محمود الحسن، شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی، قائداعظم محمد علی جناح، اور لیاقت علی خاں کی مسند پر وہ لوگ متمکن ہیں جو دھڑلے سے، مبہم، متضاد، اور مہمل فیصلے کرتے ہیں اور قوم ان سے یہ مسند واپس نہیں لے سکتی!

جرمنی نے آسٹریا پر اس لئے قبضہ کیا تھا اور یورپ منہ دیکھتا رہ گیا تھا کہ جرمنی اور آسٹریا کی زبان ایک تھی، امریکہ اور برطانیہ میں گزشتہ اور آئندہ کا رشتہ صرف اس لئے قائم ہے کہ دونوں کی زبان ایک ہے۔ فرنچ جب تک یورپ کی عملاً" سرکاری" زبان رہی فرانس کے عروج و ارتقاء پر دوسرے ملک رشک کرتے رہے، زبان کی وحدت قومی، وطنی، اور ملی وحدت کے

کیا اس تجویز کو ہم اس لئے مان لیں کہ محمد علی، اور نور الامین اور فضل الرحمان وخوانہم اس کے حامی، محرک، موئد، اور علمبردار ہیں، لیکن کیا ہم نہیں جانتے کہ جب قائد اعظم نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں بہ بانگ دہل اعلان فرمایا تھا کہ ہ پاکستان کی سرکاری زبان صرف اردو ہوگی، اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں ہو سکتی، جو کوئی آپ کو غلط راستے پر ڈالے۔ وہ پاکستان کا دشمن ہے!" — تو یہ سب تائیدیں گردن ہلاتے تھے، ان میں سے کسی میں جرأت نہیں تھی کہ اٹھتا اور کہتا نہیں قائد اعظم بنگلہ بھی سرکاری زبان ہوگی، اور پھر قائد اعظم کی وفات کے بعد جب شہید ملت لیاقت علی خاں نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ " اردو اور صرف اردو ہی ہماری قومی زبان ہے، اور یہی ایک زبان ہے جو پاکستان کی قومی زبان بننے کی مستحق ہے!" تب بھی محمد علی اور نور الامین، فضل الرحمان اور ان کے اخوان طریقت اگرچہ زندہ تھے، لیکن ان پر سکوت مرگ کا سا چھایا ہوا تھا، ان میں سے کسی نے یہ جرأت نہیں کی کہ اٹھتا اور شہید ملت سے کہہ دیتا آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں، پاکستان کی دوسری قومی زبان بنگلہ ہے، جو لوگ اتنے کم ہمت ہوں، یہ قسمت کی بات ہے کہ آج وہ اپنی بات قوم سے منوانے پر تلے ہوئے ہیں۔

وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں مری مان جائیے
اللہ تری شان کے قربان جائیے

جن لوگوں سے یہ نہ ہو سکا کہ قائد اعظم کے نقش قدم پر چلتے، ان کے بتلائے ہوئے پروگرام کو عمل میں لاتے ان کے پیام کو گھر گھر پہنچاتے اور اس کی تبلیغ کرتے، وہ کس منہ سے یہ توقع رکھتے رہے ہیں کہ ہم ان کی بات مان لیں، خدمات، قابلیت، اہلیت، اخلاص، کس چیز میں یہ اپنے پیش رو سے زیادہ ہیں؟ زیادہ کو چھوڑیئے کس چیز میں برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں، جب عمل کا کیسہ خالی ہے تو انھیں تو

اُردو مرحوم

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

۱۹ اپریل کو مجلس دستور ساز پاکستان کی مسلم لیگ پارٹی نے بکثرت آراء فیصلہ صا
کر دیا کہ

(۱) پاکستان کی دو سرکاری زبانیں ہوں گی: بنگالی اور اردو،

(۲) انگریزی ابھی بیس سال تک پاکستان کی سرکاری زبان رہے گی!

۱۹۴۸ء میں قائد اعظم نے وفات پائی، ۱۹۵۱ء میں قائد ملت شہید ہوئے، ۱۹۵۴ء میں اردو کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ فیا للعجب و یا للحسرۃ!

کیا اس فیصلہ کو ہم اس لئے مان لیں کہ کچھ موقع پرست سیاست دانوں کے مصالح کا تقاضا یہی ہے کہ وہ جب تک زندہ رہیں انگریزی میں بولتے اور لکھتے رہیں، اور بیس برس میں جب یہ مسئلہ اور زیادہ نازک اور سنگین صورت اختیار کر لے تو آنے والی نسل کے دست و بازو پر اسے چھوڑ دیا جائے کہ وہ جس طرح چاہے اسے حل کرے؟ گویا بیس برس تک اردو پامال ہوتی رہے، اور غیر ملکی زبان پروان چڑھتی رہے، ہندوستان نے ایک نئی زبان ہندی کے لئے دس سال کی مدت رکھی، ہم ایک بنی بنائی زبان کو بیس سال کے لئے کولڈ اسٹوریج میں رکھ دیں؟

مجمع سے نہیں ٹلتا تھا جب تک رائے عامہ کو ہمنوا نہ بنا لے، رائے عامہ کے طوفان سے ٹکراتا تھا شوکت علی جو کانگریس کے دورِ حکومت میں سارے ہندو صوبوں کا، اور خان صاحب کے عہد وزارت عظمیٰ میں پورے صوبۂ سرحد کا، اور عبدالغفار خاں کی گاندھویت کے عہد شباب میں خاص چارسدہ کا دورہ کر آیا، اور رائے عامہ کے تھپیڑے کھا کھا کر بالآخر یوں اسے ہموار کیا کہ سرحد میں مسلم لیگ کی وزارت قائم ہو گئی، رائے عامہ سے ٹکر لیتا تھا جناح، خلافت اور کانگریس کے عہد عالم آشوب میں، ان تحریکوں کی مخالفت پبلک پلیٹ فارم سے کی، —— ذرا سی تائید کر کے وہ ہندوستان کا شاہ بے تاج اور مسلمانوں کا رہنمائے اعظم بن سکتا تھا، لیکن اعزاز کو اس نے ٹھکرا دیا، رائے عامہ کو اگر اپنے ساتھ نہ کر سکا تو خود بھی رائے عامہ کے ساتھ چلنے کے ننگ کو گوارا نہ کیا، یہ لوگ جو طالب علموں اور کچھ ہنگامہ پسندوں کے خوف سے لرز جاتے ہیں رائے عامہ کی قیادت کریں گے؟

—— یہ ہیں ہمارے لیڈر؟ یہ آرزومند ہیں قوم کی سالاری کے ——

——؟

کہ تخت کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

پھر یہ تجویز کیا ہم اس لئے مان لیں کہ اس میں معقولیت ہے؟ ہاں ہم تیار ہیں کہ اسے مان لیں، لیکن بتاؤ جس زبان کو تم ہمارے سر منڈھنا چاہتے ہو اس نے کوئی غالب پیدا کیا؟ کوئی اقبال؟ کوئی میر؟ کوئی شبلی؟ کوئی ذکاء اللہ؟ کوئی سرسید کوئی عبدالحق؟ کوئی سید سلیمان؟ کوئی عبدالماجد؟ کوئی نذیر احمد؟ کوئی راشد الخیری؟ بابو بنکم چندر چٹرجی، اور سرت چندر کے ناول پڑھنے کے لیے بنگلہ سیکھیں؟ بابو ٹیگور وغیرہ کی غیر اسلامی اور غیر ملی شاعری کا مطالعہ کرنے کے لیے بنگلہ پڑھیں؟

کے سامنے آتے ہوئے جھجکنا چاہیے، تاکہ قوم کو اپنے مرغوبات پر ایمان لانے کی تلقین کریں ——— !

کیا اس تجویز کو ہم اس لئے مان لیں کہ مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی نے اسے پیش کیا ہے؟ لیکن جب مسلم لیگ ہی واصل بحق ہو چکی تو اس کی پارلیمنٹری پارٹی کیا بلا ہے؟ آخر یہ لوگ مسلم لیگ مرحوم کا نام کب تک رٹتے رہینگے، حالانکہ وہ قبر سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے،

مری خاک تک لحد میں نہ رہی امیر باقی
انہیں مرتے ہی کا اب تک نہیں اعتبار ہوتا

کتنی عجیب بات ہے! یہ حضرات مسلم لیگ کا نام لے کر، مسلم لیگ کے کارناموں پر پانی پھیر رہے ہیں، قائد اعظم کا نام لے کر قائد اعظم کے فیصلوں کو پامال کر رہے ہیں، پاکستان کا نام لے کر پاکستان کی سالمیت کو مجروح کر رہے ہیں، مگر لیڈر ہیں، قائد ہیں، وزیر ہیں، یہ اگر دوست ہیں تو خدا ہمیں ایسے دوستوں سے بچائے!

پھر کیا اس تجویز کو ہم اس لئے مان لیں کہ یہ پاکستان کی اکثریت کی ترجمان ہے؟ مان لیتے ہیں، مشرقی پاکستان کی آبادی مغربی پاکستان سے زیادہ ہے لیکن ڈھاکہ یونیورسٹی کے یورش پسند طلبہ کے سوا یا چند موقع پرست اور نام نہاد لیڈروں کے سوا یہ تجویز کب اور کس کی طرف سے پیش ہوئی ہے؟ کیا مشرقی پاکستان اور ڈھاکہ یونیورسٹی ایک ہی اسم کے دو مسمیٰ ہیں؟ کیا مشرقی پاکستان کی قیادت ڈھاکہ یونیورسٹی کے ہاتھ میں ہے؟ کیا پاکستان کی موت وزلیست کا فیصلہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ کے ہاتھ میں دیا جا سکتا ہے؟ جو قیادت اتنی بزدل ہو کر ایک یونیورسٹی کے طلبہ کے سامنے گھٹنے ٹیک دے، وہ رائے عامہ کا کیا مقابلہ کر سکے گی؟ ——— رائے عامہ کا مقابلہ کرتا تھا محمد علی، لاکھوں کے

نہیں حاصل کیں؟ کیا بنگلہ میں یہ ممکن ہے؟ ایک شخص فارسی کا ایک لفظ نہ جانتا ہو، لیکن صرف اردو کتابیں پڑھ کر وہ حافظ، خیام، سعدی بلکہ اس کتاب مقدس یعنی:

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآں درزبان پہلوی

کے اسرار و رموز سے پورے طور پر آشنا ہو سکتا ہے، کیا بنگلہ زبان سیکھنے کے بعد بھی یہ ممکن ہے؟

یہ جذباتی مسئلہ نہیں، ٹھوس اور سنجیدہ مسئلہ ہے، اس پر جذبات کی رو میں بحث نہیں ہو سکتی، سنجیدگی سے غور و فکر، اور بحث و گفتگو کی ضرورت ہے، اگرچہ اس مہمل اور غیر دانشمندانہ فیصلے نے اردو کے حامیوں کو بھی، اب جذبات سے معمور کر دیا ہے،

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

کل ہی کی بات ہے ایک مشہور ادیب اور ناولسٹ جو کراچی میں رہتے ہیں میرے پاس تشریف لائے، اسی موضوع پر گفتگو چلی، اُن کے تاثر کا یہ عالم تھا کہ آنکھیں پُر آب تھیں، وہ بار بار اس عزم کا اظہار کر رہے تھے کہ اردو کو اگر زندہ رکھنا ہے تو کچھ کرو، کہہ رہے تھے، مجھے اپنے والدین کے انتقال کا اتنا صدمہ نہیں ہوا تھا، جتنا مجھ کو اس نا عاقبت اندیشانہ فیصلہ کا ہوا ہے، وہ اردو کے تحفظ اور بقا کے لیے جیل جانے کو تیار تھے، یہ صرف ایک شخص ہی کی نہیں، ہر اردو دوست کے دل کی آواز ہے۔

آج سے پچاس برس پہلے یوپی کے لفٹنٹ گورنر سر انٹونی میکڈانل نے اردو

کیا ہم سنسکرت سے بھرے ہوئے، اسلامی روح اور مفہوم سے عاری بھجن، گیت، نغمے اور کتھا دیکھنے کے لئے بنگلہ پڑھیں؟ کیا ہم ہندو دیو مالا سے لطف اندوز ہوتے کے لئے بنگلہ پڑھیں؟ ——— ہم؟ جنھوں نے ہندو دیو مالا کو بھی طلسم ہوشربا، اور داستان امیر حمزہ لکھ کر مسلمان کرلیا؟ اور سحر اتنا قائم رکھا کہ اس اسلامی دیو مالا کو ایک ہندو نے نہ صرف زرکثیر اپنے مطبع میں چھاپا اور مسلمانوں ہی کی طرح ہندو قوم نے بھی اسے ذوق و شوق، اور وجد و کیف سے بے خود ہوکر پڑھا، ——— کیا تم نے یہ کام کرلیا ہے؟ پہلے یہ کرلو، پھر ہم سے کہنا کہ بنگلہ بھی پاکستان کی سرکاری زبان ہوگی! ——— پھر ہم تمھارے ساتھ ہوں گے!

ہماری یہ باتیں تعلّی پر نہیں حقیقت پر مبنی ہیں، ہم اردو کو اس لئے سرکاری زبان بنانا نہیں چاہتے کہ وہ ہماری مادری زبان ہے، ہم مغربی پاکستان کے باشندوں نے اپنی مادری زبان ——— پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو ——— کو اردو پر قربان کردیا اس لئے کہ اردو زبان فارسی سے کہیں زیادہ اور عربی سے بھی بڑھ چڑھ کر اسلامی علوم و فنون کی حامل ہے، ایک شخص عربی کا ایک حرف نہ جانتا ہو، صرف اردو کی کتابیں پڑھ کر وہ مفسّر، محدث، فقیہ، متکلم، اور مورخ بن سکتا ہے، کیا بنگلہ میں اتنا مذہبی اور دینی سرمایہ ہے؟ ایک شخص انگریزی کا ایک حرف نہ جانتا ہو تو بھی صرف اردو کتابیں پڑھ کر وہ فلسفۂ جدیدہ، علم النفس، اقتصادیات، انجینرنگ، طب جراحت، زراعت، فلاحت، اور دوسرے علوم عصری میں مہارت تامہ حاصل کرسکتا ہے کیا جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، اور جامعہ ملیہ دہلی کے طلبہ نے علوم عصری کی اردو میں تعلیم حاصل کرکے، لندن، برلن اور پیرس کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں اعزاز و امتیاز کے ساتھ

اس فرمان کو روبہ عمل لانے کے لئے پاکستان کے پنجابی اور بنگالی، سندھی، بلوچی پختونی اور مکرانی کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے، پاکستان میں وہی حکومت قائم رہ سکتی ہے، جو قائد اعظم کے اصول اور مقصد کی پیرو ہو، اور جو حکومت ایسا نہیں کر سکتی اسے مستعفی ہونا پڑے گا، پاکستان میں وہی شخص وزارت عظمیٰ کے منصب پہ فائز رہ سکتا ہے، جو قائد اعظم کے منہاج اور مسلک پہ آنکھ بند کر کے چلے، منحرف ہونے کا ہر شخص کو حق ہے، لیکن پھر وزارت کا منصب اس کے پاس نہیں رہ سکتا۔

مخدوم الملک سید میراں شاہ کے دولت کدہ پہ ایک دعوت کے سلسلہ میں صاحبزادہ حسن محمود وزیر اعظم بہاولپور اور سردار امیر اعظم وزیر مملکت حکومت پاکستان سے اس مسئلہ پر دل کھول کر بسط و تفصیل سے گفتگو ہوئی، میں نے محسوس کیا یہ حضرات بھی اس کے منکر نہیں ہیں کہ ملک و ملت کی سالمیت اور وحدت کے لئے ایک زبان ناگزیر اور لابدی ہے، میں ان دونوں حضرات کی ذہانت، وسعت نظر، وسعت معلومات معاملہ فہمی، سنجیدگی فکر و رائے اور تیزی فہم و ادراک سے بھی بہت متاثر ہوا، حسن محمود کے متعلق تو میں کہہ سکتا ہوں اگر یہ اسی رفتار سے آگے بڑھتے رہے تو کچھ بعید نہیں اگر ایک دن وہ آئے کہ پاکستان کی وزارت عظمیٰ ان کے ہاتھ میں ہو، اس لئے کہ اب پاکستان کو نئے اور جواں خون کی ضرورت ہے، بوڑھے اور از کار رفتہ سیاست داں بیکار ہو چکے ہیں۔

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

اب نیا خون، اور نئی سیاست ہی پاکستان کو نئی زندگی عطا کر سکتی ہے:

وقت ہے کہ یہ آگے ——————

کے مقابلہ میں ایک نئی زبان ہندی لاکر کھڑی کی تھی تو قیصر باغ کی بارہ دری لکھنؤ میں نواب محسن الملک سکریٹری علی گڑھ کالج نے ایک دل ہلا دینے والی تقریر اردو کے تحفظ و بقا کے سلسلہ میں کی تھی، اور شیدائیان اردو سے کہا تھا،

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس تقریر نے گورنمنٹ ہاؤس میں تہلکہ مچا دیا، اور اردو قتل ہونے سے بچ گئی تھی لیکن اب کہ ملت پاکستان کے ناخدا، اردو کا گلہ گھونٹنے کا عزم صمیم کر چکے ہیں ہم اگر اردو کو بچا نہیں سکتے تو کیا اس کا جنازہ بھی شاندار طور پر نہیں نکال سکتے؟ آج پھر محسن الملک کی روح جنت الفردوس سے بآواز بلند ہر اردو دوست سے کہہ رہی ہے،

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اور یہ جنازہ ایک دوسرے "محسن الملک" اور "وقار الملک" بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کے بوڑھے لیکن مضبوط کاندھوں پہ ۲۱ر اپریل کو بڑی شان سے اٹھا۔ اس پیر جواں ہمت کے ڈگمگاتے ہوئے قدموں میں پہاڑ کا استحکام، اس کی نحیف اور کمزور آواز میں بلا کی قوت اور شدت ہے، ۸۶ برس تک مسلسل دھڑکتے رہنے کے باوجود، اس کے قلب میں وہ سوز اور تاثر تھا کہ جب وہ سفید ریش اور کہن سال بزرگ

جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

اپنے خلوت کدہ سے باہر نکلا تو دو لاکھ کا جم غفیر بیتابانہ اور مشتاقانہ پیچھے پیچھے چل رہا تھا، اور ہر قربانی کے لئے آمادہ اور مستعد تھا۔

ہم قائداعظم کے الفاظ کو دہراتے ہیں "پاکستان کی سرکاری زبان اردو صرف اردو ہوگی" اور قائداعظم کی روح پُرفتوح کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کے

کراچی جیل اور خالق دینا ہال

اخبارات میں خبر شائع ہوئی ہے کہ حکومت پاکستان نے فیصلہ کر لیا ہے
کھادر کا وہ مکان خرید کر محکمۂ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا جائے، جہاں قائد اعظم
کی ولادت ہوئی تھی اور انھوں نے ہوش کی آنکھیں کھولی تھیں، محکمۂ آثار قدیمہ
س عمارت کو اپنی تحویل میں لے کر، اسے قومی میوزیم کے طور پر استعمال کریگا!

بڑا مبارک فیصلہ ہے اور اس فیصلہ پر ہم حکومت پاکستان کو مبارکباد
تے ہیں، یہ فیصلہ اب سے پہلے ہونا چاہئے تھا، لیکن اب بھی بعد از وقت
ہیں ہے لیکن ہم اپنے ضمیر پر ظلم کریں گے اگر اس موقع پر حکومت کو
کی ایک زبردست کوتاہی کی طرف متوجہ نہ کریں!

آج سے ۳۰ - ۳۲ برس پہلے کراچی کے خالق دینا ہال میں ایک مجسٹریٹ
عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر حق، صداقت، حب وطن، اور جذبۂ حریت کا گلا
ٹنے کی کوشش کی تھی! ——— ایک غیر ملکی حاکم انصاف ———
کی تلوار ہاتھ میں لے کر مسند عدالت پر بیٹھا تھا، محمد علی اور شوکت علی اپنے
رفقاء کے ساتھ ایک باغی مجرم کی طرح اس کے سامنے عدالت کے کٹہرے
میں کھڑے کئے گئے تھے، علی برادران کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے فرنگی سامراج

بڑھیں اور کوئی ایسا فارمولا پیش کریں جو اس فتنہ کو کسی ہنگامہ اور نزاع کے بغیر ختم کر دے، یہ میری اپیل نہیں وقت کی پکار ہے! ٭ (مئی ۱۹۵۴ء)

مولانا شبلی اور عطیہ بیگم فیضی

بیگم زیب النساء حمیداللہ کے شہرۂ آفاق Mirror میں
عطیہ بیگم کا یہ مضمون میں نے دیکھا۔ اس کے پایۂ استناد کے بارے میں
کچھ کہنا میرے لئے ممکن نہیں لیکن، مضمون دلچسپ ضرور ہے۔
ترجمہ حاضر ہے،

(ح، ا، ج)

میرے والد حسن فیضی بے آفندی خلفائے دول عثمانیہ کی سرکار میں ایک
[illegible]مرتبہ پر فائز تھے، ترکیہ میں جتنے ہندوستانی آتے تھے ان سب کے لئے
[illegible]ے والد کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ کوئی ساٹھ سال کی مدت گزری شبلی
[illegible]نبول میں نادر کتب اور مخطوطات کی تلاش میں وارد ہوئے۔ والد نے نہ
[illegible]ت ان کی خاطر، تواضع اور مہمانداری کی بلکہ انھوں نے سرکاری، نیم سرکاری اور
[illegible] کتب خانوں تک انھیں پہنچنے میں بھی بڑی مدد دی، والد کو لسانیات سے بڑا
[illegible]ف تھا، وہ متعدد زبانوں کے ماہر تھے۔ انھوں نے قسطنطنیہ کے دورہ میں
[illegible]بلی کے ہمراہ رہ کر مدد کی، انھیں تمام متعلقہ اور ضروری معلومات بہم پہنچائے۔
والد نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شبلی کے ساتھ ایشیائی ترکستان اور
[illegible] تک گئے اور انھیں تمام اہم کتب خانوں اور کتابوں کی سیر کرائی۔ شبلی نے اپنے

کے خلاف بغاوت کی تلقین کی تھی، انھوں نے آزادی اور حریت کا نعرہ بلند کیا تھا، انھوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ بادشاہ انگلستان کی وفادار رعایا بننے سے انکار کرتے ہیں، انھوں نے فوج کو تلقین کی تھی کہ وہ مستعفی ہو جائے وہ ایک غیر ملکی حکومت کی ملازمت کر کے اپنے بھائی بندوں کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائے، انھوں نے وکیلوں اور بیرسٹروں سے اپیل کی تھی کہ وہ پریکٹس ترک کر دیں، اور فرنگی عدالت کا رخ نہ کریں، انھوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ سے اصرار کیا تھا کہ جنگ حریت کے میدان میں کود پڑیں اور وہ تعلیم نہ حاصل کریں جو انھیں غلامی اور کلرکی کی تعلیم دے رہی تھی، محمد علی اور شوکت علی نے عدالت کے سامنے پوری جراءت اور بیباکی کے ساتھ اپنے "جرم" کا اعتراف کر لیا تھا، اور سشن جج کو دعوت دی تھی کہ جو زیادہ سے زیادہ سزا دے سکتا ہے دے ڈالے! ——— اور انگریز سشن جج نے آزادی کے ان فدائیوں کو ایک لمبی مدت کے لئے کراچی جیل میں ٹھونس دیا تھا!

اب ہم آزاد ہو چکے ہیں، ہمارے عزم جواں نے ایک نیا ملک ——— پاکستان ——— بنا ڈالا، لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم ان لوگوں کو بھول جا رہے ہیں، جن کے ایثار، فدویت، قربانی، اور جفا طلبی کے باعث ہمیں آزادی کا دن دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی!

خالق دینا ہال اور کراچی جیل کا وہ حصہ جہاں علی برادران اپنے رفقاء کے ساتھ محبوس اور مقید رہے، اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ "نیشنل میوزیم" کا وہیں سے شروع کیا جائے، اگر یہ کام غلام محمد اور شعیب قریشی کے دو بھی انجام نہیں پا سکتا تو پھر کبھی انجام نہیں پا سکے گا ——— اے زعیمان وطن - وقت آ

(۶ جون ۱۹۵۲ء)

ہیں۔ ایک عجیب سکوت سامیری اس بات پر چھا گیا۔ پھر ہماری اور شبلی کی باتیں شروع ہوگئیں۔ یہ باتیں دلچسپ بھی تھیں اور پرلطف بھی۔ شبلی نے اپنے دورۂ ترکی کی کہانی چھیڑ دی اور یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ آخر میں شبلی نے کہا کہ میری سب سے بڑی تمنا یہ ہے کہ سیرۃ نبوی لکھوں لیکن میرے پاس وسائل نہیں مجبور ہوں، اب اسے معجزہ ہی سمجھئے کہ سرکار عالیہ نواب سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال بھی بمبئی آئی ہوئی تھیں۔ انھوں نے بھی ہمیں اپنے آنے کی اطلاع دی تھی اور اشتیاق ملاقات ظاہر کیا تھا۔ چنانچہ شبلی سے بات چیت ختم کرنے کے بعد ہم سیدھے سرکار عالیہ کے پاس پہنچے یہ ملاقات ایک عجیب اور یادگار ملاقات ثابت ہوئی۔

ہم نے سرکار عالیہ کو ایک بیدار مغز، وسیع النظر اور عورتوں کے لئے سراپا درد و ایثار ہستی کے روپ میں دیکھا۔ وہ زندگی کو ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادی تھیں، ان کی باتوں میں طنز بھی تھا اور وزن بھی۔ ہمیں رہ رہ کر حیرت ہو رہی تھی کہ اس قابل فخر خاتون نے چار دیواری کے زنداں میں محصور رہ کر سب کچھ کیسے حاصل کر لیا۔

سرکار عالیہ نے بڑی شفقت اور اصرار سے ہمیں بھوپال چلنے کی ترغیب دی تاکہ وہاں عورتوں اور لڑکیوں کے لئے تہذیبی اور تعلیمی ادارے کھولے جائیں گفتگو کے آخر میں سرکار عالیہ نے فرمایا کہ میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا اور آرزو یہ ہے کہ کسی مستند مورخ اور اہل قلم سے سیرۃ نبوی لکھواؤں، میں نے فوراً عرض کیا کتنا عجیب اور خوشگوار اتفاق ہے یہ — مشہور شاعر اور مورخ شبلی یہیں بمبئی ہی میں موجود ہیں۔ ابھی میں وہیں سے آ رہی ہوں، اور یہی بات انھوں نے بھی کہی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ وسائل مہیا نہ ہو سکنے

مشہور رسالہ الندوہ میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ میری بڑی ہمشیرہ زہرہ بیگم فیضی عربی، فارسی اور اردو کا بڑا ستھرا مذاق رکھتی تھیں۔ والد نے ان کا یہ رجحان طبع دیکھ کر الندوہ ان کے نام جاری کرا دیا جو انھیں بڑی پابندی سے موصول ہوتا رہا۔

۱۹۰۹ء میں یکایک شبلی کا ایک خط میری بہن کے نام آیا جس میں بمبئی آنے کے ارادے اور ہم لوگوں سے ملنے کی تمنا کا اظہار تھا۔ جس دن بمبئی آئے تو پہلی فرصت میں ہم دونوں بہنوں نے ان سے ملاقات کی۔ ہم نے ان کے انداز گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ عورتوں کے بارے میں بہت زیادہ "تنگ نظر اور قدامت پرست ہیں"، ان کے نزدیک اسلام میں عورت کی کوئی خاص منزلت اور حیثیت نہیں تھی۔ اگرچہ وہ بہت بڑے مورخ اور بہت اچھے شاعر تھے لیکن ان کا دماغ صاف نہ تھا۔ وہ وسعت نظر کے ساتھ عورتوں کے مسائل نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے اصحاب فکر اور عام مسلمانوں کا یہی رنگ تھا۔

بمبئی آنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی ٹانگ کا علاج کریں جو بندوق کے ایک حادثہ میں جاتی رہی تھی۔ گھر کے بچے بھری بندوق سے کھیل رہے تھے کہ گولی چل گئی، پاؤں میں لگی اور وہ جھوٹے لنگڑا نے لگا۔

جب ہم شبلی کی قیام گاہ پر پہنچے تو ہمیں ایک کمرہ میں لے جایا گیا جہاں پردہ پڑا ہوا تھا۔ ہم نے محسوس کر لیا ارادہ یہ ہے کہ ہم بند کمرہ میں بیٹھیں اور دور سے بیٹھ کر بات چیت کریں۔ شبلی باہر دروازہ کے سامنے بیٹھے۔ تھے ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ سب اس خیال میں تھے چپ تھے کہ کیا کہیں اور کیونکر شروع کریں۔ یہ عجیب تکلیف دہ صورت تھی جس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی آتی تھی، میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے ختم ہونا چاہئے۔ میں نے پردہ پرے ہٹایا باہر نکلی، اور میں نے کہا۔ اگر آپ ہمارا سامنا نہیں کرنا چاہتے تو ہم بھی چلے جاتے

جب ہماری ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچی، ہم نے انھیں دور ہی سے کونے میں کھڑا دیکھا جواب واپس جا رہے تھے، ان کا ایک ملازم چھوکرا ہمیں گاڑی تک لے گیا۔ آگے آگے شبلی کی گاڑی پیچھے پیچھے ہماری۔ شبلی نے اپنے ایک عزیز کی پرانی قسم کی حویلی میں ہمیں ٹھہرانے کا انتظام کیا تھا۔ وہ چھوکرا ہمیں تنگ و تاریک سیڑھیاں اور کمرے طے کراتا حویلی کی دوسری منزل پر لے گیا۔ جہاں ہم نے کئی خواتین کو زرق، برق نورجہانی لباس میں ملبوس دیکھا بیسویں صدی کی ایک خوب صورت ہاتھی دانت کی پینٹنگ معلوم ہو رہی تھیں ان میں زندگی اور حرکت نہیں تھی، یہ بڑی دل آویز اور خوب صورت عورتیں تھیں لیکن ان کی ہر چیز پر قدامت کی مہر لگی ہوئی تھی۔ خاندانی وقار اور پردہ ان کی ان کے ساتھ تھا۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ ان کا پردہ اتنا سخت ہے کہ سورج کی روشنی بھی کھل کر نہیں دیکھ سکتیں نہ ان کے عزیز ان سے مل سکتے ہیں۔

شبلی نے مجھے لکھنؤ بلوا کر ایک عجیب مخمصہ میں ڈال دیا۔ انھوں نے تمام علماء وفضلا کو اکٹھا کیا۔ انھوں نے قرآن و حدیث کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عورت مرد کی ماتحت ہے اسلئے ہے کہ ایثار و قربانی، ترک دنیا کی زندگی بسر کرے۔ ہم پہلے سے ایک کمرہ میں بٹھائے گئے تھے۔ جب یہ باتیں سنتے سنتے میں عاجز آگئی تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا میں نے سوچا اس صورت حال کا خاتمہ ہونا چاہیئے۔ کمرہ سے باہر نکل کر میں نے کہا — جنت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے یہ قرآن کہتا ہے۔ اور دوزخ باپ کے پاؤں کے نیچے ہے یہ شیطان کہتا ہے —— اور یہ دونوں بڑی سچائیاں لیکن میرے یہ الفاظ بم کا گولہ ثابت ہوئے۔ جب فضا بدلی، تو پھر شبلی اسلام کی باتیں ہونے لگیں۔ میں نے تجویز پیش کی کہ عورتوں کے لئے عربی

کے باعث صرف حسرت کا اظہار کر کے رہ گئے تھے کیا میں انھیں آپ کی خدمت میں لے آؤں ؟ سرکار عالیہ نے بڑی خندہ جبینی اور مسرت کے ساتھ اجازت دے دی، میں بھاگوں بھاگ پہنچی اور شبلی کو پکڑ لائی پھر ذرا بھی دیر نہیں لگی اور سرکار عالیہ کی دستگیری سے فائدہ اٹھا کر شبلی نے کام شروع کر دیا۔ میں نے کتب خانوں سے تمام یورپین مطبوعات اکھٹا کیں —— جو سیرت نبوی سے متعلق تھیں —— اور شبلی کے سامنے لا کر ڈھیر کر دیں، پھر ان کے نوٹ لئے گئے اور باہمی توثیق کے بعد انھیں آخری صورت دے دی۔

شبلی کی یہ عادت تھی کہ وہ مسودہ میں کاٹ چھانٹ بہت کرتے تھے۔ سرکار عالیہ اس سے گھبراتی تھیں ہم بڑی دیر تک بیٹھے رہے اور اسی موضوع پر تبادلۂ افکار کرتے رہے۔ سرکار عالیہ اور شبلی میں بڑی دیر تک بحث و گفتگو ہوتی رہی۔ ان دونوں کی عالمانہ گفتگو آج بھی زندگی کا ایک یادگار واقعہ معلوم ہوتی ہے۔

ہم سرکار عالیہ کے ساتھ بھوپال گئے۔ سرکار عالیہ میری بہن نازلی رفیعہ سلطان بیگم والی جنجیرہ سے اور ان کے کارناموں سے بہت متاثر تھیں ان کا ارشاد یہ تھا کہ میرے یہاں بھی وہی کرو جو تم نے جنجیرہ میں کر دکھایا ہے۔ چنانچہ بڑی سرعت سے بھوپال میں اصلاحات —— انقلابی اصلاحات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تہذیبی، صنعتی اور تعلیمی ادارے عورتوں اور لڑکیوں کے لئے قائم ہونے لگے۔ سرکار عالیہ نے اپنے تخیل کو عملی جامہ پہنا دیا ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک عورتیں معاملات کی سربراہی کی صلاحیت نہیں حاصل کر لیں گی ملک کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔

بھوپال سے ہم لکھنؤ پہنچے۔ مولوی شبلی جنھوں نے ہمیں دعوت دی

سلطان سعود ابنِ عبدالعزیز کا دربار

مغربی پاکستان کی سرزمین کشور کشاؤں، سپہ سالاروں، اور شہنشاہوں کی گذرگاہ رہی ہے، سکندر اعظم سے لے کر ظہیرالدین بابر تک سرحد اور پنجاب میں، اور محمد بن قاسم سے لے کر سر چارلس نیپئر تک بلوچستان اور سندھ میں نہ جانے کتنے فاتح اور سپہ سالار آئے اور چلے گئے، اور جاتے جاتے اپنے نقوش اس طرح مرتسم کرتے گئے کہ زمین کا سینہ چیر کر ان کے نقوش کے باقیات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں، کہیں یہ نقوش گہرے ہیں، کہیں مدہم، کہیں ان میں رفق و ملاطفت کا رنگ نمایاں ہے، کہیں جبر و جور اور زور و قوت کا، کہیں خون کے چھینٹے ہیں، کہیں ابر کرم کی بارش! — کہیں کٹی ہوئی گردنیں ہیں، کہیں جھکے ہوئے سر، کہیں نفرت کی چنگاریاں ہیں، کہیں بغاوت کے شعلے، کہیں احسان و انعام، اور لطف و مدارا کی نسیم جاں فزا! — وہ زمانہ تفاوت و طاقت کا، لیکن وہ دور اب ختم ہو چکا ہے، ملوک و سلاطین اب بھی ہیں، لیکن اپنے حدود میں محدود، وہ دوسرے ممالک میں اب بھی جاتے ہیں، لیکن فوج لے کر نہیں، دوستی محبت اور وداد کا پیام لے کر، لوگ ان کا خیر مقدم کرتے ہیں، سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، ان کی توقیر کرتے ہیں، جوش و خروش کے ساتھ ان کا استقبال کرتے ہیں،

پاکستان میں سلطان سعود ابن عبدالعزیز تشریف لائے، کچھ اس لئے کہ وہ ایک اسلامی ملک کے بادشاہ ہیں، کچھ اس لئے کہ ان کی تاجوری ارض مقدس حجاز سے تعلق

تعلیم کا بندوبست ہونا چاہئے تاکہ وہ اس مقدس زبان میں فاضل اور کامل بن سکیں۔ میری اس رائے سے اتفاق کیا گیا۔

بمبئی پہنچنے کے بعد میں نے صغیرہ اور میمونہ کو لکھنؤ (ندوہ) بھیجنے کا بندوبست کیا۔ شبلی کو جب یہ معلوم ہوا انھوں نے ارجنٹ تار بھیجا "ابھی لڑکیوں کا انتظام نہیں ہوسکا مہربانی کرکے لڑکیوں کی بجائے لڑکے بھیجئے" پھر ہم نے خورشید اور شاکر کو بھیجا، ان دونوں نے دو سال کے اندر عربی زبان میں غیر معمولی مہارت حاصل کرلی۔

شبلی کو ریاست جنجیرہ دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ ایک موقعہ پر جب نواب ممتاز یار الدولہ جنجیرہ میں ایک نسوانی ادارے کا افتتاح کرنے تشریف لائے تھے میری بہن نے شبلی کو بھی مدعو کیا۔ شبلی آئے اور یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے کہ اس ترقی یافتہ ریاست کی ترقی اور محل کے سارے انتظامات کی سربراہی تمام تر عورتوں کی رہین منت ہے، وہ اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے ایک شاندار قصیدہ لکھا جس میں بڑے شاندار الفاظ میں اس کارنامہ پر خراج تحسین پیش کیا۔

(جولائی سنہ ۱۹۵۲ء)

استقبالیہ کا شاندار انتظام کیا، اس موقع پر گورنر جنرل، وزرائے حکومت اور اعیان شہر مدعو کئے گئے تھے، خوش قسمتی سے مجھے بھی اس اجتماع میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، کئی ہائے رنگ رنگ کا جو دل آویز گلدستہ یہاں نظر آیا، وہ کم نظر آتا ہے، ہر مکتب خیال کے لوگ موجود تھے، حزب مخالف کے ترجمان اور داعی مطلق سریش چندر چٹو پادھیا بھی، جماعت اہلحدیث کے روح رواں اور معمار مولانا داؤد غزنوی بھی، بوہرہ فرقہ کے سربرآوردہ اصحاب بھی، خوجہ جماعت خانہ کے ارباب حل و عقد بھی، کراچی کارپوریشن کے میئر محمود ہارون بھی!

کچھ ایسی شخصیتیں بھی تھیں، جنھیں دیکھ کر ذہن ماضی کی وسعتوں اور پہنائیوں میں گم ہو جاتا تھا، یہ مسٹر شعیب قریشی ہیں جو آج سے چوتھائی صدی پیشتر علی برادران کی معیت اور سید سلیمان کی سیادت میں وفد حجاز کے رکن رکین بنکر مسلمانان ہند کی جانب سے موتمر اسلامی میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تھے، اور اپنی حق گوئی حق پسندی، اور حق پژدہی کا سکہ بٹھا کر واپس آئے تھے، وہی بلند و بالا قد، وہی جادو بھری و سحر طراز آنکھیں، وہی دل فریب شخصیت، جو ۱۹۲۵ء کی تصویر میں نظر آتی تھی، آج ۱۹۵۲ء کے پیکر میں بھی نظر آ رہی ہے، ——— یہ مولانا عبدالحامد بدایونی ہیں، ایک عبا پہنے عصا تھامے، عمامہ باندھے! آویزش نجد و حجاز کے زمانہ میں ان کی آتش نوائی، شعلہ مقالی، اور پر جوش و پر خروش خطابت کی دھوم تھی، اگر غور کیجئے تو ان کی باتوں میں اب بھی جھلکیں نظر آئیں گی، ——— یہ مولانا حسن اللہ خاں ہیں جو کبھی انجمن خدام الحرمین کے وفد میں شریک ہو کر حجاز تشریف لے گئے تھے، فرق جو کچھ ہے وہ یہ کہ پہلے ایک دینی مدرسہ میں معلم تھے، اب کاغذ کے ایک تاجر ہیں، پہلے داڑھی رکھتے تھے، اب اس جھنجٹ سے یکسر آزاد ہو چکے ہیں، جتنے خوش پہلے تھے اب اس سے کہیں زیادہ مطمئن ہیں!

رکھتی ہے، استقبال اور خیر مقدم کی تقریبات میں لوگوں کا جوش و خروش قابل دید تھا

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

سلطان کی دریا دلی، سیر چشمی، اور اولوالعزمی بھی نقیب بن کر ساتھ ساتھ چل رہی تھی، وہ جدھر سے گزرے، جہاں پہنچے، جس طرف رخ کیا، پاکستانی عوام کی محبت، عقیدت اور خلوص کا کارواں، اُن کے جلو میں چلتا رہا! ——— ملوک و سلاطین تیر و تفنگ سے کام لے کر، اجسام و اجساد کو فتح کرتے ہیں، لیکن سلطان نے اپنے حُسنِ اخلاق، اپنی اسلامی سادگی، ہمدردی، اور خیر سگالی کے جذبات کا ایسا مظاہرہ کیا کہ دل فتح کر لیے، اور اُس بادشاہ کی عظمت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے جو دیارِ غیر میں قدم رکھے، اور وہاں کے عوام و خواص کے دلوں پر قبضہ کر لے، سلطان نے مہاجرین کی آباد کاری کے لئے اپنی اور اپنے شاہزادوں کی طرف سے پندرہ لاکھ کا عطیہ دیا ویسے بھی یہ رقم بڑی ہے، لیکن اس رقم سے کہیں زیادہ گراں مایہ اور گراں بہا وہ جذبہ ہے جس نے ایک بادشاہ کو اپنا خزانہ لٹانے پر مجبور کر دیا۔

پاکستان میں سلطنت سعودی عربیہ کے سفیر کبیر عزت مآب عبد الحمید الخطیب ہیں، آج سے دو تین سال پہلے حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی مغفور کی معیت میں حکیم نصیر الدین صاحب ندوی کے دولت خانہ پر سرسری طور پر تھوڑی دیر کے لئے نیاز حاصل ہوا تھا، سید صاحب، خطیب کے علم و فضل، وسعتِ نظر، اور وسعتِ معلومات کے بہت قائل تھے، چنانچہ جب کبھی موصوف سے ملاقات کا موقعہ ملتا وہ تفصیل و یکسوئی سے گفتگو میں مصروف ہو جاتے، اُس روز بھی ایسا ہی ہوا، اور میں ایک سامع کی حیثیت سے ان دونوں بزرگوں کی گفتگو سے مستفید ہوتا رہا!

١٠ اپریل کو سعودی عربیہ کے سفارت خانہ نے سلطان کے اعزاز میں ایک

نے پکارا، اور یہ انکار نہ کر سکے، لیکن قسمت کی خوبی دیکھئے جیسے ہی آئے، خواجہ ناظم الدین کی کابینہ برطرف ہوگئی، اور سارا منصوبہ خاک میں مل گیا،

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!

وزارت اور اسپیکری تو الگ رہی اب اسمبلی کے ممبر تک نہیں ہیں،

ملنے نہ کبھی کہ مدہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

لیکن آدمی باحوصلہ ہیں پائپ کے شکنجہ میں سگریٹ کو کس کر ایسے زور کا کش لگاتے ہیں کہ صاف معلوم ہوتا ہے دھوئیں کا مرغولہ بنا کر، ہر پریشانی کو فضا ئے بسیط میں تحلیل کر دینے کی قدرت رکھتے ہیں، ——— یہ یوسف ہارون ہیں، کسی زمانہ میں یوسف وقت ہوں گے، یوسف ثانی اب بھی ہیں، تجارت، وزارت اور سفارت کے لذت آشنا ہیں، ایک سے رشتہ کٹتا ہے دوسرے سے جوڑ لیتے ہیں،

تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

مسلم لیگ کا سربراہ بننے کے لئے آسٹریلیا کی سفارت چھوڑ دی تھی، اب کچھ اور بننے کے لئے مسلم لیگ کو چھوڑنے پر مائل نظر آتے ہیں، خدا نظر بد سے بچائے آدمی دلچسپ ہیں، ——— یہاں ایسے لوگوں کی بھی زیارت ہوئی جو پہلے سب کچھ تھے، اور اب کچھ نہیں ہیں، پہلے جن کے دست قدرت میں ملک و ملت کی تقدیر تھی، اور اب،

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہیں رکاب میں

زمانہ کے انقلابات بڑے بے رحم ہوتے ہیں، ——— یہ خواجہ ناظم الدین ہیں، برطرفی سے ایک منٹ پہلے تک مسلم لیگستان کی کینز تھی، مجلس دستور ساز ان کی پشت پناہ تھی، ساتھی وزرا ان کے مطیع و منقاد تھے، لیکن برطرفی کے ایک

اس مجمع میں کچھ ایسے اصحاب بھی نظر آئے جن کا حال نہ شاندار ماضی بعید اور ماضی قریب سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا،

یہ نواب شمس الحسن خاں ہیں، یوپی مسلم لیگ کے روح رواں، سراپا اخلاص و ایثار یکسر استغنا اور قناعت، نواب والاجاہ صدیق حسن خاں کے پوتے، مفتی الدولہ حسام الملک نواب علی حسن خاں کے فرزند ارجمند، علی گڑھ کے گریجویٹ اور مایۂ ناز سپوت قائداعظم ان کی قدر کرتے تھے راجہ صاحب محمود آباد ان کا دم بھرتے تھے، چودھری خلیق الزماں ان کا مان رکھتے تھے، لیکن جب سے پاکستان بنا ہے اور یہ کراچی تشریف لائے ہیں، قیادت تو کیا شاعری تک ترک کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں،

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

بڑے اچھے اور خوش گو شاعر تھے، بڑے اچھے اور شیریں سخن آدمی اب بھی ہیں —— یہ مسٹر حسین امام ہیں، پہلے سرکاری طور پر آنریبل تھے (ویسے اب بھی ہیں)، بھارت کی کونسل آف اسٹیٹ کے صدر رہے تھے، مسلم لیگ کی مجلس عمل کے رکن رکین تھے، تمام مہمات امور میں قائداعظم کے مشیر اور دمساز تھے، اور اب؟ —— ؟ لاکھوں روپیہ کی جائداد، اور املاک پاکستان پر تصدق کر کے کراچی تشریف لے آئے، لیکن کراچی نے انہیں نہ پہچانا، حالانکہ قیصر جرمنی کی سی کھڑی مونچھیں اب بھی ویسی ہی ہیں، جیسی پہلے تھیں، شخصیت کی سحر طرازی اور دل آویزی میں بھی کوئی فرق نہیں آیا ہے، —— یہ سید میراں محمد شاہ، تبرکی طرح سید ہے اور بے لوث، بلوغ سیاسی کی ساری مدت میں یا صوبہ کے وزیر رہے یا اسمبلی کے اسپیکر، آخر میں سندھ کا کوٹہ پورا کرنے کے لئے اسپین کے سفیر بن کر تشریف لے گئے، لیکن سیاست اور وزارت کے مقابلہ میں سفارت کیا چیز ہے؟ سندھ کی سیاست اور وزارت

کون ہیں؟ ——— یہ ہیں نواب ملک سر خضر حیات ٹوانہ، سابق وزیر اعظم پنجاب، انہی کا قائم کیا ہوا وہ "خضر گلینسی محور" تھا جسے توڑنے کے لئے قائد اعظم نے خواجہ ناظم الدین کو لاہور بھیجا تھا، اور خواجہ صاحب اس وقت تک لاہور سے نہیں گئے جب تک اس محور کو انھوں نے توڑ نہیں دیا، آج دونوں پہلو بہ پہلو موجود ہیں، ——— لیکن پھر بھی ایک دوسرے سے دور ہیں، شاید اتنے ہی دور جتنے پہلے تھے، بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ!

یہاں وہ اصحاب ہم بھی نظر آتے ہیں جن کا ماضی بھی شاندار تھا، حال بھی تابناک ہے، اور مستقبل کی درخشانی بھی جھلک رہی ہے، ——— یہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ہیں، وزیر نہ تھے جب بھی عزت اور محبت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، وزیر ہیں تو بھی، وہ صفات قائم ہیں جو وزارت سے پہلے موجود تھے، (یہ بڑی تعجب خیز اور قابل تعریف بات ہے، کوئی ایسا وقت آیا کہ وزیر نہ رہے تو بھی ان کے اجلال و احترام میں کوئی فرق نہیں آئے گا!

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پُر سوز

جس کے پاس اتنی اچھی پونجی ہو، وہ ہر حالت میں محسود خلائق رہتا ہے، ——— حکیم نصیر الدین ندوی ہیں،

بہ سیرت فرشتہ، بہ صورت صنم

سرو آزاد کی طرح پابند مقام، لیکن چشمۂ شیریں کی طرح فیض رساں، اجمیر، اور بھوپال میں یکتا تھے، کراچی میں بھی یکتائی شباب کی منزلیں طے کر رہی ہے، اور ایک وہ دن بھی آئے گا کہ پاکستان ان کی یکتائی کا گواہ ہوگا، آپ ملنا چاہیں تو مل لیجئے، باہمہ اور بے ہمہ آدمی ہیں، سب کے ساتھ بھی، سب سے الگ بھی، ———

سکنڈ بعد مسلم لیگ نے کہا صدارت کی کرسی خالی کردو، مداحوں اور قصیدہ خوانوں نے ہجو لکھنی شروع کردی، مجلس دستور ساز کی پارلیمنٹری پارٹی نے قیادت کی مسند کھینچ لی، اور دوسرا لیڈر منتخب کر لیا، لیکن یہ " بسطۃ فی العلم والجسم " شخص پیشانی پر شکن لائے بغیر بڑی شرافت اور عالی ظرفی کے ساتھ یہ سارے وار سہ گیا۔

نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش

برسر اقتدار لوگ جب زوال و ادبار سے بہرہ ور ہوتے ہیں تو اُن کے حصہ میں عوام کی طرف سے نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہیں آتا، لیکن خواجہ ناظم الدین کی ذات اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے، ان کی مقبولیت اور عظمت کا دور زوال کے بعد شروع ہوتا ہے، اور یہ بہت بڑی چیز ہے، یہ خداداد نعمت ہے، جس پر خواجہ صاحب کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور وہ ہیں بھی خدا کے شکر گزار بندے، مسکرا رہے ہیں، ہنس رہے ہیں، سیاست نے اب تک ان کا دامن نہیں چھوڑا، لیکن وہ دامن جھٹک کر سیاست سے الگ ہو چکے ہیں، ——— یہ مسٹر فضل الرحمٰن ہیں، جنھیں پاکستان کا " پٹیل " کہا جاتا تھا۔

گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

لیکن ———

بیک گردشِ چرخِ نیلو فری،

حکومت کے ایوان سے نکل کر خانقاہ درویشی میں پہنچ گئے، پہلے لوگ ان سے باتیں کرنے، ان کے حضور میں باریاب ہونے، انھیں اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے بڑے سے بڑے ایثار سے گریز نہیں کرتے تھے، اب کسی کو یہ بھی نہیں معلوم رہتے کہاں ہیں؟ ——— یہ دراز قامتی میں آسمان سے باتیں کرنے والے صاحب جن کا طرہ آسمان سے بھی اونچا نظر آرہا ہے، آپ نے پہچانا

موجودہ دور میں کہاں ملیں گی، ——— یہ ہیں زینل علی رضا صاحب، بمبئی
میں موتیوں کے سب سے بڑے تاجر بھی تھے، اب کراچی میں تشریف فرما ہیں، اور
یہاں بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں، جب سے سلطان سعود تشریف
لائے ہیں، ان کا دولت کدہ، بقعۂ نور بنا ہوا ہے، جب سلطان ادھر سے گزرتے
ہیں تو مطلع انوار بن جاتا ہے ——— !

حاضرین کرام میں سے جن اصحاب کا میں شناسا تھا، ان کا تعارف کرا دیا، اب
سلطان ذی شان تشریف لاتے ہیں، سفارت خانہ کے سامنے والے بر آمدے
میں مطلّا اور مذہب زرکار اور زرنگار کرسیاں بچھی ہیں، فوٹو گرافر اپنے کیمرے لئے
مختلف زاویوں پر سراپا انتظار بنے کھڑے ہیں، مجمع کی چہل پہل اور زیادہ بڑھ
گئی ہے، اشتیاق دید، اور حسرت دیدار میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا ہے، اور اسی
تناسب سے حاضرین کی سیماب دشتی بڑھتی جا رہی ہے، وہ دیکھئے کائی کی طرح
مجمع پھٹا، اور سلطان اپنے ندیموں اور شاہزادوں کے ساتھ دربار کی طرف بڑھتے
آ رہے ہیں، رفتار وقار شاہانہ کی حامل، گفتار جلال خسروی کا نمونہ، ہونٹوں پر
تبسم رقصاں، حاضرین نے انھیں اور انھوں نے حاضرین کو سلام کیا، حاضرین
کے جوش اشتیاق کو دیکھا، مسرت اور انبساط کی کیفیت نمایاں سے نمایاں تر ہو گئی، بیچ
کی کرسی پر سلطان رونق افروز ہوئے، داہنی طرف خواجہ ناظم الدین، بائیں طرف مسٹر
فضل الرحمان، پھر مخدوم الملک سید میراں شاہ، پھر، سر خضر حیات خاں ٹوانہ۔ ایک
عرب ترجمان سلطان کے قدموں کے پاس فرش زمین پر بیٹھا ترجمانی کے فرائض
انجام دے رہا ہے، سلطان مسکرا رہے ہیں، ہنس رہے ہیں، اردگرد اور پیش
پس چند مسلح نجدی سپاہی کھڑے ہیں، طلائی میان میں شمشیر خارا شگاف کمر سے
لٹکائے، اور طلائی غلاف میں خنجر آبدار سینہ سے لگائے، سفیر مملکت سید

جس جائے سراپا پہ نظر جائے ہے اُنکے
آوے ہے یہی جی میں یہیں عمر بسر کر!

——— یہ ایک دوسرے صاحب طرۂ و دستار بزرگ جو نظر آتے ہیں، یہ ہیں مخدوم الملک سید میراں شاہ خدا نے دین اور دُنیا کی تمام نعمتوں سے بیک وقت مالا مال کر دیا ہے، صاحب دل بھی ہیں، اور صاحب مال بھی، بہاولپور کے سب سے بڑے جاگیردار، مسلم لیگ کے خازن، انجمن ترقی اردو کے سرپرست اور پاکستان کے بہت بڑے خانوادۂ تصوف کے "روشن چراغ!" ——— ان کے اور خضر حیات خاں کے طرّے میں بڑا فرق ہے، خضر حیات خاں کا طرہ وہ ہے جس کے بارے میں کہنے والے نے کہا ہے،

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

گویا خضر حیات خاں کا بھرم طرے سے قائم ہے، اور یہاں صورت برعکس ہے یعنی طرّے کا بھرم ان کی ذات سے قائم ہے! ——— یہ حکیم محمد سعید ہیں بہت اچھے طبیب، بہت اچھے متکلم، بہت اچھے انسان، دلّی کی قیامت صغریٰ کے بعد کراچی تشریف لائے جیب اگر خالی نہیں تو بھری ہوئی بھی نہیں تھی، لیکن دل عزم و ہمت سے معمور تھا، بالکل ناسازگار حالات میں ایک نیا ہمدرد دواخانہ کراچی میں قائم کر دیا، جس دواخانہ کا آغاز یوں ہوا تھا کہ کارکنوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ نہ تھی، آج اس کا اسٹاف اتنا زیادہ ہے کہ ۳۵ ہزار ماہوار اس کی تنخواہ پر صرف ہوتا ہے، پاکستان میں ہر سرمایہ دار اس فکر میں ہے کہ اور زیادہ امیر ہو جائے لیکن حکیم صاحب جیب سرمایہ دار ہے تو اپنا سرمایہ قوم کے نام وقف کر دیا، اب ہمدرد دواخانہ انکی ذاتی ملکیت نہیں ہے، ——— ایثار کی ایسی شاندار مثالیں

مٹیا برُج

اودھ کے شاہ ذی جاہ، واجد علی شاہ کو انگریزوں نے، اپنے "مقتضائے طبیعت" سے مجبور ہو کر جب تخت و تاج سے محروم کیا، تو انھیں لکھنؤ سے کلکتہ میں لا کر "پابند" کر دیا، لیکن،

صدر ہر جا کہ نشیند صدر است!

واجد علی شاہ جہاں رہے، واجد علی شاہ بن کر رہے، کلکتہ میں بھی انھوں نے ایک چھوٹا سا لکھنؤ بسا لیا تھا، اور اسی کا نام مٹیا برج رکھا تھا،

ایک مرتبہ، میرا کلکتہ جانا ہوا، تو تڑپتے ہوئے دل، اور روتی ہوئی آنکھوں سے مٹیا برج کی بھی زیارت کی، یہاں ان کے مختصر مگر تاریخی امام باڑہ کو دیکھنے کا بھی موقعہ ملا، امام باڑہ واجد علی شاہی طرز تعمیر کا ایک دلکش نمونہ ہے، صدر دروازہ پر اشعار ذیل کندہ ہیں۔

کی عزا خانے کی جب شاہ اودھ نے بنیاد — مرتبہ ارض مقدس کا ہوا عرش نہاد
بعد تعمیر بجا ایسا کہ جنت کو ہے رشک — فیض ایسا ہے کہ بر آتی ہے مانگو جو مراد
از شب بین سپیدی سے خجل ہوتا ہے — رنگ گلکاری سے شرمندہ ہے روح بہزاد
سے ادب پا منہ اٹھا کہ عجب درگاہ ہست — ملک و حور کا ہر ایک سے ہے یہ ارشاد

عبدالحمید الخطیب مہمانوں کی خاطر داشت، اور مدارت و تواضع میں مصروف ہیں، ہر بُنِ مو سے پسینہ جاری ہے، لیکن عرب میزبان اپنے فرائض سے کبھی اور کسی حالت میں غافل نہیں ہوتا، سلطان کی خدمت میں اب مختلف وفود پیش ہو رہے ہیں، سب سے پہلے بوہرہ جماعت کا وفد پیش ہوا، امیر وفد نے فصیح و بلیغ عربی میں سپاسنامہ پڑھا، سلطان غور و توجہ سے سن رہے ہیں، پھر باری باری سے دوسرے وفود پیش ہوئے، سلطان سب کی سن رہے ہیں، اور جواب شافی سے نواز رہے ہیں سلطان، سلطان ہیں، ایک بڑی مملکت کے فرماں روا، پٹرول کے بحرِ بے کراں کے مالک، خود مختار اور مطلق العنان، جن کے ایک اشارہ پر گردنیں کٹ سکتی ہیں، صاحبِ تاج و دیہیم اور مالکِ تخت و نگین ہیں، لیکن وضع و انداز میں، رفتار و گفتار میں، طرز و اسلوب میں وہ صرف ایک سادہ مزاج، شریف طبیعت اور پاکباز مسلمان نظر آتے ہیں، چہرہ سے جاہ و جلال ہویدا، لیکن وہ اندازِ جہانگیری کہیں نظر نہیں آتا، جسے اپنے ممدوح میں دیکھ کر غالب کہہ اٹھا تھا،

اب فریبِ طغرل و سنجر کھُلا

سلطان کی شہریاری اجسام و اجساد پر بھی ہے، اور قلوب پر بھی، اجسام و اجساد پر سعودی عربیہ میں، اور قلوب و ارواح پر، عالم اسلام میں، کیوں نہ ہو، آخر سلطان کا تعلق کس سرزمین گرامی قدر سے ہے؟ جہاں کی خاک بھی سُرمۂ چشم بینا کا حکم رکھتی ہے، وہاں کا صاحبِ طبل و علم جب نظر آجائے تو دل فرطِ عقیدت و محبت سے بے قرار کیوں نہ ہو جائے؟

میں رکھ لوں ریزۂ مینا کو دل میں
ارے کس پھول کی یہ پنکھڑی ہے

(مئی ۱۹۵۴ء)

موت العالم موت العالم

علامہ سید سلیمان ندوی کی رحلت!

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ شمع تھی، محفل میں پروانہ کی خاک!

علامہ سید سلیمان ندوی کی رحلت ایک شخص کی وفات نہیں، ایک پورے
کا خاتمہ ہے، علامہ کا سانحہ رحلت، صرف اُن کے لختِ جگر، ابوعاصم، سلمان،
یں کا غم نہیں، پوری قوم کا غم ہے، ساری ملتِ اسلامیہ کا غم ہے.

کلکتہ و کابل میں بھی ہے صفِ ماتم
اس غم میں سیہ پوش ہیں بغداد و سمرنا

مان کسی ایک وجود کا نام نہیں تھا، ایک دور کا نام تھا، ——————
جو شاید اب کبھی واپس نہیں آئے گا، وہ دَور جو کبھی فراموش نہ ہو سکے گا،
مان کے مختصر سے جسم میں ایک کائنات آباد تھی، —————— اس کائنات
معقول و منقول کا خزانہ تھا، ملک اور ملت کا دور تھا، اسلامیت اور للّٰہیت
ی تھی، کلامِ الٰہی اور عشقِ رسول کا جنون تھا، اس کی صورت، فرشتوں سے زیادہ

فکر تاریخ تھی اے شاد کہ آئی یہ ندا
لکھ حق شبر و شبیر سے سبطین آباد

امام باڑہ کے ایک بغلی کمرہ میں واجد علی شاہ کی، اور دوسرے میں ان کے صاحبزادہ کی قبر ہے، جس کمرہ میں ان کی قبر ہے اس کے دروازہ پر قطعۂ تاریخ کندہ ہے اسی پتھر پر ایک جھاڑ لٹک رہا ہے، جس سے اشعار اچھی طرح پڑھے نہیں گئے، جو اشعار پڑھے گئے یہ ہیں،

دفن گشتہ بعزا خانۂ سبطین رسول — سرزدہ شور قیامت زفغان وآہے
بادب فاتحہ برخوان و بیا اے زائر — اندریں خاک نہاں ہست شہ ذی جاہے

عرض نمود مصراع دو تاریخ بہار
در خلد است در روضۂ شاہنشاہے
۱۳۰۵ھ ۱۸۸۷ء

المذنب العاصی لطف علی در حالت پریشانی و بے مشقی تحریر نمود
۱۳۰۷ھ

انجام دے گئے کہ اس نے محمد علی کو اس کا نیاز مند بنادیا، وہ وفد خلافت کا سردار بن کر علی برادران، اور شعیب قریشی کے ساتھ حجاز پہنچا، اس کے علم، قابلیت، اور شخصیت کی عظمت نے ابن سعود جیسے شاہ کج کلاہ اور رشید رضا جیسے بلند منزلت عالم کو اس کا متوالا اور فریفتہ کر دیا۔

انگریزی تعلیم، انگریزی سطوت، انگریزی انداز فکر و نظر نے مسلمانوں میں مرعوبیت پیدا کر دی تھی، ان میں احساس کمتری پیدا ہو گیا تھا، وہ اپنی تاریخ کو، اپنے اکابر کو، اپنے ملی کارناموں کو بھول گئے تھے، انھیں یورپ کے مشاہیر سے، یورپ کے علم سے، یورپ کی تاریخ سے عقیدت پیدا ہو گئی تھی، سید سلیمان میدان میں آیا، اس کے پاس نہ حکومت تھی، نہ سرمایہ اس کے شانے پر، چندے کی جھولی تھی، نہ سر پر قیادت کا سہرا، وہ خود اپنے چند بوریہ نشین قلندروں کو لے کر بیٹھ گیا، اس نے وہ کتابیں لکھیں اور اپنی نگرانی میں لکھوائیں، جو تحقیقی معیار سے مستشرقین یورپ کے لئے کتب حوالہ کا کام دیتی ہیں، ان کتابوں نے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کا ذہن بدل دیا، مذاق بدل دیا، انداز فکر بدل دیا، جن میں احساس کمتری تھا، وہ خود شناس ہو گئے جو اغیار سے مرعوب تھے، وہ اپنے وجود پر اپنے ماضی پر، اپنی تاریخ، اپنے ملی کارناموں پر فخر کرنے لگے، ——

مسلمانوں کی نہضت جدیدہ کا سہرا، جس طرح محمد علی کے "کامریڈ" اقبال کے کلام اور ابوالکلام کے "الہلال" کے سر ہے، اسی طرح سید سلیمان کے علمی اور تحقیقی مصنفات کے سر بھی ہے، —— رحمہ اللہ تعالیٰ!

سید سلیمان کو نہ شہرت کی تمنا تھی، نہ دولت کی حرص، اعزاز کی تمنّا تھی، نہ مناصب کی آرزو، لیکن اس کے وقار اور عظمت کا یہ عالم تھا، کہ شہرت ہاتھ باندھ کر پیچھے چلتی تھی، دولت، خانہ زاد کنیز بننے پر فخر محسوس کرتی تھی، اعزاز اس کے دامن

پُر نور، اس کی بیرٹ آب کوثر کی طرح پاک، صاف، شفاف! ـــــــــــ

وہ فارابی، اور ابن سینا، اور افلاطون کا رمز شناس بھی تھا، اور رازی و غزالی کا بھی، وہ ابن عربی، اور مجدد ثانی کا محرم بھی تھا اور خیام و حافظ کا نغز خواں بھی، اس نے کارلائل کو بھی پڑھا تھا، سر ولیم میور کو بھی، اور مارگولیتھ کو بھی، اس کا سینہ علم کا بحر نا پید کنار تھا، اس میں منطق تھی، فلسفہ تھا، کلام تھا، الہیات کی عقدہ کشائیاں تھیں، تصوف کے اسرار و رموز تھے، کلام ربانی کی تفسیریں تھیں حدیث نبوی کی تشریحیں تھیں، فقہ اسلامی کی تعبیریں تھیں، وہ جامع علوم تھا، عربی ادب پر، ایسا عبور تھا کہ اہل زبان عرب، اس عجمی کے نطق و کلام پر رشک کرتے تھے۔ صرف و نحو میں اسے وہ ملکہ تھا کہ فراء، سیبویہ، اور زمخشری زندہ ہوتے تو اس کا لوہا مانتے، وہ فصاحت و بلاغت کے نکات سمجھنے اور سمجھانے میں برتتے ہیں، اور استعمال کرنے میں عبدالقادر جرجانی اور بدیع الزماں ہمدانی تھا، علم اسماء الرجال پر اس کی اتنی گہری اور وسیع نظر تھی کہ اس کی جرح و تعدیل ایک امام فن کی جرح و تعدیل بن گئی تھی، واقدی کے چہرہ سے نقاب اسی نے اٹھایا، وہ اتنا بڑا مورخ تھا کہ اگر کسی زندہ قوم کا فرد ہوتا تو صرف ارض القرآن لکھ کر اس نے اپنا گھر سیم و زر کے سکوں سے بھر لیا ہوتا، اور شہرت دوام کا تاج سر پر رکھ لیا ہوتا، اس نے "عرب و ہند کے تعلقات" اور "عربوں کی جہازرانی" لکھ کر تاریخ کے ایسے گوشے بے نقاب کیے کہ بین الاقوامی شہرت کے مورخین ادب و احترام کے ساتھ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے، اس نے سیرت النبی لکھی اور اس تحقیق و تفصیل سے لکھی کہ اردو زبان کا سر عربی کے مقابلہ میں اونچا ہو گیا، محمد علی اور سید حسین کے ساتھ وہ وفد خلافت کا ممبر بن کر لندن، پیرس، اور روم پہنچا، اس حسن و خوبی سے اسلام کی ترجمانی کے فرائض

لیکن سید سلیمان نے اپنے، یا اپنے ادارہ دار المصنفین کے لئے کسی سے کبھی ایک حبہ نہیں قبول کیا!

سید سلیمان کی وفات پر اطراف و اکناف عالم سے تعزیت کے پیامات آرہے ہیں، کون آنکھ ہے جو اس غم میں اشکبار نہ ہو؟ کون دل ہے جو اس عظیم خسارۂ ملی پر ملول و افسردہ نہ ہو، لیکن یہ حادثہ میرے لئے ذاتی حادثہ بھی ہے، بچپن کا نقش بڑا گہرا ہوتا ہے، مٹائے نہیں مٹتا، مجھے ان کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرنے کی، کبھی کبھی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی!

——— وہ ندوہ کے رکن رکین تھے معتمد تعلیمات تھے، روح رواں تھے ان میں اور ندوہ میں وہی رشتہ تھا، جو روح اور جسم میں ہوتا ہے، میں نے ان کا جلال بھی دیکھا، اور جمال بھی، احتساب بھی، اور عفو و مرحمت بھی، خفگی بھی، اور مسرت بھی تادیب بھی، اور لطف بے نہایت بھی، ایک حاکم کی حیثیت سے بھی، ایک استاد کی حیثیت سے بھی، ایک باپ کی حیثیت سے بھی، ہر رنگ میں، ہر روپ میں!!

میری ان کے سامنے جتنی پیشیاں ہوئیں، وہ بھی مختلف تھیں، ایک شریر لڑکے کی حیثیت سے، ایک باغی اور سرکش کی حیثیت سے، ایک دوسروں کو نہ پڑھنے دینے والا، دوسروں کے امن و سکون میں خلل ڈالنے والا، کھیل کے وقت میں پڑھنے والا، اور پڑھنے کے وقت میں کھیلنے والا، کھانے کے وقت غیر حاضر رہنے والا، اور دسترخوان اٹھ جانے کے بعد کھانے کا مطالبہ کرنے والا، بیماری میں بدپرہیزی کرنے والا، اور تنومندی کے عالم میں پرہیزی کا اصرار کرنے والا، میچ، مشاعروں اور جلسوں میں بڑھ بڑھ کر حصہ لینے والا، اور ان کے تعلیمی معائنہ کے وقت درجہ سے غائب ہو جانے والا، حاضری پوری نہ ہونے کے باوجود امتحان میں بیٹھنے والا، اور امتحان ہال میں بیٹھ کر پان کھانے والا

سے وابستہ ہو کر کچھ اور اونچا ہو جاتا تھا، مناصب کی تمنا تھی کہ اس کے ساتھ رہیں،
اور کبھی جدا نہ ہوں، نظام نے اسے حیدر آباد کھینچنا چاہا، فرماں روائے بھوپال
نے اسے اپنی دستار فخر و امتیاز کا طرہ بنانا چاہا، مسلم یونیورسٹی کی آغوش اس کے
لئے کشادہ رہی، دوست اور دشمن، حامی اور مخالف، حکومت کے وفادار اور باغی
سب اس کی بارگاہ میں سر جھکا کر آتے تھے، وفد یورپ کی ممبری محمد علی نے زبردستی
پیش کی، وفد حجاز کی سرداری حکیم اجمل خاں نے باصرار سپرد کی، مسلم یونیورسٹی کورٹ
کی رکنیت پر سر ضیاء الدین، سر شاہ سلیمان، سر راس مسعود، اور نواب اسماعیل خاں
ہمیشہ باصرار و التجا اسے فائز کرتے رہے، جمعیۃ علمائے ہند، اور مجلس خلافت
کے خصوصی جلسہ سالانہ کی صدارت، اسے منت اور تمنا کے ساتھ پیش کی گئی،
——— اس لئے کہ سب اس پر متفق تھے، کہ وہ بے لوث ہے، ———
بے غرض ہے، سازش اور جماعتی تعصب سے اس کا دامن پاک ہے، ———
یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی جھجک کر اس سے ملتے تھے، موتی لال، اور جواہر لال
بھی اعظم گڑھ میں صرف اسی کے مہمان ہوتے تھے، ابوالکلام آزاد، باہمہ پندار و
انانیت، اس کے ساتھ ایک قلب و تن ہو کر کام کرنے کو تیار رہتے تھے، محمد علی تو
علی، باہمہ جلالت شان و مرتبت اس کا احترام کرنے پر اپنے تئیں مجبور پاتے
تھے، ذاکر حسین اور ضیاء الدین اس کے یکساں عقیدت مند اور مداح تھے، اپنی
اہم علمی تحقیقات میں اس کے مشورہ بغیر قدم نہیں اٹھاتے تھے، نادر شاہ نے ضرورت
محسوس کی کہ راس مسعود اور اقبال کے ساتھ اسے بھی کابل بلائیں، اور افغانستان
کے تعلیمی معاملات میں اس کی رہنمائی سے فائدہ اٹھائیں، سر عبداللہ ہارون، مرحوم
جمال دہ مداس، اور دوسرے چوٹی کے سرمایہ دار تمنا کرتے تھے کہ سید سلیمان
کسی کار خیر کی طرف رہنمائی کریں، اور بے دریغ اس مد پر روپیہ صرف کریں

…ی جاری رہتا تھا، جلسوں سے ظاہر ہے، ندوہ کے ارباب حل و عقد خوش نہیں ہوتے تھے، لیکن مجھے ایک فخر یہ بھی ہے کہ ان جلسوں کی صدارت کے لئے، میں نے، سید صاحب، مولانا مسعود علی ندوی، اور مولانا عبدالماجد دریابادی کو آمادہ کیا، جلسے ہوئے، دھوم دھام سے ہوئے، تقریریں ہوئیں تجویزیں پاس ہوئیں، نعرے لگے، پروگرام بنے، یہ سب کچھ ندوہ ہی میں ہوا، — اُسی ندوہ میں جہاں سے میں نکالا گیا تھا، — ندوہ کے …تظمین نے مجھے نکال دیا تھا، لیکن سید صاحب کے دل میں، میں موجود تھا، پھر مجھے کیا پرواہ ہوسکتی تھی کون مخالف ہے کون دشمن ؟ ——
لیکن یہ ذاتی کہانی بڑی لمبی ہوجائے گی !

جامعہ کے بعد سے، زندگی مختلف ادوار سے گزری، اس تمام عرصہ میں سید صاحب کا دیدار ہوتا رہا، شرف نیاز و ملاقات حاصل ہوتا رہا، خط و کتابت بھی جاری رہی، یہاں تک کہ ہندوستان تقسیم ہوا، اور میں بمبئی سے کراچی آ گیا …کچھ عرصہ بعد سید صاحب بھی یہاں تشریف لے آئے مجھے خوشی تھی کہ یہاں اکثر ملاقات کی سعادت حاصل ہوتی رہے گی، لیکن مکروہات دنیا کے باعث …یہ تمنا بہت کم پوری ہوئی، جب کہیں وہ مل جاتے ضرور شکوہ کرتے، میں حضور …سے حاضری کا وعدہ کر لیتا، حاضری بھی دیتا، اور اس کے بعد پھر یہ …ارادہ آج اور کل پر ٹلتا رہتا، کچھ عرصہ ہوا ندوہ کے مہتمم مولانا عمران خاں آئے …ان کا قیام میرے دفتر کے قریب ہی تھا، اکثر ملاقات ہوتی رہتی، وہ بالالتزام سید صاحب کی خدمت میں حاضری دیتے تھے، ایک مرتبہ خاں صاحب کے ذریعہ مجھے یاد فرمایا، ہم دونوں ساتھ ساتھ گئے، ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد، خاں صاحب سے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا، "ان سے ملاقات ہوتی

——— یہ اور اس طرح کے بیسیوں جرائم تھے، جن میں ماخوذ ہو کر، اُن کے سامنے پیش ہوا، پیش کرنے والے ہر پیشی پر یہ سمجھتے تھے کہ اب ہمیشہ کے لئے پروانۂ اخراج صادر ہوا، لیکن مجرم بن کر گیا، اور فاتح بن کر واپس آیا، شروع میں کچھ مدت تک تو میری نالائقی سے وہ ذرا خفا سے رہے، لیکن کچھ عرصہ بعد، طلبہ کے جلسہ میں میری ایک پُرجوش تقریر، اور ایک طالب علمانہ مضمون سے وہ خوش ہوئے، یہ لطف و کرم کا سلسلہ پھر دراز ہی ہوتا گیا! ———

یہاں تک کہ واقعی ایک روز ندوہ سے اخراج کی نوبت آگئی! ———

اسٹرائک ہوئی، ندوہ کے سکریٹری نواب علی حسن خاں مرحوم تھے، سید صاحب اعظم گڑھ میں تھے، یہ اسٹرائک اتنی بڑھی کہ نواب صاحب نے مہتمم صاحب کے مشورہ سے میرا نام خارج کر دیا، سید صاحب اعظم گڑھ سے تشریف لائے انھوں نے میرے داخلہ کا حکم دے دیا، اور واپس چلے گئے، معتمد تعلیمات کا حکم، ناظم بھی نہیں ٹال سکتا تھا، لیکن یہ حکم ان کے جاتے ہی مسترد کر دیا گیا چند روز بعد سید صاحب پھر تشریف لائے، انھیں صورت حال کا علم ہوا میں اس حکم سے ذرا بھی ملول و افسردہ نہیں تھا، لیکن سید صاحب کا ملال چہرہ سے نمایاں تھا، اس سلسلہ میں نہ صرف ناظم صاحب سے، بلکہ بعض قریبی دوستو سے بھی سید صاحب رنجیدہ ہو گئے، یہ تلخی کافی عرصہ بعد رفع ہوئی، مجھے اس پر فخر ہے کہ یہ تلخی میری وجہ سے پیدا ہوئی، سید صاحب نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے نام ایک پُر اثر خط لکھا، اور میں جامعہ ملیہ چلا گیا! ———

لیکن سید صاحب کی شفقت نہ صرف یہ کہ کم نہیں ہوئی، اور بڑھتی ہی گئی، جامعہ میں رہ کر، میں ندوہ میں بعض دوستوں کا قافلہ لے کر ہر دسمبر میں پہنچ تھا، اور طلبائے قدیم کا جلسہ دھوم دھام سے کرتا، جس کا سلسلہ کئی

جکرائے، میں نے ان کی کیفیت بھانپ لی، میں نے بڑے داعیہ سے کہا، "ہم جو کام بھی کریں، سید صاحب کو اس کا سرپرست بننا پڑے گا، ہم اعلان کر دیں گے سید صاحب ہمارے ادارہ کے سرپرست ہیں، سید صاحب اس کی تردید نہیں فرما سکتے!" ——— گستاخانہ الفاظ تھے، لیکن نکل گئے منہ سے سید صاحب کا تبسم ہلکے سے قہقہہ سے بدل گیا، گویا وہ فرما رہے تھے، تو ٹھیک کہتا ہے!

——— اور ایک روز کانوں نے یہ جگر خراش خبر سنی کہ سید صاحب نے رحلت فرمائی، دل دھک سے ہو گیا، یہ نعمت اس قدر جلد چھن جائے گی، اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا، سید صاحب کے گھر پر جانے کی ہمت نہ پڑی، ابوعاصم اور سلمان کا رونا میں نہیں دیکھ سکتا تھا، قیام گاہ پر نہیں گیا۔ نوٹاؤن کی مسجد میں نماز جنازہ پڑھی، نماز کے بعد، سید صاحب کے جسد خاکی کا نظارہ کیا، وہی اطمینان وہی ہلکا سا تبسم وہی وقار، وہی سادگی، بس یہ معلوم ہوتا تھا، ابھی سوئے ہیں اب اٹھیں گے، سر پر صافہ رکھیں گے، پھر باتیں کرنے لگیں گے ———

لیکن آہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، چہرے پر نور کی بارش ہو رہی تھی یہ چہرہ پُرنور ہمیشہ سے تھا، لیکن آج مطلع انوار تھا! ——— جنازہ قبر کی طرف لے جایا جانے لگا، میں نے بھی ساتھ جانا چاہا، آنسو تھے کہ امڈے آرہے تھے، میں آج تک کسی عزیز اور بزرگ کی وفات پر، سخت ترین صدمہ کے باوجود، آنسو اور آواز سے نہیں رویا تھا، لیکن نہ آنسو رکتے تھے، نہ گریۂ بے اختیار، دانتوں سے ہونٹ دبانا، ہاتھوں سے آنسو پونچھتا، دفتر آگیا، اور یہاں آکر جی بھر کے رویا! ——— آہ!

تھا خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا،
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور!

(دسمبر ۱۹۵۳ء)

رہتی ہے !" انھوں نے کہا، اکبرؔ !" میری طرف دیکھا، اور فرمایا "مجھ سے زیادہ یہ خوش قسمت ہیں !" ان الفاظ میں، اور اس لہجہ میں شفقت کا ایک بحرِ بیکراں لہریں مار رہا تھا، ایک مرتبہ، اپنے عزیز دوست، اور بچپن کے ساتھی حکیم نصیر الدین کے ساتھ حاضر ہوا، محبت بھری باتیں کرتے رہے، پھر ہم دونوں کو مخاطب کرکے فرمایا ——— "آپ دونوں میں اتنی گہری دوستی کی وجہ آج سمجھ میں آئی !" حکیم صاحب بھی شرمندہ ہوگئے، میں بھی جھینپ گیا، ——— ہم دونوں بالکل تازہ کلین شیوڈ تھے ! ٹنڈو آدم میں دو سال ہوئے، حکیم عبداللہ ندوی نے ایک جلسہ کیا، جس کی غرض وغایت یہ تھی کہ ندوہ کے طرز پر ایک درس گاہ کی بنا ڈالی جائے، نام کا سوال اٹھا، میں بضد تھا، نام کا جز ندوہ ضرور ہونا چاہیے، بعض اصحاب مشیخت اس کے خلاف تھے، اور اپنی رائے پر اڑے ہوئے تھے، سید صاحب نے ایک دلآویز تبسم کے ساتھ "ندوۃ العلوم" کا فیصلہ کردیا، ——— کتنا پاس خاطر تھا، سید صاحب کو اپنے خادمان خاص کا ! ——— میں نے "ریاض" نکالا، سید صاحب سے درخواست کی کہ پہلے نمبر کے لئے ڈھاکہ یونیورسٹی والا خطبہ مرحمت فرمائیں، بڑی دیر تک کاغذات میں تلاش کرتے رہے، میں نے کہا بھی رہنے دیجئے پھر حاضر ہوجاؤں گا، مگر تلاش جاری رہی، آخر برادرم ابوعاصم نے اسے ڈھونڈ نکالا، میں خوش خوش لے کر آگیا، اور اسے تبرک سمجھ کر شائع کردیا۔

چند مہینے کا واقعہ ہے، ایک دوست نے، ایک ادارۂ تصنیف قائم کرنے کا فیصلہ کیا، مجھے بھی شرکت عمل کی دعوت دی، میں راضی ہوگیا، وہ سید صاحب کو اس کا سرپرست بنانا چاہتے تھے، لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی، کہ خود جا کر عرض کریں ایک دن مجھے لے کر پہنچے، وہاں انھوں نے اپنا عندیہ ظاہر کیا، معلوم ہوا، اس طرح کا ادارہ خود سید صاحب قائم کرنے پر غور کر رہے ہیں، وہ دوست بہت

ناموافق حالات کا انھوں نے مردانہ وار مقابلہ کیا، اور اپنا کام جاری رکھا
کے انتقال کے وقت بھائی صاحب انگریزی مدرسہ میں پڑھ رہے تھے
گھر چراہی تعلیم و تدریس کی پابندیوں سے آزاد تھا، پھر بھی گھر پر ایک حافظ جی
رکھے گئے۔ انھوں نے قرآن شریف سے تعلیم کا آغاز کیا، والدہ کی نیت یہ تھی
ایک بیٹا انگریزی پڑھے اور دوسرا عربی، کچھ عرصہ بعد والدہ اپنے والد سید
احمد صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس بھوپال چلی گئیں، وہاں پھر ایک
حافظ صاحب تلاش کئے گئے، بھوپال کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ چند ماہ کے

بعد ہمارا قافلہ وطن واپس پہنچا، اور از سر نو حافظ کی تلاش شروع ہوئی کوئی
معقول آدمی نہ ملا تو غم جدائی برداشت کر کے لکھنؤ مدرسہ فرقانیہ میں بھیج دیا۔
دن وہاں گذرے، لیکن بھائی صاحب مچل گئے، "معارف" بڑے بابا (حضرت یاض)
کے پاس آتا تھا، معارف پڑھتے پڑھتے وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے بڑے قائل اور
معترف ہو گئے تھے، ہر وقت ان کا ذکر کرتے، اور والدہ سے اصرار کرتے کہ مجھے
ندوہ میں داخل کر دیا جائے یہ ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے، میری عمر اس وقت ۱۰-۱۱ سال تھی
ندوہ میں داخل ہوتے وقت میرے دل میں دبا ہوا شوق یہ بھی تھا کہ مولانا سید
سلیمان ندوی کو دیکھوں گا — لیکن وہ وہاں کہیں نظر نہ آئے — اب میں
ذہن میں ان کی تصویر تصور کے موقلم سے بنانے لگا، ممکن ہے وہ سیتاپور
کے حافظ کلو کی طرح نابینا اور سیاہ رو ہوں، ممکن ہے وہ خیرآباد کے مولوی حفیظ الدین
کی لمبی داڑھی والے اور دراز قد ہوں، ممکن ہے وہ مدرسہ فرقانیہ کے حافظ معصوم
کی طرح بڑی بڑی آنکھوں والے اور ہر وقت ہنسنے والے ہوں — لیکن
یہ کیوں نہیں آتے؟ کب آئیں گے؟ ان میں اور ندوہ میں اتنا بُعد کیوں
بھائی صاحب تو کہا کرتے تھے۔ ندوہ انہیں کی ذات سے قائم ہے، —

سیّد صاحب

نقوش و تاثرات

مجھے اپنے والد کی صورت یاد نہیں، لیکن ان کا سانحۂ وفات خوب [illegible]
ہے، گھر میں کہرام مچا ہوا تھا، میں حیران و پریشان اِدھر اُدھر دیکھ رہا [illegible]
اتنے میں شبر تیا آئی، یہ ہمارے گھر کی پروردہ تھی اگرچہ عجیب الخلقت [illegible]
نوجوان مردوں کی طرح مسیں بھری ہوئی تھیں، اور سبزہ آغاز بھی تھی، لیکن [illegible]
اس سے مانوس بہت تھا - وہ خود بھی رو رہی تھی - بار بار اپنے دوپٹے [illegible]
پونچھتی تھی، اس نے میری انگلی پکڑلی اور پڑوس کے ایک گھر میں لے گئی [illegible]
کے بچوں نے مجھے گھیر لیا - اور میں گھر کا سانحۂ عظیم بھول کر ان کے ساتھ [illegible]
لگ گیا، خدا نے ماں ایسی دی تھی - جس نے پورے طور پر باپ کی [illegible]
کا فرض ادا کیا، والدہ نے میری اور میرے بھائی سید عقیل احمد [illegible]
کی، جس استقلال و عزیمت کے ساتھ تربیت کی، اس کی مثال کم [illegible]

ہونٹ، آواز نہ پست نہ بلند، لیکن اس میں ایک خاص قسم کا وقار، ہونٹ تبسم سے آشنا، زبان جواب دینے میں مصروف باتیں کرنے والے طالب علموں میں ہر شخص بے تکلف بھی، اور مؤدب بھی!

مجھے اشتیاق پیدا ہوا یہ کون بزرگ ہیں؟ ایک سے پوچھا، دوسرے سے پوچھا، لیکن کوئی جواب نہیں دیتا اور وہ قافلہ کے ساتھ ساتھ چلنے میں ہمہ تن منہمک، چند قدم کا فاصلہ تھا - ذرا دیر میں ڈائننگ ہال پہنچ گئے، یہاں پہنچ کر معلوم ہوا یہ ہیں مولانا سید سلیمان ندوی، —— آہا یہ ہیں؟ اب کیا تھا بھیڑ چیرتا پھاڑتا میں بھی پہنچ گیا، لیکن ہر طرف سے دھکے دے کر نکالا گیا —— کوفت ضرور ہوئی لیکن کوفت پر مسرت غالب تھی، مولانا سید سلیمان کو دیکھ لیا، گھر پہنچوں کا تو سب سے پہلے بھائی صاحب کو "آنکھوں دیکھا حال" سناؤں گا!

اب سید صاحب بار بار ندوہ آنے لگے، اور انھیں دیکھ دیکھ کر جی خوش ہونے لگا۔ لیکن یہ فصل بہار جلد ہی ختم ہوگئی، جلد ہی یہ اندازہ ہوگیا - چھوٹے لڑکوں کے ساتھ سید صاحب درشت مزاج بھی ہیں، اور سخت گیر ممتحن بھی، ذرا سی غلطی پر رکھائی سے ٹوکتے ہیں اور (ایک مرتبہ نہیں) ہر ملاقات میں اگلا پچھلا سبق ضرور پوچھتے ہیں، یہاں یہ کیفیت کہ سالانہ امتحان وبال جان بنا ہوا تھا، یہ بار بار امتحان دینے پر کون تیار ہوتا؟ نتیجہ یہ ہو کہ سید صاحب سے جی کھٹا ہو گیا، طبیعت رکنے لگی - اب وہ آتے تو خوش نہ ہوتی، طبیعت منغص ہو جاتی —— نہ جانے کس غلطی پر ٹوک بیٹھیں، نہ جانے کیا سوال کر ڈالیں؟

یہ کیفیت میری ہی نہیں کئی بڑے طالب علم بھی اس مرض میں مبتلا تھے مثلاً سید سعید اشرف صاحب ندوی کا شمار طلبائے کبار میں ہوتا تھا، عربی ادب پر

یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

—— دن گذرتے گئے یہاں تک کہ تعلیم کا پہلا سال ختم ہوگیا، رفتہ رفتہ سید صاحب کو دیکھنے کا اشتیاق بھی، مرورِ ایام کی نذر ہوگیا —— البتہ کبھی کبھی ایک بات دل کو ضرور پریشان کرتی تھی، بھائی صاحب ضرور دریافت کریں گے، تم نے سید صاحب کو دیکھا؟ پھر کیا جواب دوں گا؟ لیکن دنوں کے گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ کھٹک بھی ختم ہوگئی!

ندوہ کا دوسرا تعلیمی سال شروع ہوا، بورڈنگ ہاؤس میں صبح ۹ بجے کھانا ملتا تھا اور شام کو مغرب کے فوراً بعد کبھی کچھ دیر ہوجاتی کھانا پکنے میں۔ تو یہ وقت دریائے گومتی کے کنارے کھیل کود اور بات چیت میں صرف ہوتا، گومتی اور ندوہ میں صرف ایک سڑک حائل ہے۔

ایک روز کھانے میں کچھ دیر تھی، اور لڑکے مختلف ٹولیاں بنائے ہوئے ادھر اُدھر مٹرگشت کر رہے تھے۔ ندوہ میں حفظ مراتب اور چھوٹے بڑے کا بہت خیال رہتا تھا، ایک چھوٹا لڑکا ایک بڑے لڑکے کا اتنا ہی احترام کرتا تھا جتنا ایک چھوٹا بھائی بڑے بھائی کا کر سکتا ہے، چنانچہ جب ٹولیاں بنتی تھیں چھوٹوں بڑوں میں حدفاصل قائم رہتی تھی، تھوڑی دیر میں دیکھتا کیا ہوں۔ ایک بڑے طالب علم عبدالسلام صاحب صفا کے ساتھ ایک وجیہ اور خوش شمائل مولانا ڈائننگ۔ ہال کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بہت سے بڑے لڑکے ادب اور تمیز سے پیچھے چل رہے ہیں، ان صاحب کی وضع ندوہ کے عام اساتذہ سے بالکل مختلف تھی۔ سر پر سفید براق عمامہ، سیاہ داڑھی، شیروانی کے تمام بٹن گلے تک لگے ہوئے، ہاتھ میں ایک چھڑی، چہرہ دلآویز، سحر انگیز آنکھیں، پتلے پتلے

لیکن جان بچی کہاں، وہ جا چکی تھی، بہت دیر کے بعد، بلکہ دنوں کے بعد واپس آئی!۔

شروع میں جتنا حسن ظن میرے دل میں سید صاحب کا تھا وہ اب دہشت وخوف میں تبدیل ہوگیا، ڈرانے کے لئے، مولانا محمد سلیم، مولانا کلیم احمد اور مولانا شبلی فقیہ کیا کم تھے کہ ایک اور ہستی نمودار ہوگئی، جس سے ڈرنا من جملۂ واجبات بن گیا! —

— مجھے اگر فطرت کی طرف سے کچھ ذہانت عطا ہوئی تھی تو وہ صرف اس کام میں صرف ہونے لگی کہ میری اور سید صاحب کی بورڈنگ کے کمرہ یا تعلیم کے درجے میں مڈبھیڑ نہ ہونے پائے، اور جہاں تک مجھے یاد ہے، میں اس مقصد جلیل میں پوری طرح کامیاب رہا، یعنی کبھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ میں ان کی زد پر آگیا ہوں، انھوں نے مجھے ٹوکا ہو، یا میرا امتحان لیا ہو، لیکن بکری کی ماں کب تک خیر منا سکتی تھی، کئی سال بعد ایک روز آمنا سامنا ہو ہی گیا، میں غالباً درجہ چہارم میں پڑھتا تھا، ایک روز دفعتہً سید صاحب تشریف لے آئے، اور بجائے اس کے کہ حسب معمول امتحان لیں، دریافت فرمایا،

اس درجہ میں رئیس احمد کون لڑکا پڑھتا ہے؟

اس اعزاز پر سب کی نظریں میری طرف اٹھ گئیں، —— اور اس ابتلا پر میری نظریں جھک گئیں، —— اب کیا ہوگا؟ میں اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہا۔ سید صاحب میرے قریب ہی کھڑے تھے، اور زیادہ قریب آگئے، فرمایا،

"ماجد میاں[1] تمہاری ذہانت اور سلامت روی کی تعریف کرتے ہیں۔ تم مجھ سے کیوں نہیں ملتے؟"

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی! —— مولانا سے میرے لگاؤ اور تعلق کا واقعہ بجائے خود ایک داستان ہے جس کا یہ موقع نہیں،

طالب علمی ہی کے زمانے میں اچھا درک حاصل کر لیا، برجستہ عربی تقریر اور فی البدیہہ عربی تحریر کے لئے اکثر اساتذہ کی طرف سے وہ دوسرے معزز مہمانوں کے سامنے پیش کئے جاتے سید صاحب ان کی خاصی قدر کرتے تھے، لیکن یہ

نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

کی مصیبت میں گرفتار رہتے، نمایاں اور ممتاز طالب علم تھے، لہٰذا کبری بن کر پتوں کی آڑ میں نہیں چھپ سکتے تھے، اتفاق کی بات سالانہ امتحان میں ہر مضمون میں اچھے نمبر حاصل کئے۔ لیکن فلسفہ کے مضمون میں چند نمبروں سے فیل ہو گئے مہتمم صاحب کی سفارش پر معتمد تعلیمات یعنی سید صاحب نے ترقی دے دی۔ ترقی حاصل کرنے کے بعد پہلی مرتبہ سعید اشرف صاحب سید صاحب کے سامنے آئے، سید صاحب نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"کہیئے امتحان میں پاس ہو گئے آپ؟ —— بڑا چبھتا ہوا سوال تھا! کسی اور نے یہ سوال کیا ہوتا تو شاید سعید اشرف صاحب، علی الاعلان اپنے "پاس" ہونے کا اقرار کر لیتے، لیکن یہ سوال وہ کر رہا تھا جس نے ترقی دی تھی سعید اشرف صاحب سٹ پٹا گئے، بے ساختہ فرمایا۔

"جی میں مشرقی ہوں ——!"

سید صاحب نے فوراً ٹوکا،

"مشرقی" کس کو کہتے ہیں؟ —— ذرا اس لفظ کی تشریح تو کیجئے!"

اگر کسی جلسۂ عام میں سعید اشرف صاحب کے فیل ہونے کا بہ بانگ دہل اعلان کیا جاتا تو بھی ان کی شاید یہ حالت نہ ہوتی، جو اس وقت نظر آ رہی تھی! جواب دیا وہ بھی غلط! —— اور حالت یہ کہ زبان لڑکھڑا رہی تھی، پاؤں کانپ رہے تھے، اتنے میں کاشغری صاحب آ گئے، اور سعید صاحب کی جان بچی! ——

کام چلالیتے، آج میری باری تھی، وہ میرے پاس تشریف فرما تھے، میں ابھی ایک جملہ بھی نہیں لکھ پایا تھا کہ اختر نے ٹھوکا لگایا اور رازدارانہ انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا،

"چھری کی عربی کیا ہے"؟

میں نے کہا،

"سکین" ——— لیکن اب نہ پوچھنا، خود میری جان پر بنی ہوئی ہے اور اگر کہیں باتیں کرتے سید صاحب نے دیکھ لیا تو اور غضب ہو جائے گا،! ——— لیکن اختر ایسی باتیں سننے کے عادی نہیں تھے، جو مطلب کی نہ ہوں، تھوڑی دیر میں پھر انھوں نے ٹھوکا لگایا، اور پوچھا،

میز کی عربی کیا ہے؟

میں نے کہا "الغندرنہ"

انھوں نے لکھ لیا ——— پھر دریافت کیا،

"ہیٹ کو کیا کہتے ہیں"؟

میں نے جواب دیا، "المخاطیس"

یہ بھی جلدی سے لکھ لیا، شاید وہ ایک ہی دفعہ میں سب الفاظ لکھ لینا چاہتے تھے پھر فوراً سوال ہوا،

"اور دیا سلائی"؟

"میں نے پورے اطمینان کے ساتھ بتایا" الحمراءؔ"

یہ بھی نوٹ کر لیا، اب ایک ہی لفظ رہ گیا تھا، پوچھا،

"لوٹا! ——— لوٹے کو کیا کہتے ہیں"؟

میں نے محبّت بھری نظروں سے انھیں دیکھ کر کہا،

میں نے عرض کیا،

"اب حاضر ہوا کروں؟"

بات ختم ہوگئی سید صاحب تشریف لے گئے، اور میں سوچنے لگا، یہ تو بڑی مشکل ہوئی، ماجد میاں اور سید صاحب میں زمین آسمان کا فرق ہے، وہ شگفتہ روی سے ملتے ہیں، ہنستے ہیں ہنساتے ہیں، امتحان کبھی نہیں لیتے، صرف ایک مرتبہ امتحان لیا تھا، اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ پڑھ کر يَعْمَهُونَ کے معنی پوچھے تھے، لیکن میری گھبراہٹ دیکھ کر خود ہی جواب دیدیا اور پھر کبھی اس طرح کی بات نہیں کی، اپنے ساتھ تانگہ میں بٹھا کر زنگی محل لے جاتے ہیں کبھی النا ظر بک ایجنسی، راستہ بھر اچھے اچھے اشعار سناتے ہیں، مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں، ان سے تو نبھ رہی ہے، لیکن یہ؟ —— یہ ضرور کسی لفظ کی تعلیل، کوئی گردان، کسی جملہ کی ترکیب، کسی بیڈھب لفظ کے معنی پوچھیں گے اور ذراسی غلطی پر جھاڑ کر رکھ دیں گے پھر کیا ہوگا؟ لیکن اس زمانے میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا، جس نے میری دہشت نکال دی، اور میری مشکل حل کردی۔

ہوا یہ کہ ایک روز سید صاحب درجہ میں تشریف لائے، انھوں نے چاک سے بلیک بورڈ پر لکھا،

"حسب ذیل الفاظ چھوٹے چھوٹے عربی جملوں میں کھپایئے۔

(۱) چھری، (۲) میز، (۳) ہیٹ (۴) دیا سلائی (۵) لوٹا

سب لڑکے سر جھکا کر لکھنے کی کوشش کرنے لگے، میرے پاس میرے ایک ہم وطن دوست بیٹھے تھے، وہ ٹوٹے پھوٹے جملے تو کسی نہ کسی طرح بنا لیتے تھے، لیکن اللہ اور رسول کے علاوہ شاید کوئی عربی نام انھیں یاد نہیں تھا جب اس طرح کا مرحلہ پیش آتا، وہ ساتھ والوں کے حافظہ سے فائدہ اٹھا کر

لیکن یہ پوچھتے گئے ۔ میں نے بھی جو جی میں آیا بتا دیا۔
سید صاحب نے شفقت بھری نظروں سے مجھے دیکھا ۔ مسکرائے اختر کو کاپی دی اور واپس چلے گئے !
اس تبسم نے مجھ سے کہا سید صاحب کو تم نے غلط سمجھا ہے میں نے مان لیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا البتہ اتنی احتیاط ضرور کرتا تھا۔ قبل اس کے کہ سید صاحب کوئی سوال مجھ سے کریں ۔ میں خود کوئی اشکال بیان کر کے انھیں جواب دینے پر مجبور کر دوں ۔

زمانہ آگے بڑھ رہا ہے میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں
ندوہ کی زندگی میری رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے ۔ ندوہ کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی مسلسل کوشش کر رہا ہوں ۔ سید صاحب سے اب اجنبیت نہیں رہی ۔ انس پیدا ہو گیا ہے ۔ وہ آتے ہیں تو وقت کا زیادہ حصہ انھیں کی خدمت میں صرف کرتا ہوں ۔ ان کے حلقۂ درس میں بیٹھتا ہوں ان سے استفادہ کرتا ہوں ۔ ان کی تقریریں سنتا ہوں ۔ ان کے مضامین پڑھتا ہوں ۔ ان کی کتابیں پڑھتا ہوں ۔ جو بات سمجھ میں نہیں آتی ۔ بے تامل پوچھتا ہوں ۔ وہ میری تقریریں سنتے ہیں اصلاح دیتے ہیں تیاری کے اصول بتاتے ہیں مغز اور مواد کی طرف متوجّہ کرتے ہیں ۔ مضامین دیکھتے ہیں ۔ حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں، نکات بتاتے ہیں ۔ رخ بدلنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ایک مرتبہ ہم چند دوست ان کی دعوت کرتے ہیں ۔ وہ از راہ شفقت تشریف لاتے ہیں ۔ اسی زمانے میں ”نگار“ میں میرا ایک چھوٹا سا مضمون چھپا ہے اس کا ذکر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں یہ مضمون اگر زیادہ تیاری کے ساتھ تم لکھتے تو مسئلہ

اَلْغَبْرَاء لکھو!

بیچارے نے پوری سعادت مندی سے یہ بھی لکھ لیا!

دس پندرہ منٹ کے بعد ہم سب نے اپنی اپنی کاپیاں سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں غلط جملے کاٹ دیے۔ قابل اصلاح جملوں پر اصلاح دیدی سب کی کاپیاں مل گئیں، لیکن اختر صاحب یونہی بیٹھے رہے، سید صاحب نے پوچھا یہ کاپی کس کی ہے؟

اختر صاحب انعام کی امید میں کھڑے ہو گئے۔ سید صاحب نے انھیں ایک نظر دیکھا، اور فرمایا۔

"یہاں آئیے"!

خوش خوش پہنچے، سید صاحب نے پوچھا،

"آپ نے یہ الفاظ کس لغت میں دیکھے ہیں"؟

کہیں دیکھے ہوتے تو بتاتے ،چپ! — اب کی سید صاحب نے بارعب اور بلند آواز میں فرمایا،

"آپ الفاظ تصنیف کرتے ہیں؟ —!

اختر صاحب کی سٹی گم ہوگئی لیکن فوراً ہی وہ اعلاء کلمۃ الحق پر تل گئے۔ انھوں نے میری طرف اشارہ کر کے بڑے معصوم لہجہ میں فرمایا۔

انھوں نے بتائے ہیں"

اب میری پیشی ہوئی "

سید صاحب نے ایک تبسم کے ساتھ پوچھا۔

یہ کیا حرکت تھی؟

میں نے کہا — پہلا لفظ میں نے صحیح بتایا تھا اور منع کر دیا تھا اب ان سے پوچھا

زینبی اصول فقہ کی کتاب "توضیح تلویح" پڑھاتے تھے مولانا عبدالودود صاحب اعظمی ابن سینا کی کتاب "نجاۃ" کا درس دیتے تھے،

اور یہ حضرات اپنے اپنے فنون کی اقلیم پر شہر یاری کرتے تھے، اپنے موضوع پر سند سمجھے جاتے تھے۔ سید صاحب کی عظمت دل میں تھی عربی ادب پر ان کی مہارت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ وہ صحیح معنی میں "جامع معقول و منقول" ہیں۔ ایک مرتبہ مولانا صدیقی کے گھنٹہ میں تشریف لائے اور قرآن کے "ربط آیات" پر ایک ایسی دلنشین اور مدلل و مسکت تقریر فرمائی، کہ آنکھیں کھل گئیں۔ کتاب الآغانی کی وہ حکایت یاد آگئی کہ ایک مشہور گویا ابراہیم موصلی، اپنے فن کار بیٹے اسحاق موصلی کو لے کر ایک مشہور گویّے معبد کے پاس پہنچا، اور استدعا کی، کچھ سنائیے، اس نے نئی لے میں نیا لاگ سنایا، واپسی میں بیٹے سے باپ نے پوچھا،

"کہو بیٹے۔ کیسا پایا تم نے اس مغنّی کو"

بیٹے نے کہا، "پدر محترم آج سے پہلے تک دنیا میں آپ سے اچھا کوئی مغنّی میری نظر میں نہ تھا، لیکن معبد کا گانا سنکر آپ ہیچ رہ گئے۔

باپ نے بیٹے کی پیٹھ ٹھونکی، اور بہت سا انعام دیا، مجھ سے اگر مولانا صدیقی صاحب سید صاحب کے درس کے بارے میں پوچھتے تو میں وہی کہتا جو اسحاق نے اپنے باپ ابراہیم سے کہا —— خواہ مولانا میری پیٹھ ٹھونکتے یا سر —— !

مولانا حفیظ اللہ خود سید صاحب کے استاد تھے اور سید صاحب ان کا بے حد احترام کرتے تھے، لیکن ایک روز حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں

کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو سکتا تھا۔ میں جواب میں ندوہ پر اور خود ان پر تنقید کر ڈالتا ہوں۔ میں گستاخ لب و لہجہ میں کہتا ہوں —— ندوہ ہمیں صرف کتابیں پڑھاتا ہے اور کچھ نہیں سکھاتا۔ آپ کو مولانا شبلی نے تیار کیا ہمیں کوئی نہیں تیار کرتا۔ وہ آپ کو عنوانات دیتے تھے ماخذ بتلاتے تھے۔ پھر کاٹ چھانٹ کرتے تھے۔ ہم نہ لکھیں تو کوئی ٹوکتا نہیں۔ لکھیں تو پڑھتا نہیں ہم خود ہی اپنے معلّم ہیں۔ خود ہی مربی، خود ہی ہدایت کار۔ جی چاہے لکھیں جی چاہے نہ لکھیں۔ خواہ امام بخاری پر لکھیں، خواہ ٹیگور پر۔ ہم سبزۂ خود رو ہیں خود ہی اُگے ہیں۔ خود ہی دب جائیں گے۔ آپ کی طرح تھوڑی کہ قدم قدم پر استاد کی ہدایت راہنمائی، اصلاح ——!

عبدالسلام صاحب قدوائی دم بخود تھے، حامد علی ہسر دکی طرح خاموش اور پا بہ گل" —— کیونکہ اصل میزبان وہی تھے —— اور میں اپنی کہے چلا جا رہا تھا —— یقین تھا آج سید صاحب ضرور خفا ہوں گے۔ اور اس گستاخی پر بری طرح ڈانٹیں گے۔ لیکن میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کے ہونٹوں پر تبسّم کھیل رہا تھا۔ آنکھوں سے شفقت کی بارش ہو رہی تھی۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ اعتذار کا رنگ بھی جھلک رہا تھا۔

پھر بڑی شفقت کے ساتھ فرمایا،

—— ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے —— انتظار کیجیے۔

اور کچھ مدت گذر گئی ——

مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی تفسیر قرآن کا درس دیتے تھے، شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب "حجۃ اللہ البالغہ" پڑھاتے تھے، مولانا سید علی

یا گیا، اسی اثنا میں سید صاحب تشریف لے آئے، اس اسٹرائک پر سب سے زیادہ برہم سید صاحب کو ہونا چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ معتمد تعلیمات وہی تھے، ان سے ملاقات ہوئی تو ایسا معلوم ہوا جیسے ہم نے کوئی قصور ہی نہیں کیا تھا، اور اگر کیا تھا تو وہ اسے معاف بھی کر چکے! — اس فضا میں جی کھول کر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے معافی کا سوال ہی نہیں اٹھایا، اور بہ حیثیت معتمد تعلیمات ہمارے داخلہ کے احکام جاری کر دیئے اور اعظم گڈھ واپس تشریف لے گئے۔ جب تک سید صاحب لکھنؤ میں رہے کوئی بھی بولا، ان کے جاتے ہی مہتمم صاحب کی چین پیشانی اور زیادہ ابھر آئی، ناظم صاحب کا رنگ عتاب اور زیادہ چوکھا ہو گیا، پروفیسر عبدالباری صاحب بھی بجا طور پر ہم سے بہت زیادہ نالاں، بیزار اور برہم تھے، اور لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے، ان کی یہ موجودگی بھی ناظم صاحب اور مہتمم صاحب کے پلڑے کا وزن بن گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ سید صاحب کے حکم پر عمل نہیں کیا گیا۔ ہمارے لئے یہ بات خلاف توقع نہ تھی، لہٰذا صدمہ بھی نہیں ہوا، سید صاحب کے لئے تھی، انھیں صدمہ بھی ہوا، لیکن وہ کسی سے لڑنے کے عادی نہیں تھے، ہر وار اپنے قلب ناتواں پر سہہ لیتے تھے، خواہ دل و جگر کا کچھ ہی ہو، دوستوں اور رفیقوں، اور ماتحتوں کا یہ وار بھی انھوں نے سہہ لیا، کچھ روز کے بعد پھر لکھنؤ تشریف لائے۔ اور حسب معمول نواب علی حسن خاں ناظم ندوہ کے ہاں ٹھہرے ہم بھی وہاں پہنچے، یہ ممکن نہ تھا کہ سید صاحب لکھنؤ میں ہوں، اور ہم سے نہ ملیں، بہت مغموم، اور متاثر تھے، آنکھیں چار کر کے بات نہیں کر رہے تھے، میں نے عرض کیا

"اب جامعہ ملیہ کا قصد ہے! ڈاکٹر صاحب کو ایک خط لکھ دیجئے!"

سید صاحب نے فوراً ڈاکٹر ذاکر صاحب کے نام ایک پر اثر خط لکھا، اور ان سے تمنا کی کہ زیادہ سے زیادہ مراعات عطا فرمائیں۔

دوسرے یا تیسرے دن وہ پھر اعظم گڑھ روانہ ہو گئے۔ چار باغ اسٹیشن پر میں

"حضیرۃ القدس" پر سید صاحب نے جو تقریر فرمائی وہ آج تک کانوں میں
گونج رہی ہے۔ مولانا حفیظ اللہ دوسروں کے کمالات کا اعتراف کرنے
میں بڑے بخیل تھے۔ علامہ شبلی کے معاصر تھے اور ان کا مذاق اڑایا کرتے
تھے۔ سید صاحب کے بھی وہ زیادہ قائل نہیں تھے۔ البتہ جب ہم انھیں
یہ یاد دلاتے تھے کہ وہ آپ کے شاگرد بھی تو ہیں تو ذرا مان جاتے۔ لیکن آج
کی تقریر وہ بھی کامل محویت اور استغراق کے ساتھ سن رہے تھے۔ اس انہماک
اور استغراق میں تاثر تھا، بیزاری اور اکتاہٹ نہ تھی! —— "توضیح تلویح"
اور نجات کے اسباق میں بھی بارہا سید صاحب تشریف لائے۔ اور ہم سے زیادہ
ہمارے اساتذہ پر اپنا نقش بٹھا کر واپس گئے۔

واقدی کی روایات حوالہ کے کام میں آتے تھے۔ بڑے بڑے مصنفین اس
کی ثقاہت اور استناد کو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن سید صاحب نے کتب
اسماء الرجال کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد واقدی پر جو تنقیدی مقالہ لکھا اس
نے اگرچہ علمی دنیا میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ لیکن بالآخر اصحاب علم و خبر کو
ماننا پڑا واقدی کیسا مجروح راوی تھا اور اس کے روایات کے ضعف
کا کیا عالم تھا۔

۱۹۳۰ء کی اسٹرائک۔ ندوہ کی سب سے زیادہ ہنگامہ خیز اور انقلاب
انگیز اسٹرائک تھی۔ ایک معمولی سی بات پر طلباء اور منتظمین میں تصادم
ہوا۔ بات بڑھی، نوبت اسٹرائک تک پہنچ گئی۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں اسٹرائک
کے "رنگ لیڈر" خارج کر دیئے گئے جن میں ایک ان سطروں کا لکھنے والا بھی
تھا —— لیکن اتنی نرمی رکھی گئی کہ اگر معافی مانگ لیں تو داخلہ کا امکان ہے۔
ہم دو تین ساتھی معافی مانگنے پر تیار نہیں ہوئے۔ لہٰذا داخلہ بھی نہیں

نہ صرف ہمارے طلب کیے ہوئے جلسے میں موسم سرما کی شدت کا مقابلہ کرتے ہوئے زحمت سفر برداشت کرکے شریک ہوتے ہیں بلکہ اس کی صدارت فرماتے ہیں اور ان کی صدارت میں وہ تمام تجویزیں منظور ہوتی ہیں جو ہماری طرف سے پیش کی جاتی ہیں۔

جلسہ کئی روز تک جاری رہا۔ جلسہ کے اوقات کے علاوہ بھی سید صاحب سے نیاز حاصل ہوتا رہا ایک روز عصر کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، نواب صاحب اپنی کوٹھی کے برآمدہ میں رونق افروز تھے، ان کے قریب ہی ایک کرسی پر سید صاحب تشریف فرما تھے اور کوئی نقشہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے، دیکھتے دیکھتے وہ نقشہ میری طرف بڑھایا اور نواب صاحب کے سامنے محبت بھرے لہجہ میں فرمایا۔

یہ ندوہ کی مجوزہ عمارتوں کا نقشہ ہے، دیکھئے ـــــ ممکن ہے ان کی تکمیل آپ ہی کے ہاتھوں ہو!"

اتنے میں جگر مراد آبادی تشریف لے آئے، وہ بھی نواب صاحب ہی کے ہاں ٹھہرے تھے، نواب صاحب نے پوچھا، "کوئی نیا شعر؟"

جگر صاحب نے فرمایا ؎

خار کو گل، اور گل کو خار، جو چاہے کرے
تو نے جو چاہا کیا، اے یار جو چاہے کرے

تھوڑی دیر کے بعد میں اٹھا، سید صاحب نے پوچھا، "کہاں کا قصد ہے"؟

میں نے عرض کیا "ذرا ندوہ تک جاؤں گا"!

فرمایا "میں بھی چلتا ہوں"!

پہنچانے گیا، گاڑی چھوٹنے میں ابھی دیر تھی اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں، پھر یک بیک بڑی شفقت سے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا، اور فرمایا،

جب میں ندوہ چھوڑ کر پونہ روانہ ہو رہا تھا تو مولانا شبلی نے مجھ سے کہا تھا "سلیمان" اگر میرا بس چلتا، اور میرے اختیار میں ہوتا تو تمہیں پونہ نہ جانے دیتا۔ یہیں اپنے پاس رکھتا، — یہی میں تم سے کہتا ہوں! — میں نے پرنم آنکھوں سے اپنے استاد کو دیکھا اور کچھ نہ کہہ سکا، — کہہ سکنے کی سکت ہی کہاں رہ گئی تھی!

دِلّی پہنچنے کے بعد میں نے سید صاحب کو ایک مفصل خط لکھا، جس میں جامعہ کے کوائف درج تھے، اور کچھ اپنی ذاتی پریشانیوں کا تذکرہ تھا خلاف معمول اس خط کے جواب میں تاخیر ہوئی حیرت تھی ایسا کیوں ہوا؟ — آخر کافی انتظار کے بعد ایک روز سید صاحب کا گرامی نامہ آیا، تحریر فرمایا تھا۔

خط میں دیر اس لئے ہوئی کہ میں اپنی جیب سے تمہاری کچھ خدمت کرنا چاہتا تھا" — میرے خط میں اشارةً بھی اس "خدمت" کا مطالبہ نہیں تھا، لیکن نہ جانے کیوں انھوں نے اس کی ضرورت محسوس فرمائی، — غور فرما لیجئے یہ شفقت اور توجہ اس شخص کے ساتھ تھی جو بغاوت کے جرم میں اپنی مادرِ علمی سے نکالا گیا تھا!

جامعہ جانیکے بعد ندوہ سے اب کوئی علاقہ باقی نہیں رہ گیا تھا، لیکن

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ

کے مصداق، ہم چند دوستوں نے انجمن طلبائے قدیم کا احیا کیا، اور جلسۂ سالانہ کا اعلان کر دیا کہ فلاں تاریخوں میں ندوہ میں ہوگا، اور سید صاحب اس کی صدارت فرمائیں گے! — بڑا شاندار جلسہ ہوا، اور جو لوگ یہ سمجھ کر خوش ہو رہے تھے کہ سید صاحب نے ہمیں عاق کر دیا ہے۔ وہ یہ دیکھ کر بہت غمگین ہوئے کہ سید صاحب

ایک روز فرمایا!

"ندوہ کا تم پر حق ہے"

میں نے کہا "ضرور ہے"

فرمایا "کیا دیتے ہو ندوہ کو لاؤ!"

میں نے جیب میں جو کچھ تھا نذر کر دیا، بہت خوش ہوئے نجیب صاحب اس وقت تشریف نہیں رکھتے تھے، وہ آئے تو ان سے خاص طور پر ذکر کیا۔ دوسرے روز نجیب صاحب سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے۔

"بڑے گن گا رہے ہیں سید صاحب تمہارے۔ کیا دے دیا ہے تم نے بھئی؟"

میں نے عرض کیا "چند کھجوریں!"

نجیب صاحب بڑے بذلہ سنج، اور شگفتہ مزاج شخص ہیں، میرے اس جواب کہنے لگے۔

"ہم پر مذاق کی مشق کرو گے؟"

میں نے کہا، غالباً جنگ تبوک کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جہاد کے لئے صحابہ کرام سے مالی ایثار کا مطالبہ کیا، حضرت عثمانؓ نے بہت کچھ پیش کر دیا۔ حضرت عمرؓ اپنی پونجی لے آئے، حضرت ابوبکرؓ سب کچھ لائے، اور رسول ﷺ کے قدموں پر دیا، دوسرے صحابہؓ نے بھی حسب امکان و مقدرت بہت کچھ دیا، ایک صحابی پاس کچھ نہیں تھا، چند کھجوریں تھیں انھوں نے وہی پیش کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ اس پر اتنے مسرور ہوئے کہ جملہ مال و زر پر آپ نے وہ کھجوریں بکھیر دیں، سید ب ایک مذہبی کام ـــ ندوہ ـــ کے لئے چندہ طلب کر رہے ہیں یہ داروں کا شہر ہے لوگ بہت کچھ دے چکے ہوں گے، بہت کچھ دیں گے۔ میں اس کا کیا مقابلہ کر سکتا ہوں، چند سکے تھے، وہ نذر کر دیئے۔ یہ کرم ہے کہ

نواب صاحب نے کہا، "موٹر لے لیجئے؟"

سید صاحب نے فرمایا "نہیں یونہی ٹہلتا ہوا جاؤں گا!"

لال باغ سے جہاں سید صاحب ٹھہرے ہوئے تھے، ندوہ تک کافی مسافت ہے لیکن وہ پاپیادہ چلنے پر تیار ہو گئے، ـــــ پاپیادہ چلنے کی مصلحت آگے چل کر سمجھ میں آئی راستہ بھر ندوہ کے حال و مستقبل کے بارے میں گفتگو فرماتے رہے اس گفتگو میں امید بھی تھی، اور حوصلہ بھی!

تھوڑی دور چلنے کے بعد قیصر باغ کی طرف سے ایک موٹر تیز رفتاری سے ناک کی سیدھ آتی ہوئی دکھائی دی، سید صاحب گفتگو میں محو تھے، انھوں نے موٹر کی طرف دھیان نہیں دیا، جب وہ قریب آگئی تو میں سید صاحب کے سامنے آگیا اور انھیں پیچھے ہٹا لیا موٹر زن سے نکل گئی، سید صاحب چلتے چلتے کھڑے ہو گئے، کئی منٹ تک کھڑے رہے، پھر جب سانس سنبھل گیا تو آگے بڑھے۔ جب تو نہیں اب اندازہ ہوتا ہے کہ قلب اِسی زمانہ سے کمزور چلا آتا تھا!

جامعہ میں چند سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۱ء میں یک بیک میں مولانا شوکت علی کے ساتھ بمبئی پہنچ گیا اور روزنامہ خلافت کی کرسی ادارت پر بغیر کسی سابقہ تجربہ کے بٹھا دیا گیا، خلافت کمیٹی، یا دوسرے الفاظ میں مولانا شوکت علی اور سید صاحب کے تعلقات میں کچھ جھول پیدا ہو گیا تھا کیونکہ سیاسی مسلک دونوں بزرگوں کا جداگانہ ہو گیا تھا، بمبئی ویسے بھی ان کے راستہ سے دور تھا، اس طرف آنا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، لیکن کبھی کبھی آبھی جاتے تھے۔ اور جب آتے تھے تو جی بھر کر شرف حضوری حاصل کرنے کا موقع دیتے تھے، ایک مرتبہ وہ بمبئی تشریف لائے اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی ایم اے کے دولت کدہ پر مقیم ہوئے

آ ذوعبارت النص، اشارۃ النص کس بنیاد پر آپ اس جائز اور مستحسن مطالبہ کی مخالفت کرتے ہیں؟

آج بڑا نازک موقعہ تھا، دل دھڑک رہا تھا، کہیں سید صاحب برہم نہ ہو گئے ہوں، لیکن آج بھی ان کے ہونٹوں پر وہی شفقت آمیز تبسم موجود تھا، جو آج سے بہت پہلے میں نے ایک موقعہ پر ندوہ میں دیکھا تھا،

پاکستان بن گیا! ——— !

لاکھوں آدمی ادھر سے اُدھر ہو گئے، انہی میں ایک میں بھی تھا، یہاں آنے کے بعد ہندوستان سے رشتہ منقطع ہو گیا۔ ہندوستان کی شخصیتوں سے جدائی ہو گئی، ہندوستان کے ادارے چھوٹ گئے ——— سید صاحب کی یاد دل میں تھی، لیکن یہاں آکر حالات نے کبھی اس کا موقع نہ دیا کہ انھیں خط لکھ سکوں۔

ایک روز دفعتاً میں نے یہ خبر سنی کہ سید صاحب تشریف لائے ہیں۔ جمعہ کی نماز جس مسجد میں سید صاحب نے پڑھی۔ وہیں میرے ایک عزیز ابو الحسن صاحب نے بھی پڑھی۔ نماز کے بعد وہ میرے واسطے سید صاحب سے ملے، سید صاحب نے فرمایا،

آپ ملنے آگئے، لیکن وہ نہ آئے ——— !

انھوں نے آکر مجھ سے کہا۔ میں دل میں بہت نادم ہوا اور اپنے آپ پر لعنت ملامت کرتا رہا لیکن عجیب اتفاق کہ پھر بھی نہ جا سکا۔ ایک روز حکیم نصیر الدین ندوی نے سید صاحب کی دعوت کی۔

حکیم صاحب میرے محبوب دوستوں میں ہیں آج نہیں ندوہ کے درجہ

انھوں نے اتنی بے حقیقت بات کا آپ سے ذکر کیا۔

نجیب صاحب مسکرائے کہا" بڑے استاد ہو، یہ نسخہ ہمیں نہ بتا دیا پہلے سے !"

ایک مرتبہ تحریک پاکستان کے عین عالم شباب میں ——— سید صاحب بمبئی تشریف لائے، بمبئی کی جمعیتہ العلماء سالانہ جلسہ کر رہی تھی اور سید صاحب اس کے صدر منتخب ہوئے تھے، میں مسلم لیگ اور پاکستان کے فدائیوں میں تھا، سید صاحب خلافت ہاؤس کے اسی کمرہ میں ٹھہرے تھے، جو کبھی مولانا شوکت علی کا مسکن رہ چکا تھا، میں بھی ملنے کے لئے گیا، جمعیت کے چند مقتدر اصحاب تشریف فرما تھے، یہ وہ لوگ تھے جن کی میں اپنے اخبار میں مخالفت کرتا تھا، میرے سامنے انھوں نے سید صاحب سے میری شکایت کی، کہ دیکھئے جعفری صاحب پاکستان کی حمایت کے جوش میں ہم لوگوں کی سخت مخالفت کرتے ہیں ——— مجھے یہ بات بہت بری معلوم ہوئی۔ میں نے ذرا تلخ لہجہ میں کہا،

ہاں کرتا ہوں، لیکن یہ نہ بھولئے کہ میں صرف آپ کے مسلک کی مخالفت کرتا ہوں، اور آپ اپنے مخالفوں پر کفر کے فتوے صادر کرتے ہیں۔ میں مخالفت کے باوجود مولانا ابوالکلام، مولانا کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد کا بے حد احترام کرتا ہوں، ان کے اختلاف کو اجتہادی اختلاف جو حسن نیت پر مبنی ہوتا ہے، قرار دیتا ہوں، اور آپ ——— ؟ آپ قائد اعظم کو بدترین خلائق ثابت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، میں ذاتیات میں نہیں الجھتا۔ اور آپ کا سارا زور شور ذاتیات پر ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں وہ اپنی آزاد اور خودمختار حکومت کیوں نہ قائم کریں!

اور کئی دوسرے لوگ تھے۔ گاڑی مسافروں کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ لہٰذا ہر شخص الگ الگ ڈبے میں بیٹھا، کراچی کے صدر راسٹیشن پر میری اور حکیم صاحب کی ملاقات ہوئی! ——یوں تو کئی بار ہوئی، میں قطب کی طرح اپنی جگہ بیٹھا تھا، وہ ہر اسٹیشن پر اترتے تھے۔ ایک مرتبہ سگریٹ کی ڈبیہ پھینک گئے، ایک مرتبہ پانی کے کچھ قطرے —— وضو کرنے کے بعد —— پھینک گئے، —— لیکن صدر کے اسٹیشن پر اطمینان سے ملاقات ہوئی میں نے دیکھا کافی پریشان اور گھبرائے ہوئے سے نظر آرہے ہیں۔ پوچھا کیا بات ہے۔ کہنے لگے سید صاحب پر تنفس کا دورہ پڑا ہے سید صاحب گھر روانہ ہو گئے۔ حکیم صاحب ٹیکسی کر کے اپنے دواخانہ گئے۔ اور جتنی بھی قیمتی اور مفید ادویہ ممکن ہو سکتی تھیں انھیں لے کر سید صاحب کے حضور میں پہنچ گئے۔

آخری علالت کے دوران میں اپنی بدقسمتی کے باعث حاضر نہ ہو سکا۔ اتفاق کی بات حکیم صاحب بھی نہ جا سکے۔

ایک روز خود سید صاحب نے حکیم صاحب کو فون کیا اور بڑے شاعرانہ الفاظ میں یاد کیا۔ یہ فوراً پہنچے سید صاحب نے کہا دیکھ لیجئے۔ انھوں نے معائنہ ہی شروع کیا، دوران معائنہ میں پیٹ دبایا اور پوچھا درد تو نہیں ہوتا فرمایا

ان انگلیوں سے بھلا درد محسوس کر سکتا ہوں

آہ

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

دماغ نے اپنا خزانہ کھول دیا۔ جتنا لکھ چکا ہوں اس سے کئی گنا زیادہ لکھ سکتا ہوں۔ جی بے قرار ہے کہ جو کچھ یاد ہے سب لکھ ڈالوں۔ لیکن کاغذ کنٹرول ہے اپنے سے زیادہ دوسرے لکھنے والوں کے جذبات کا پاس ہے

اوّل سے ، ــــــ ان کا حکم رد نہ کر سکا - دعوت میں گیا سید صاحب تشریف لا چکے تھے میں نے سلام کیا - انھوں نے معانقہ کیا - میں دور ہٹ کر بیٹھ گیا - انھوں نے پاس بلا کر بٹھایا " دیدو شنید " ہاتھ میں تھی - اس کی ورق گردانی فرما رہے تھے حکیم صاحب نے وہ صفحہ کھول لیا جس میں ان کا ذکر تھا ، اسی نشست میں مضمون پڑھ لیا - پھر مسکرا کر کتاب بند کر دی -

اسی مجلس میں ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ لاہور میں مولانا مودودی نے سید صاحب کی دعوت کی اور دریافت کیا سنا ہے حکومت نے آپ کو تعلیمات اسلام بورڈ کا صدر بنا دیا -

سید صاحب نے پوری سنجیدگی سے فرمایا ۔

ایجاب ہو چکا ہے قبول باقی ہے -

حکیم نصیر الدین سراپا جذب و کشش شخصیت کے حامل ہیں پھر ایثار محبت خلوص اور وضعداری کے صفات مستزاد ، ندوہ میں سید صاحب سے حکیم صاحب کو زیادہ واسطہ نہیں رہا اس لئے کہ وہ ابھی چھوٹے طالب علم تھے ، نیز کچھ ہی عرصہ بعد وہ طبیہ کالج دہلی چلے گئے - لیکن کراچی میں وہ سید صاحب پر چھا گئے تھے سید صاحب نے ان کی طبیعت کو سمجھ لیا تھا - انھوں نے سید صاحب کے مزاج کو پالیا تھا - سید صاحب ان پر بے انتہا التفات صرف فرماتے تھے اور وہ سید صاحب پر ، پروانہ وار قربان ہوتے تھے سید صاحب انھیں مکدر دیکھ کر خود مکدر ہو جاتے اور سید صاحب کی ذرا سی تکلیف یا خفگی اپنے لئے ناقابل برداشت محسوس کرتے تھے -

ٹنڈو آدم میں مجلس ندوۃ العلوم کا جلسہ ہوا - واپسی جس گاڑی سے ہوئی اس کے مسافروں میں سید صاحب ، حکیم صاحب ، راقم الحروف اور

مسعود عالم ندوی

آہ، کس طرح اُسے مرحوم لکھوں، جو زندگی سے بھرپور تھا، جس نے اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی صلاح و فلاح کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی، جس نے زندگی کی ساری اُمنگوں اور حوصلوں کو، ترقی کے سارے امکانات کو، عروج دنیاوی کے تمام توقعات کو ٹھکرادیا تھا وہ عربی زبان پر، وہی دسترس رکھتا تھا، جو ایک اہل زبان رکھتا ہے، جس کا دل بھی مسلمان تھا، دماغ بھی، روح بھی، اور فکروتخیل بھی، وہ دشمنوں کو دوست بنا لیتا تھا، دوستوں سے مخالفت مول لے لیتا تھا، اپنوں سے رُوٹھ جاتا تھا، اگر مقصد اور منزل کا سوال درپیش ہو۔

مسعود عالم میرے ندوہ کے دوستوں میں تھے، وہ مجھ سے دو سال آگے تھے لیکن اس فرق کے باوجود ذاتی تعلقات ندوہ ہی میں استوار ہوئے، اور پھر زندگی کی آخری سانس تک، اگرچہ کبھی کبھی ان میں تعطل پیدا ہوتا رہا، لیکن فرق نہ آیا، وہ جماعت اسلامی کے رکن رکین تھے، ہر بات کو جماعت ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے، مجھے متعدد معاملات و مسائل میں فروعی اور اصولی اختلافات تھے لیکن اختلافات اپنی جگہ پر تھے، ذاتی مراسم اور تعلقات اپنی جگہ!

طالب علمی ہی کے زمانہ سے عربی ادب سے والہانہ شغف رکھتے تھے،

اب یہ داستان ختم کرتا ہوں۔ خدا نے موقع دیا تو انشاء اللہ پھر
کبھی یہ داستان سناؤں گا۔

(مارچ ۱۹۵۴ء)

تھے، اردو بھی بڑی اچھی اور ستھری لکھتے تھے، ان کی تحریروں میں ایک خاص قسم کی گھلاوٹ، اور شیرینی محسوس ہوتی تھی۔

اپنے مسلک پر مخلص لوگوں کی طرح بڑی سختی سے قائم تھے، اور جو بحث کرتے کرتے کج بحثی پر اتر آتا تھا، اس سے خفا بھی ہو جاتے تھے، لیکن ذرا دیر کے لئے، لیکن جن لوگوں کے اخلاص کے وہ قائل تھے، یا جن کی علمی اور تحقیقی منزلت کے وہ معترف تھے، اختلاف فکر و نظر کے باوجود، دل ان کی محبت سے سرشار تھا۔ جب کبھی ان کا ذکر چھڑ جاتا تو زیادہ تر گفتگو ان کی خوبیوں ہی تک محدود رہتی تھی!
—— بڑی فراخدلی سے محاسن کا اعتراف کرتے تھے۔

کراچی میں پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء میں ملاقات ہوئی تھی، ندویوں کا ایک اجتماع تھا۔ مدعو نہ ہونے کے باوجود آئے، اور آخر تک اجتماع کی سرگرمیوں میں شریک رہے، بلکہ ایک ندوی کی طرح حصہ لیتے رہے، مسعود عالم سب کچھ تھے، لیکن ندویت کبھی ان سے منفک نہ ہو سکی، سید صاحب کی وفات پر، جب بعض اکابر کی طرف سے سیرت سلیمانی کی تسوید و تحریر کے لئے غیر ندوی اصحاب کے نام پیش کئے گئے تو مسعود عالم اسے برداشت نہ کر سکے، اس سلسلہ میں ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے "صدق" میں ان کا مکتوب بھی شائع ہو چکا ہے، اس کی ایک ایک سطر سے یہی جذبہ ابھر رہا ہے۔

گزشتہ ہفتہ وہ کراچی آئے، اور حکیم نصیر الدین ندوی کے مہمان خانے میں ٹھہرے، دمہ کی شکایت، طالب علمی ہی کے زمانہ سے تھی، ہر طرح کا علاج کیا، مگر صحت نہ ہوئی، علاج سے صرف وقتی فائدہ ہو جاتا تھا، لیکن ہمت اور عزیمت کے یہ حال تھا کہ ادھر دمہ کے شدید، اور قریب قریب مہلک دورے سے فارغ ہوئے، ادھر کرسی پر تن کر کام کرنے بیٹھ گئے، گویا ابھی جو

معاصرین میں عربیت کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز اور یگانہ رہے حضرت سید صاحب
قبلہ مغفور کی سرپرستی میں عربی کا ایک بلند پایہ ماہنامہ "الضیا" ندوہ سے نکلا
جو ہندوستان کے عربی داں طبقہ میں، اور ممالک عربیہ میں بہت مقبول ہوا،
اگرچہ پتھر پر چھپتا تھا، اور عرب ٹائپ کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ وہ پتھر کا
چھاپہ پڑھتے ہی نہیں، لیکن وہ "الضیا" کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے اور شوق
کی نگاہوں سے پڑھتے تھے، ممالک اسلامیہ کے اہل علم اور اہل قلم اصحاب سے
اسی زمانہ میں روابط اور تعلقات قائم ہوئے، جو آگے چل کر بہت زیادہ مستحکم ہوئے
جماعت اسلامی کے ذہنی اور علمی افکار کو جس خوبی سے مسعود عالم نے عربی میں
منتقل کیا ہے، وہ انہی کا حصہ ہے، لاکھوں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی اس
خوبی اور سلیقہ سے یہ کام انجام نہیں پا سکتا تھا جو اس فقیر بوریہ نشین نے
کر دکھایا، عربی زبان پر مسعود عالم کو جو عبور تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے
کہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی کتاب "لغات جدیدہ" میں جب
مرور ایام سے کمی محسوس ہوئی، اور بہت سے نئے عربی الفاظ و مصطلاحات
و معربات کے اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی، اور اپنی بے پناہ مصروفیات کے
باعث خود یہ کام انجام نہ دے سکے تو ان کی نظر انتخاب مسعود عالم پر پڑی، لغات جدید
کا تتمہ انھوں نے اپنے استاذ کے حسب الحکم لکھا، اور دار المصنفین سے انہی کے
نام سے شائع ہوا۔

ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد مسعود عالم نے کئی مشغلے اختیار کیے،
کچھ عرصہ تک ندوہ ہی میں رہے، پھر خدا بخش خاں لائبریری کے کیٹلاگر مقرر ہوئے
سید صاحب کے پاس بھی کچھ دن گزارے، عبدالوہاب نجدی پر ایک بڑی
اچھی اور تحقیقی کتاب ایک بہ نام "مصلح" لکھی، عربی تو اہل زبان کی طرح لکھتے ہی

جاعات کے بعد انشاء اللہ پھر آجاؤں گا، صحت اچھی خاصی تھی، ادھر چند روز
ے کوئی خاص شکایت بھی نہیں ہوئی تھی، کسے معلوم تھا، یہ آخری ملاقات ہے،
یوا ہوا چہرہ، آنکھیں پھر کبھی نہ دیکھ سکیں گی۔

یہ واقعہ ۱۴ مارچ کا ہے، ۱۵ مارچ کو حکیم صاحب، صاحبزادہ اسحاق
ان، اور محمود صاحب نے سوہاروسیروشکار کا پروگرام بنایا، طے یہ ہوا کہ رات
یں وہیں گزاروں، اور صبح چار بجے کار پر ہم لوگ روانہ ہو جائیں، میں تھکا
وا تھا، جلدی سو گیا، صبح اٹھا، اور اچکن پہن کر، باہر نکلا، کہ غازی صاحب کے ہاتھ
یں صبح کا اخبار دیکھا، پہلے صفحہ پر ماتمی حاشیہ کے ساتھ ایک خبر پر نظر پڑی،
مولانا مسعود عالم کا انتقال" خبر پڑھ کر دل دھک سے ہو گیا، یقین ہی نہیں آتا
تھا، یہ خبر سچ ہو سکتی ہے، ہر موت، انسان کے اس زعم باطل پر ٹھوکر لگاتی
ہے، کہ زندگی مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ ناستوار ہے، لیکن ہر حادثۂ موت
کے بعد انسان پھر دنیا کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے، اور سب سے زیادہ کمزور
آدمی اور جاودانی سمجھ کر غفلت میں مبتلا ہو جاتا ہے، سمجھنے لگتا ہے موت
سے بہت دور ہے، اب اس طرح کا کوئی حادثہ نہیں پیش آئے گا، لیکن
آتی ہے، بار بار آتی ہے، کبھی ناکام نہیں جاتی، ہر مرتبہ اپنی سطوت، اور
قوت کا سکہ بٹھا کر جاتی ہے، حادثہ جب تک واقع نہیں ہو جاتا، دل
اسے ناممکن سمجھتا ہے، اور جب واقع ہو جاتا ہے تو اپنی بے بسی پر روتے
ہے، گریباں پھاڑنے لگتا ہے، فریاد و شیون سے ہنگامہ بپا کر لیتا
ہے ———— غازی صاحب نے بتایا خبر گیارہ بجے رات کو
آئی، اور نصیر اسی وقت چلے گئے تھے، میں نے شکایت کی مجھے کیوں
نہ جگا لیا؟ فرمایا، نصیر نے بڑے اہتمام سے یہ خبر تم تک نہیں پہنچنے دی،

شخص مرگ دذلیت کی کش مکش میں گرفتار تھا، وہ مسعود عالم نہیں کوئی اور تھا! —
——— ہاں تو وہ حکیم صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے، دوا کا بھی اچھا انتظام تھا، اور پرہیزی غذا کا بھی بندوبست تھا، میں ایک روز حکیم صاحب کے ہاں گیا، ان سے کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں، پھر رخصت ہونے کے لئے اٹھا حکیم صاحب نے کہا "مسعود عالم آئے ہیں ان سے مل لو!" میں نے کہا، پھر کسی وقت! فرمایا "نہیں میں ان سے کہہ چکا ہوں کہ میں آنے ہوں گے! اس پر انھوں نے کہا" وہ مجھ سے ملنے کیوں آنے لگے، آپ سے ملنے آئیں گے، ——— مل لینا چاہئے ———! ہم دونوں مسعود عالم کے کمرہ میں پہنچے، اسی تپاک و محبت سے ملے، جو ان کی سرشت تھی، ملاقات یا تو بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی یا ہوئی تو پھر دراز تر ہوتی چلی گئی، سید صاحب کی ذات و صفات، مولانا عبدالماجد کی تحریر و تحریک، مولانا اعزاز علی کا جماعت کے خلاف فتویٰ، اور اس کے الفاظ، سیاستِ عالم اسلام، سیاسیاتِ ملّی، دوسرے دن حکیم صاحب نے حضرت جگر مراد آبادی کی دعوت کی تھی، پُرتکلف دعوت، اور بے تکلف اجتماع، لطف آگیا، مسعود عالم بھی اس اجتماع کے کیف سے پورے طور پر لطف اندوز ہوتے رہے، جگر صاحب کے کلام کے بعد، ماہر القادری صاحب نے اپنے مخصوص ترنم، اور دل آویز لحن کے ساتھ اپنا کلام سنایا، خاص طور پر نعت، سماں بندھ گیا، بڑی دیر تک یہ نشست قائم رہی، دو دن کے بعد صاحبزادہ اسحاق جان نے مخصوص احباب کو "لنچ" پر مدعو کیا، یہاں بھی مسعود عالم اپنی تمام دلآویزیوں کے ساتھ موجود تھے، وہی تبسم، وہی تکلم، لنچ کے بعد انھوں نے سامان سفر بندھوانا شروع کیا، حکیم صاحب نے پوچھا، "یہ کیا؟" کہنے لگے، جماعت کے اجتماعات کالونی میں ہو رہے ہیں، سب وہیں ٹھہریں گے، لہٰذا مجھے بھی جانا پڑ رہا ہے،

استاذ مرحوم حضرت سید صاحب قبلہ رح پر ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا، وہ کہ چالیس برس اپنے بزرگوں، دوستوں، ہم چشموں، اور عزیزوں کی رہنمائی کرتا رہا، آج اس کی یاد میں جس قدر آنسو بہائے جائیں، کم ہے، اس کی خدمات کے اجاگر کرنے کے لئے جتنی مجلسیں بھی ترتیب دی جائیں ان کا حق ادا نہیں ہو سکتا، اس جامع و ہمہ گیر شخصیت کا ہم پر یہ حق ہے کہ اس کے کارناموں سے دنیا کو روشناس کرائیں، نہ جاننے والوں کو بتائیں کہ کیسی بیش بہا نعمت ہم سے چھن گئی، حق یہ ہے کہ پوری ملت اس غم میں سوگوار رہے تو بجا ہے۔

یہ سطریں آپ کے خاص نمبر کی رسید کے طور پر لکھ رہا ہوں، اس وقت کوئی مضمون لکھنا مقصود نہیں، البتہ مجھے ندامت ضرور ہے کہ آپ کی ترتیب دی ہوئی "بزم سلیمانی" کی شرکت سے محروم رہا، انشاءاللہ زندگی رہی تو پھر کبھی یہ سعادت حاصل ہو جائے گی۔

یار زندہ صحبت باقی۔ والسلام

نظامی دواخانہ کراچی — "خاک پائے سید"

رجب ۷۳ھ — مسعود عالم ندوی

آہ! مسعود عالم رخصت ہو گیا! ایک بہت اچھا ندوی ہی نہیں ایک بہت اچھا مسلمان بھی

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

(اپریل ۱۹۵۴ء)

وہ کہہ رہے تھے، دل کمزور ہے، سوتے سے اٹھا کر دفعتہً خبر سنائی جائے گی تو برا اثر پڑے گا! اتنے میں حکیم صاحب بھی آ گئے، معلوم ہوا رات کے تین بجے تک کالونی کی ایک ایک گلی کا طواف کرنے کے باوجود وہ جگہ نہ مل سکی، جہاں یہ حادثہ رونما ہوا تھا، اب دھوپ نکل چکی تھی، ہم لوگ پھر کالونی پہنچے، ایک بڑا سا خیمہ تھا جس کے وسط میں سفید لباس میں ملبوس، ایک چارپائی پر مسعود عالم ہمیشگی کی نیند سو رہے تھے، ارد گرد جماعت کے رفقاء تھے، کوئی لحاف میں ملفوف تھا، کوئی اخبار پڑھ رہا تھا، چادر ہٹا کر حکیم صاحب نے منہ دکھایا، معلوم ہوا

تھا ملت اسلامیہ کا یہ فدا کار، اور غم گسار،

ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے!

خواص میں صرف جناب عبدالجبار صاحب تشریف رکھتے تھے، ان سے حکیم صاحب نے تعزیت کی، اور چلے آئے۔

"ریاض" کا سلیمان نمبر دیکھ کر مسعود عالم بہت خوش ہوئے تھے، بڑے مبالغہ کے ساتھ داد دی تھی، ایک ایک مضمون پڑھا تھا، اور بڑے شوق سے پڑھا تھا، وعدہ کیا تھا کہ فرصت مل لے تو پھر خود بھی اپنے تاثرات سید صاحب پر قلم بند کریں گے، کالونی جانے سے دو تین دن پہلے حکیم صاحب کی معرفت ایک خط بھی مجھے لکھا تھا، اگر میں کہوں کہ یہ مسعود عالم کی آخری تحریر تھی تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا، وہ خط یہ ہے:-

"محب مکرم جناب حکیم نصیر الدین ندوی کی عنایت سے "ریاض" کا سید سلیمان نمبر، نظر سے گزرا، خوشی ہوئی، اور بے اختیار آپ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرنے کو جی چاہا، اللہ تعالےٰ آپ کو اس کا اجر دے۔ ہم وابستگان سید رح کی دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں اور رہیں گی۔

میں نے گردن جھکالی۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا، کہ میں نے یہ لفظ لکھ کر شفیق صاحب کے سینہ پر گھونسہ مارا ہے، لیکن وہ مسکرا رہے ہیں، حالانکہ یہ لفظ لکھے بغیر بھی میں اپنا مفہوم ادا کر سکتا تھا، اُس دن سے نقطۂ نظر کے اختلاف میں الفاظ کے استعمال و انتخاب کو میں بڑی اہمیت دینے لگا ہوں۔

کرسمس کی تعطیلات کے بعد ہم چند دوست طوفان میل میں بیٹھ کر کانپور سے دلی چلے، اٹاوہ کے اسٹیشن پر نہ جانے کس کمپارٹمنٹ سے شفیق صاحب بھی ہم میں آملے، اب وہ استاد اور ہم شاگرد، نہیں تھے، خوب گھل مل کے باتیں ہو رہی تھیں، وہ ڈاکٹر انصاری کے گن گا رہے تھے، ہم نکتہ چینی کر رہے تھے، ۵ بجے شام کو ہم دلی پہنچ گئے، ریل سے اترے تھے کہ سی، آئی ڈی والوں نے اپنے چارج میں لے لیا، تلاشی شروع ہوئی، بڑی دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی سے، مغرب کا وقت آگیا، انھوں نے اشارہ سے مجھے بلایا، فرمایا، کہیں سے ایک گلاس پانی لے آؤ، تو روزہ کھول لوں —— حالانکہ یہ رمضان کا مہینہ نہیں تھا —— پانی سے روزہ کھولا، اور نماز پڑھنے ایک کونہ میں کھڑے ہو گئے، پولیس والے اپنا کام کرتے رہے۔

بہت دنوں بعد —— ۴۴ء میں ایک دفعہ بمبئی آئے، حارث صاحب کے ہاں ٹھیرے، اور مجھ سے ملنے میرے دفتر تشریف لائے، میں نے چائے سے تواضع کی، پھر ملازم سے کہا، پان لے آؤ، اس نے پوچھا پان کے ساتھ تمباکو وغیرہ بھی لے آؤں، شفیق صاحب نے شوخ نظروں سے اسے دیکھا اور کہا "پان لاؤ، تمباکو بھی لا سکتے ہو، لیکن وغیرہ ہرگز نہ لانا ——!"

کیسے باغ و بہار آدمی تھے —— سچے ہندوستانی، پختہ مسلمان، کھرے انسان!

(مئی ۱۹۵۳ء)

شفیق الرحمٰن قدوائی

شفیق الرحمان قدوائی وزیر تعلیمات حکومت دہلی کا حادثۂ وفات اُن کے جاننے والوں کے لئے بڑا سانحہ ہے، مرنے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں علی گڑھ سے نان کو آپریشن کرکے جامعہ آئے، اور وہیں کے ہو رہے، ایثار، شرافت، خلوص، بے نفسی اور اصول پروری کا وہ مجسمہ تھے۔ غصہ کرنا تو جانتے ہی نہیں تھے، سراپا لطف و محبت!

آہ، جامعہ کے وہ دن —— وہ محمد علی ہوسٹل کے ٹیوٹر تھے، اور میں ہاؤس مانیٹر، وہ استاد تھے، اور میں شاگرد، اس بڑے اور چھوٹے "تعلق کے باوجود ہم دونوں نقطۂ نظر کے لحاظ سے کبھی متحد نہ ہو سکے، وہ کٹر کانگرسی تھے اور میں کٹر مخالف کانگرس، یہ آج سے ۲۰ برس پہلے یعنی سنہ ۳۲ء کی بات ہے، ایک مرتبہ حسب معمول، انھوں نے ایک عنوان دیا، اور کہا اس پر ایک صفحہ کا مضمون انگریزی میں لکھ کر لاؤ، عنوان تھا "گاندھی جی"! میں نے اپنے مضمون میں گاندھی جی پر کڑی نکتہ چینی کی اور انھیں CUNNING لکھ دیا، یہ لفظ پڑھتے ہی وفور غضب سے ان کا چہرہ تمتما اٹھا کان کی لویں تک سرخ ہو گئیں، لیکن جب آنکھیں ملیں تو مسکرا کر چپ ہو گئے

اس طرح بنوا دیا کہ حکومت کے تمام مجوزہ بل تک اسمبلی میں پیش ہونے سے پہلے مرہٹی، گجراتی اور انگریزی کی طرح اردو میں بھی شائع ہوں، صرف سر رفیع الدین کا کارنامہ ہے، اور کوئی شبہ نہیں بڑا روشن اور تابناک کارنامہ ہے۔

وہ اتنے پرانے ہو چکے تھے، اور اپنی قدامت کی عظمت کے اس درجہ قدر شناس تھے کہ کسی دوسرے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، وہ نہ گاندھی جی سے ترک موالات کے زمانہ میں میدان جیت سکے، نہ مسلم لیگ کے عہد میں مسٹر جناح پر غالب آسکے، لیکن زندگی کی آخری سانس تک ان دونوں بڑی ہستیوں میں سے کسی کو اپنا مدِ مقابل ماننے پر تیار نہ ہوئے، جب کانگرس کے پنڈال اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے گاندھی جی کے جیکارے لگتے اور قائد اعظم زندہ باد کی صدائیں بلند ہوتی تھیں، وہ اپنے وسیع اور دل کش بنگلہ میں پورے اطمینان اور بے پروائی سے ان دونوں کی قائدانہ اہلیت پر اپنی حاشیہ نشین کے سامنے تند و تیز الفاظ میں دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے تھے، اور سمجھ لیتے تھے میں نے شکست دے دی، میں جیت گیا، حالانکہ نہ صرف گاندھی جی اور قائد اعظم کے، بلکہ دنیا تک کے حافظہ سے وہ اتر چکے تھے، ـــــ خود اعتمادی کی انتہا ہے، اور بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔

گزشتہ بارہ چودہ سال سے وہ نابینا ہو چکے تھے، آنکھ کی قوت ہاتھ میں آگئی تھی، ٹٹول کر پہچان لیتے تھے، اس حالت میں بھی، صبح و شام ہوا خوری کو ملازم کا ہاتھ پکڑ کر پابندی سے نکلتے تھے، اولاد نرینہ سے محروم تھے، دو لڑکیاں ہیں، ایک سے ایک تعلیم یافتہ، اور زرق برق! ـــــــ عیش و دولت کی صورت میں باپ کا نعم البدل مل گیا! ◆

(مئی ۱۹۵۴ء)

سر رفیع الدین! ——

سر رفیع الدین نے بہت طویل عمر پائی، اور اس طویل عمر سے انھوں نے خود بھی فائدہ اٹھایا، اور دوسروں کو بھی پہنچایا، بڑے بڑے مناصب پر فائز ہوئے، لیکن نہ اپنی ملت کو فراموش کیا، نہ اس کے مفاد اور مصالح کو نظر انداز کیا، وہ عہد اول کے بیرسٹر تھے جب بیرسٹری کے لئے سفر فرنگ کی ہمت بہت کم لوگوں کو پڑتی تھی، لندن میں وہ گاندھی جی کے ہم درس، اور ہم درسگاہ تھے، —— یہ بات خود انھوں نے مجھ سے ایک مرتبہ بر سبیل تذکرہ فرمائی تھی، —— لندن میں جب تک رہے طلب علم کے سوا، سیاسی مشاغل سے بھی دلچسپی لیتے رہے، ملکہ وکٹوریہ کے حضور میں باریاب ہوئے، اور کامرانی کے تمغے لیکر واپس ہوئے۔

کانگرس کے عہد حکومت سے پہلے برسہا برس تک، وہ حکومت بمبئی کے وزیر رہے، ان کی وزارت بھی بڑی شان کی تھی، وہ سر غلام حسین ہدایت اللہ، اور سر شاہ نواز بھٹو کی طرح گورنر کے اشارۂ چشم و ابرو کے پابند نہیں تھے، وہ خود اپنی رائے رکھتے تھے، اپنی رائے پر قائم رہتے تھے اور اسے منوانے کے لئے ہمہ تن وقف عمل ہو جاتے تھے، اردو کو بمبئی کی سرکاری زبان

وا اس آستانہ پر سر جھکا کر تشریف لاتے تھے'! ——— خیال یہ تھا مولانا عبدالباری کے بعد، فرنگی محل کی سیاسی عظمت اور اہمیت ختم ہو جائے گی، لیکن قطب میاں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے' اس ستون کو تھامے رکھا، گرنے نہ دیا.

مولانا عبدالباری کی طرح قطب میاں بھی' اسلام کی حرمت اور تقدس کے معاملہ میں کسی مصلحت یا مفاہمت کے قائل نہ تھے، جو بات دل میں آجاتی تھی بیدھڑک کہہ گزرتے تھے، خواہ انجام کچھ ہی ہو، وہ نہ انگریزوں سے مرعوب ہوئے، نہ ہندوؤں سے، نہ کسی بڑی سے بڑی طاقت سے؛

فلسطین پر یہودی استیلا کے سلسلہ میں جوش سے بھری ہوئی جو تقریر انھوں نے دلی کی جامع مسجد میں کی تھی' وہ آج بھی بہتوں کو یاد ہے، اسلام اور مسلمانوں کے معاملہ میں نہ وہ مداہنت کے قائل تھے، نہ مفاہمت کے، یہی ادا تھی جس نے انھیں مقبول عوام بنا رکھا تھا۔

دعا ہے خدا ان کی مغفرت فرمائے' اعلیٰ علیین میں جگہ دے، ——— طلب ہے کہ فرنگی محل کی آن اور شان میں کوئی فرق نہ آئے اب لے دے کے تو امید ہے وہ مولانا جمال میاں سے، جو مولانا عبدالباری کے خلف الصدق ہیں اور الحمدللہ کہ، خدمت ملی کے جذبہ سے سرشار بھی ہیں' ان کی ذات میں تمام خصوصیتیں مجتمع ہیں، جو مولانا عبدالباری' اور قطب میاں میں فرداً فرداً پائی جاتی تھیں، ہمیں امید ہے جمال میاں کے زمانہ میں فرنگی محل کا دبدبہ بڑھ جائے گا۔ ٭

(جون ۱۹۵۴ء)

قطب میاں!

لکھنؤ کی ایک تازہ اطلاع سے یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ مولانا قطب الدین عبدالوالی، فرنگی محلی، ۵۸ سال کی عمر میں چند روز صاحب فراش رہ کر، اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!

قطب میاں، مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی رح کے بھتیجے اور جانشین تھے اسلام کی راہ میں سراپا جوش و ایثار، مسلمانوں کی خاطر، غیر مسلموں سے ہمہ وقت آمادۂ جہاد و پیکار، خوش اطوار، خوش گفتار، صاف دل، صاف باطن، صاف گو۔

کہتا تھا وہی بات سمجھتا تھا جسے حق
وہ زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

فرنگی محل کی آبرو، اگر مولانا عبدالباری تھے، تو ساکھ قطب میاں، تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ایک زمانہ تھا کہ گاندھی جی جب لکھنؤ آتے، تو فرنگی محل میں قیام کرتے، مولانا عبدالباری کے مہمان ہوتے، اور قطب میاں، انتظام مہمانداری کرتے فرنگی محل، پہلے صرف علما اور صلحا کا مرکز تھا، پھر مولانا عبدالباری کے زمانہ میں علما اور صلحا کے علاوہ، زعما کا مرکز بھی بن گیا، بڑے بڑے کوہ وقار، اور بلند سرفراز اور کج کلاہ سب کو ہیچ سمجھنے والے، اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والے

ے بڑھ چڑھ کر حصّہ نہ لیا ہو، بڑے خوش طبع، بذلہ سنج، اور یار باش آدمی تھے۔
مزاج میں ذرا تیکھا پن بھی تھا، لیکن اسی سے جو بنتا ہو، ورنہ اپنوں کے لیے وہ
پیکرِ محبت و شفقت تھے!

شعیب قریشی، خلیق الزماں، عبدالرحمان صدیقی کے نام عظمت اور بڑائی
کے ساتھ بچپن سے ہی سنتا آرہا تھا، کتنا اشتیاق تھا ان بڑوں کو دیکھنے کا،
ان سے ملنے کا، ان کی محفل میں بار پانے کا، لیکن یہ آرزو دل ہی دل میں پروان
چڑھتی رہی، ملاقات تو ملاقات دیدار تک کی نوبت نہ آئی!

راہ میں وہ ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائیں کیوں؟

مولانا شوکت علی کے آخری دورِ حیات میں مجھے روزنامہ خلافت کی ادارت
تفویض ہوئی ——— اچانک اور بے سان و گمان ———
میں جامعہ ملیہ میں زیرِ تعلیم تھا، گرما کی تعطیل گذارنے بمبئی گیا۔ شوکت علی کی
محبت بھری بڑی بڑی آنکھوں نے کھینچا، اور میں تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے خلافت
ہاؤس اور بمبئی کا ہو کر رہ گیا! ——— بڑی خوشی تھی کہ اب ملک کے
سربرآوردہ زعماء سے ملنے، انھیں دیکھنے اور پرکھنے کے مواقع ملتے رہیں گے۔
سہ پہر کا وقت تھا (غالباً ۳۷ء) خلافت ہاؤس کے وسیع اور دل
کش گراؤنڈ میں مولانا عرفان سکریٹری خلافت کمیٹی سے بیٹھا میں باتیں کر رہا
تھا، ایک دراز قد، وجیہ، اور خوش شمائل شخص دودھ کی سی سفید شیروانی
میں ملبوس، سر پر اونچی دیوار کی ترکی ٹوپی بلند آواز، گورا ——— انگارہ
سا دمکتا اور دہکتا ہوا ——— چہرہ نمودار ہوا، مولانا اسے دیکھ
کر کھڑے ہو گئے، بڑے تپاک سے ملے، اور کہنے لگے، "آج ایک تصویر
دیکھی، اسے دیکھ کر آپ بے ساختہ یاد آئے!" عبدالرحمان نے

عبدالرحمن صدیقی کی یاد

پچھلا پرچہ پریس میں جا چکا تھا کہ عبدالرحمان صدیقی کی وفات کی اطلاع ملی، اس حادثہ نے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا، عبدالرحمان صدیقی کی وفات نے ایک اور گوہر یک دانہ ہم سے چھین لیا، ہمارے دلیں کی گھما گھمی، عروج و ترقی گرم بازاری، اور وقار و شہرت میں پائداری آتی جا رہی ہے، لیکن اس دلیس کے اولین معماروں میں سے جب کوئی اٹھ جاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ جگہ اب کبھی پر نہ ہو گی۔

فروغ شمع تو قائم رہے گا روز محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

عبدالرحمان صدیقی عجیب و غریب دل و دماغ اور عجیب و غریب صلاحیتوں کے آدمی تھے، انھوں نے اپنی طالب علمی کا زمانہ علی گڑھ اور لندن میں گزارا ان کی عملی زندگی کا آغاز بھی لندن اور کلکتہ سے ہوا۔ زندگی کے ہر دور میں عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے وہ بڑے پکے اور کھرے مسلمان ثابت ہوئے۔ وہ علی برادران کے چہیتے تھے، گاندھی جی اور موتی لال نہرو کی محفل میں برابر کے ساتھی بنکر بیٹھتے تھے۔ کوئی اسلامی اور وطنی تحریک ایسی نہیں تھی جس میں انھوں

پریس گیلری میں بیٹھا تھا، اجلاس ختم ہونے کے بعد شوکت صاحب میری طرف سے گزرے اور حسب عادت فرمایا۔ "آؤ جعفری چلو!" میں ان کے ساتھ ہو لیا، پیچھے عبدالرحمان تھے، شوکت صاحب نے اگرچہ قائد اعظم کی قیادت عظمیٰ تسلیم لی تھی لیکن بہرحال وہ شوکت علی تھے، پنڈال سے باہر نکلے تو لوگ ہاتھ چومنے کے لئے ٹوٹ پڑے، عبدالرحمان کچھ دیر تک تو یہ منظر دیکھتے رہے پھر انھوں نے کہا، "آپ تو حجر اسود کی طرح اپنے آپ کو چمواتے رہتے ہیں جاتا ہوں:"

دوسرے روز راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں قیصر باغ پیلس میں مسلم لیگ کونسل جلسہ تھا، میں اگرچہ اس کا ممبر نہ تھا، لیکن شوکت صاحب کے ساتھ ہر جگہ پہنچ جاتا چنانچہ ناخواندہ مہمان کی طرح وہاں بھی موجود تھا، تھوڑی دیر کے بعد عبدالرحمان آئے وہی سفید شیروانی، وہی ترکی ٹوپی، وہی چوڑی دار پاجامہ، وہی بلند بالا قد کی وہی دل آویزی اور دل ربائی، مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھے، سینہ سے لگایا، پیٹھ تھپکتے رہے، کرید کرید کر خلافت ہاؤس اور خلافت کی باتیں پوچھتے رہے، حالانکہ میں اُن سے اور شعیب صاحب سے وفور عقیدت کے باعث ان سے ملنے میں پہل کرنے سے گھبراتا تھا۔

مجلس خلافت کے کمشنر جعفر علی خاں، بھوپال کے رہنے والے تھے، بڑے ملنسار اور خلیق آدمی، اُسی زمانہ میں عبدالرحمان نے ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی بڑی دھوم سے قائم کی تھی، جس کا صدر دفتر کلکتہ تھا، جعفر علی خاں نے مولانا ظفر علی خاں کے توسط اور سفارش سے عبدالرحمان کو آمادہ کر لیا کہ وہ انھیں کلکتہ بلائیں، عبدالرحمان نے کلکتہ سے انھیں تقرری کا پروانہ بھیجا، اور خط میں لکھا "فرمائیے، آپ ہماری کمپنی میں کب سے ایجنٹ کریں گے؟"

قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد عبدالرحمان کراچی آ گئے، اب اُن پر بڑھاپا

پوچھا" کون سی تصویر؟" مولانا کپاؤنڈ سے برآمدہ میں آگئے اور ایک وجیہ
اور بارعب تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا" یہ ——!" عبدالرحمان نے تصویر پر
بیزاری کی ایک نظر ڈالی اور کہا" لاحول ولا قوۃ —— حضرت مولانا
آپ نے میری توہین کی، میں انگریزوں کا پٹھو نہ تھا نہ ہوں، نہ ہو سکتا ہوں!"
اور وہ یہ کہہ کر برآمدہ سے باہر آکر کرسی پر بیٹھ گئے، اور انھوں نے تصویر کے بارے
میں حیرت انگیز، اور "سنسنی خیز" انکشافات شروع کر دیئے ——
وہ تصویر فرماں روائے مصر شاہ فواد کی تھی! ——

مسلم لیگ کا وہ معرکہ آرا اجلاس جس نے آزادی کامل کی تجویز منظور کی لکھنؤ
میں راجہ صاحب محمود آباد کی کوششوں سے منعقد ہوا تھا، اس اجلاس میں لیگ کے
ہند کے چوٹی کے لیڈر شریک تھے، پہلی مرتبہ بنگال کے وزیر اعظم اور شیر بنگال
مولوی فضل الحق نے اس اجلاس میں ایسی گھن گرج کی تقریر کی جس کے بارے
میں کہا جا سکتا ہے کہ

تزلزل در ایوان کسریٰ فتاد!

پہلی مرتبہ اس اجلاس میں سر سکندر حیات خاں بھی اپنے لواحقین کے ساتھ شریک
ہوئے اور انھوں نے برسر عام اعلان کیا کہ آئندہ سے آل انڈیا معاملات
میں وہ قائد اعظم اور مسلم لیگ کی پیروی کریں گے، پنجاب میں مسلم لیگ کے احیا
اور تجدید کی کوشش کریں گے۔ اور یونینسٹ پارٹی کے تمام مسلمان ممبروں کو
مسلم لیگ کا ممبر بنائیں گے، اس اجلاس میں عبدالرحمان صدیقی نے بھی انگریزی
میں ایک معرکہ آرا تقریر "گاندھوی سیاست" پر کی تقریر میں طنز، مزاح، لطیفے
اور واقعات و حقائق کا ایسا دلچسپ امتزاج تھا کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد
ہال تالیوں سے گونج اٹھتا تھا ——

ایسٹ پاکستان کے قائم مقام گورنر بنے، مدت پوری کرنے کے بعد کلکتہ پہنچے، وہاں دفعتہً علیل ہو گئے، یہی بیماری مرض الموت ثابت ہوئی۔

وفات سے چند دن پیشتر جناح ہسپتال میں عیادت کو گیا، آواز کی کڑک اب تک قائم تھی لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا آفتاب لب بام ہے، بیماری کا زیادہ اثر دماغ پر تھا، اس حالت میں بھی ذہن کام کرتا رہتا تھا، شعیب صاحب سے عبدالرحمان کو عشق تھا، ایسی سچی دوستی اور محبت کی مثال اس دنیا میں کم ملے گی اب بھی اگر کسی کو بے ساختہ وہ یاد کر رہے تھے تو وہ شعیب صاحب تھے، کہنے لگے، "ہر طرح کا آرام ہے، لیکن شعیب ہوتا تو بات ہی اور تھی!" ——— شعیب صاحب کچھ روز بعد مستقل طور پر کراچی تشریف لے آئے، یقیناً عبدالرحمان کو بڑی خوشی ہوئی ہوگی لیکن،

دیکھا وقت نزع روئے دل آرام کو
عید ہوئی ذوق وے شام کو!

(۶ جولائی ۱۹۵۳ء)

طاری ہو چکا تھا، کہاں وہ دم خم کہ اپنے صرف سے، مصر، شام، عراق، فلسطین، حجاز، لندن، پیرس، امریکہ، نہ جانے کہاں کہاں گھوم آئے اور مسلمانانِ ہند کی بے مزد و صلہ ترجمانی کرتے رہے، اور کہاں یہ عالم کہ پاؤں توڑ کر کراچی کے ایک گوشہ میں چپ چاپ بیٹھ گئے ——— نہ تقریر نہ بیان!

ایک روز میں چودھری خلیق الزماں کی خدمت میں حاضر ہوا، چودھری صاحب کی باتوں میں وہ رس ہوتا ہے کہ اگر وہ کوئی بات چھیڑ دیں تو پھر یہی جی چاہتا ہے کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!

وہ اپنی پچھلی زندگی کے دلچسپ، سبق آموز، معرکہ آرا، اور نہایت اہم واقعات بیان کر رہے تھے، اور میں محویت کے عالم میں سن رہا تھا گفتگو جب شروع ہوئی تو چار بجے تھے اور اب مغرب کا وقت ہو چلا تھا، اتنے میں دیکھتا کیا ہوں عبدالرحمان آ رہے ہیں ——— ذرا سے تصرف کے ساتھ

بھولتا ہی نہیں عالم تری رعنائی کا!

وہ بھی شریک گفتگو ہو گئے، اتنے میں چودھری صاحب نماز کے لئے اٹھے، اب ہم دونوں میں باتیں شروع ہو گئیں، میں نے کہا آپ نے خاموشی کیوں اختیار کر لی ہے، فرمایا کیا کروں؟ نہ جیب میں روپیہ ہے نہ حلق میں طاقت اس وقت یہی انہی دونوں چیزوں کا چلن ہے!" پھر بڑی شفقت کے ساتھ فرمایا "کبھی فرصت ملے تو آجایا کرو!" لیکن وہ اتنی دور رہتے تھے کہ فرصت کے باوجود قیام گاہ پر جانے کی کبھی ہمت نہیں پڑی، کچھ عرصہ بعد وہ اردو کالج کے سکریٹری ہو گئے، اکثر انجمن ترقی اردو کے دفتر تشریف لاتے، کبھی کبھی میں بھی پہنچ جاتا پھر وہ آغا خاں سے لے کر سر سکندر حیات تک کی ایسی "ہوش ربا" تاریخ سناتے ——— کہ بس کچھ نہ پوچھئے!"

میں نے انھیں بھجوادی ۔ کچھ عرصہ بعد وہ کراچی تشریف لائے ۔ کتب خانہ تاج آفس کا میں نگراں تھا ۔ وہاں پہنچے مگر اتفاق سے میں موجود نہ تھا ۔ کارڈ چھوڑ آئے ۔ دوسرے دن میں غنی صاحب کے مکان پر پہنچا ۔ بہت تپاک اور گرم جوشی سے ملے ۔ اور بغیر کسی تمہید کے مجھے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کا فیلو بننے کی دعوت دی ۔ بعض وجوہ سے میں کراچی کی اقامت ترک نہیں کرنا چاہتا تھا ۔ ازراہِ عنایت انھوں نے یہ منظور کر لیا کہ کراچی میں رہ کر میں ادارہ کے لئے ایک کتاب لکھوں جس کا معقول معاوضہ وہ دیں گے ۔ میں نے یہ پیش کش منظور کر لی ۔ "اسلام اور رواداری" کے نام سے ایک کتاب کا آغاز کر دیا جتنا حصہ ہوتا جاتا تھا ۔ وہ بذریعہ ڈاک بھیجا جاتا تھا ۔ نومبر ۱۹۵۲ء میں کتاب ختم ہو گئی میں ایک کام سے لاہور آیا ۔ معاوضہ وصول کرنے دفتر پہنچا ۔ جس کی ادائیگی کا انھوں نے فوراً حکم صادر فرمادیا ۔ اور پھر اپنی پیش کش دہرائی ۔ میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا ۔

ادارہ میں شریک ہونے کے بعد مجھے خلیفہ صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ۔ ادارہ میں آنے سے پہلے میں ان کی قابلیت سے مرعوب تھا ۔ یہاں آکر ان کی انسانیت نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا ۔ وہ بہت بڑے فلسفی تھے ، بہت بڑے مفکر تھے بہت بڑے انشا پرداز تھے ۔ علم کلام کے رمز آشنا ، تصوّف اسلامی کے پرستار ، اقبالیات کے ماہر ، حافظ کے معتقد ، مثنوی کے شارح ، نقاد ، بذلہ سنج ، سخن فہم ، نکتہ بیں ، اور نہ جانے کیا کیا ؟ لیکن ان تمام چیزوں میں وہ یکتا نہ تھے ۔ فلسفی اور بھی تھے ۔ انشا پردازوں کی کمی بھی نہ تھی ۔ اقبالیات سے شغف رکھنے والے بھی کافی تھے ۔ مثنوی کی ترجمانی بھی بڑی قابلیت کے ساتھ کئی لوگ کر چکے تھے ۔ بیشک ان چیزوں میں خلیفہ صاحب درجۂ اختصاص پر فائز تھے ۔ لیکن منفرد نہ تھے ۔ جس بات نے ان کو منفرد بنا دیا وہ تھا ان کا مقامِ انسانیت ۔

ہم لوگوں میں وہ اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ کسی طرح کا امتیاز و تفوق اپنے

خلیفہ صاحب!

"وہ جس کی یاد، دل سے بھلائی نہ جائیگی"

۱۹۵۵ء میں خلیفہ صاحب سے میری پہلی ملاقات ان کے بھائی خواجہ عبدالغنی صاحب کے مکان پر کراچی میں ہوئی۔ وہ حجاز مقدس سے واپس تشریف لائے تھے اور اپنے ساتھ ابن سعود کے دیئے ہوئے تحائف کا ایک انبار بھی لائے تھے، مرصع خنجر، زر کار عبا، مطلاّ عقال اور بہت سی دوسری چیزیں۔ یہ سب چیزیں میز پر رکھی تھیں وہ اپنے ملنے والوں کو تاثرات سفر کے ساتھ ساتھ ان چیزوں سے بھی متعارف کراتے جاتے تھے۔ کوئی نصف گھنٹہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر لوگ منتشر ہونا شروع ہو گئے۔ اب خلیفہ صاحب نے مجھ سے گفتگو شروع کی۔ میری دو کتابیں "دید و شنید" اور "تاریخ تصوف اسلام" کا وہ مطالعہ کر چکے تھے۔ کچھ دیر ان پر ۔میں نے اپنی ایک اور کتاب "روایات آغانی" کا ذکر کیا۔ جسے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ اس کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ دوسرے دن دو کتاب

موضوع بحث نہیں بنایا ۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے۔ حکومت کے قائم کردہ میرج کمیشن کا اجلاس ادارہ میں ہورہا تھا۔ سر عبدالرشید صدر تھے۔ خلیفہ صاحب سیکریٹری۔ بیگم شاہنواز اور بیگم جی احمد بھی ممبر کی حیثیت سے شریک مجلس تھیں۔ کبھی کبھی خلیفہ صاحب ہم لوگوں کو بھی شریک بحث کر لیا کرتے تھے۔ اس روز بھی ہم سب موجود تھے۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا اسلام میں یہ جائز ہے کہ ایک مسلمان کسی کتابی عورت سے شادی کرلے۔ لیکن کوئی مسلمان عورت کسی کتابی مرد سے نکاح نہیں کرسکتی ـــــ کیوں؟

کسی صاحب نے بتایا قرآن میں تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔

خلیفہ صاحب کو یہ جواب پسند نہیں آیا۔ انھوں نے فرمایا اسلام نے جو حقوق عورتوں کو دیئے ہیں ایک عیسائی یا یہودی عورت مسلمان کی بیوی بن کر وہ سب حاصل کرلیتی ہے۔ اگر ایک مسلمان عورت کسی عیسائی یا یہودی سے شادی کرے تو وہ ان تمام حقوق سے محروم ہوجائے گی۔ گویا دوسرے الفاظ میں ایک کتابی عورت مسلمان کے گھر میں آکر وہ سب کچھ پالیتی ہے۔ جو اس کا مذہب اسے نہیں دے سکا تھا۔ اور ایک مسلمان عورت یہودی یا عیسائی کے گھر میں جاکر ان تمام حقوق و مراعات سے محروم ہوجاتی ہے جو اسلام نے اسے دیئے تھے۔ کیا یہ کوئی معمولی فرق ہے؟

اس جواب نے فضا بدل دی۔

خلیفہ صاحب کو اکثر غیر ممالک سے لیکچر دینے کی دعوتیں ملتی رہتی تھیں۔ اور وہ انھیں قبول بھی کرلیتے تھے۔ ایک مرتبہ امریکہ سے واپسی پر لندن ٹھہرے وہاں نہ جانے کیا جی میں آئی کہ وطن واپس آنے کے بجائے اسپین چلے گئے

قریب نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ پندار اور نخوت کا مظاہرہ اگر کرنا بھی چاہتے تو نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات ان کی فطرت سے بعید تھی۔ سب سے بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ اپنی کہتے تھے اور کہتے رہتے تھے۔ لیکن دوسرے کی بھی سنتے تھے۔ اور اگر بات سمجھ میں آجاتی تو مان بھی لیتے تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے۔ ادارہ کے لان پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں سردی کا موسم تھا۔ دھوپ میں مجلس جمی اور باتیں شروع ہوگئیں۔ مختلف مسائل زیر بحث آئے۔ کچھ سوچتے ہوئے خلیفہ صاحب نے کہا۔

شراب کی حرمت کا سبب یہ ہے کہ اس سے نشہ پیدا ہوتا ہے۔ آدمی بک جاتا ہے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے لیکن اگر شراب اتنی پی جائے کہ نشہ نہ ہو تب تو شراب حرام نہیں ہونی چاہئے۔ انھوں نے چاہا اس پر تحقیق کی جائے چنانچہ معلوم ہوا امام محمد کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر نشہ نہ ہو تو پھر حرام نہیں ہے۔

یہ سن کر خلیفہ صاحب خوش ہوئے۔ میں نے عرض کیا یہ امام محمد کا فتویٰ یعنی قول ہے اور مفتی بہ نہیں ہے۔

بشیر احمد صاحب ڈار میرے پاس بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا مفتی بہ کی تعریف کیجیے۔ میں نے عرض کیا امام ابوحنیفہ کی مجلس میں ان کے کبار تلامذہ امام ابو یوسف امام محمد امام زفر وغیرہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے تھے۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے کا اپنی بصیرت کے مطابق اظہار کرتا تھا۔ پھر بحث مباحثہ کے بعد ایک قول پر یا اتفاق آرا ہو جاتا تھا یا کثرت رائے دونوں صورتوں میں یہ آخری قول مفتیٰ بہ مانا جاتا ہے اور فقہائے امت اسی پر فتویٰ دیتے ہیں۔ دوسرے اقوال ساقط ہو جاتے ہیں۔ ان سے حجت اور سند نہیں لائی جاتی۔

یہ سن کر خلیفہ صاحب خاموش ہو گئے اور پھر کبھی اس مسئلہ کو اٹھایا

خلیفہ صاحب نہ صرف خود دھوپ کی تیزی اور شدت کے باوجود نمازِ جنازہ میں شریک ہوئے ۔ بلکہ رفقائے ادارہ کو بھی دعوت دی کہ جو چلنا چاہے چلے ۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دل انسانی ہمدردی سے کتنا معمور تھا ۔

خلیفہ صاحب کو اپنی اولاد سے غیر معمولی محبت تھی۔ ان کی صاحبزادی۔ایم اے کی تکمیل کے بعد مزید تعلیم کے لئے امریکہ بھی جا چکی ہیں۔ فلسفہ سے دلچسپی وراثت میں پائی ہے ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے تھے۔ایک مرتبہ امریکہ جانے لگے تو فرمایا اس بہانے عارف سے ملاقات ہو جائے گی۔بہت دنوں سے اسے نہیں دیکھا۔ واپس آئے تو ایک موڑا اپنے ساتھ لائے ۔کہنے لگے روپے کم پڑ گئے تھے ۔عارف نے جو کچھ جمع کیا تھا سامنے رکھ دیا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ عارف صاحب امریکہ سے واپس آ جائیں اور یہیں رہیں ۔ باپ کی آنکھوں کے سامنے ماں کی آغوشِ محبت میں ۔لیکن انھوں نے کبھی اصرار نہیں کیا وہ چاہتے تھے کہ عارف صاحب خود ہی فیصلہ کریں ۔اپنا فیصلہ ان پر عائد کرنا منظور نہ تھا ۔

بزرگوں سے بھی عقیدت رکھتے تھے حضرت غوث علی شاہ صاحب سے بہت متاثر تھے ۔ تذکرہ غوثیہ کے اکثر واقعات جو حضرت صاحب کی کرامات اور خرقِ عادات پر مبنی تھے ۔جزم و یقین کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے ۔ راولپنڈی کے کوئی مجذوب تھے ان سے بھی بہت متاثر تھے ۔ مری جاتے آتے وقت اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ۔ اور ان کے کشف و کرامات کے واقعات بیان کرتے ۔ ایک مرتبہ کہنے لگے ۔میں اپنی لڑکی کے ساتھ ملنے گیا ۔لڑکی کو دیکھتے ہی مجذوب نے مسکرا کر فرمایا اس کی شادی اس کی ماسی کے لڑکے سے ہو رہی ہے ۔ خلیفہ صاحب کہتے تھے یہ بات سن کر میں بہت متعجب ہوا کیونکہ واقعی اس

جہاں جاکر اقبالؒ نے کہا تھا

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

خلیفہ صاحب نے اس دیس کی خوب سیر کی۔ قرطبہ دیکھا، غرناطہ گئے۔ الحمرا کی زیارت کی۔ جامع قرطبہ میں نماز پڑھی۔ وہاں سے ایک خط رفقائے ادارہ کے نام لکھا۔ جس میں اپنی اس سیاحت کا چند سطروں میں ذکر کرنے کے بعد لکھا۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی!

ان چند الفاظ میں خلیفہ صاحب نے پورا سفر نامہ لکھ ڈالا —— جذبات سے بھرپور۔

اپنے نجی ملازمین کے ساتھ یا دفتر کے چپراسیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بے انتہا شفقت اور عنایت کا تھا۔ عام طور پر صبح اٹھنے کے بعد اپنی کوٹھی کے لان میں آکر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ وہیں اخبارات وغیرہ کا مطالعہ کرتے تھے۔ ملازم کو ہر روز ان کے بیدار ہونے سے پہلے کرسی لے جاکر وہاں بچھانی پڑتی تھی۔ لیکن خلیفہ صاحب اسے برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے لکڑی کے چند تختے ایک بنچ کی طرح بنوا کر وہاں رکھوا دیئے۔ تاکہ کرسی لانے اور لیجانے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ آئے اور بیٹھ گئے۔

دفتر کا ایک ملازم حمید اللہ چونکہ مہاجر تھا۔ لہٰذا اسے رہنے کے لئے انھوں نے اپنے گھر میں جگہ دیدی۔ ہمیشہ اس کے دکھ سکھ میں شریک رہے۔ اس کی بیوی بیمار پڑی تو جو کچھ ہوسکا کیا۔ پھر اس کا انتقال ہوگیا۔

مولانا شوکت علی اور سر اکبر خان

ایک دلچسپ اور یادگار واقعہ

ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کا سلسلہ جاری تھا۔ کانگرس کی طرف سے بابو راجندر پرشاد جو اب جمہوریہ ہند کے صدر ہیں۔ مہا سبھا کی طرف سے پنڈت مدن موہن مالوی۔ مجلس خلافت کی طرف سے مولانا شوکت مسلم کانفرنس کی طرف سے علامہ اقبال، مولوی شفیع داؤدی، سر شفاعت احمد اور بہت سے لوگ بار بار سر جوڑ کر بیٹھتے تھے۔ لیکن دل جوڑنے کا کوئی سامان نہ دیکھ کر مایوسی اور بددلی کے عالم میں رختِ سفر باندھ کر پھر جہاں سے آئے تھے وہاں روانہ ہو جاتے تھے۔

کوشش سب کی یہ تھی کہ ہندو مسلم نزاع کا خاتمہ ہو جائے۔ سب کے حلقوم و گلو سے پوری شدت کے ساتھ ایک ہی نعرہ نکلتا تھا کہ بغیر ہندو مسلم اتحاد کے ہندوستان کی آزادی ناممکن ہے۔ لیکن جب تفصیلات طے کرنے کا وقت آتا تھا، قرارداد مفاہمت کے مختلف پہلو زیر بحث آتے تھے۔ دل جوڑنے

کی شادی اس کے خالہ زاد بھائی سے طے ہو چکی تھی ۔ اپنی ایک اور عزیزہ کا قصہ بیان کرتے تھے کہ ان کے شوہر نے جس کام میں ہاتھ ڈالا ناکام ہوئے ۔ وہ ان مجذوب صاحب کے پاس گئیں دیکھتے ہی آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور کہا دروازے بند ہیں ہم کچھ نہیں کر سکتے ۔

خلیفہ صاحب کو اُردو زبان سے اتنا شغف تھا کہ ان کے گھر کی زبان اردو ہی تھی ۔ ایک مرتبہ غالباً ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے کہ میں اور حنیف صاحب مری گئے خلیفہ صاحب نے ایک بنگلہ کرایہ پر لے رکھا تھا ۔ جہاں اپنی بیگم اور صاحبزادی کے ساتھ مقیم تھے ۔ قریب ہی ہوٹل سنٹرل تھا ۔ جہاں ہم دونوں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ سہ پہر کو دوسرے ، تیسرے دن وہاں چلے جاتے ۔ ایک دفعہ ہم لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ان کی ننھی سی نواسی کھیلتی ہوئی آئی ۔ خلیفہ صاحب نے اسے گود میں لے لیا اور چائے پلانے لگے ۔ پھر فرمایا آج اس کی آیا کی شامت آگئی تھی ۔ قریب تھا کہ اس کی ماں اسے نکال دیتی ۔ میں نے پوچھا کیوں ۔ فرمایا آج اس لڑکی کے منہ سے پنجابی کا ایک لفظ نکل گیا تھا ۔ جس سے اس کی ماں برافروختہ ہوگئی کہ یہ آیا تو اس بچی کی زبان بگاڑ دے گی ۔

بہت سی باتیں ہیں لیکن اس مختصر سی مجلس میں تفصیل کا موقع کہاں ؟
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ثقافت ۱۹۶۶ء

ے آگے نہ بڑھ سکی، تو ان کی دِل گرفتگی اور بڑھ گئی، سرحد کے ایثار پیشہ، اور فدائے
ت قومی کارکن مسٹر اللہ بخش یوسفی ان کے پاس بیٹھے تھے۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں
ہی تھیں۔ اتنے میں ہوتی ضلع مردان (سرحد) کے نواب سر محمد اکبر خان شوکت صاحب
ے نے تشریف لائے، اور باتیں شروع ہوگئیں، نواب سر اکبر خان عجیب وغریب
مان کے آدمی تھے۔ ڈیل ڈول کے اعتبار سے شوکت صاحب کے حریف دولت و
ت کے اعتبار سے "لاشریک"! علم وفضل کے اعتبار سے، ایک عالم اور مورخ داد
ی کے اعتبار سے، یکسر "سخن درانیست"۔ ان کی دولت فراواں سے آس لگا کر بہت
لوگ ان کے آستانہ پر پہنچتے تھے، اور دست سوال دراز کرتے تھے۔ نواب
حب کسی سے انکار نہیں کرتے تھے، بے تأمل جتنی رقم کا مناسب سمجھتے تھے چیک
کر دے دیتے تھے، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ چیک واپس آجاتا تھا تھا۔ لیکن
ب صاحب سے بار بار ملنا آسان تو تھا نہیں، لہٰذا چیک واپس آنے کے
ندوہ بہ نیرنگ، اور یادگار کی صورت اختیار کر لیتا تھا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

باتوں باتوں میں، شوکت صاحب نے اپنے فن کا استعمال شروع
دیا، شوکت صاحب کا فن یہ تھا کہ وہ چندہ جس سے چاہتے تھے وصول کر لیتے
خواہ وہ مل کا مزدور ہو، یا کسی تعلقہ کا مالک، وہ اس طرح دل میں بیٹھ کر
حسان کرتے تھے کہ مجال انکار رہتی ہی نہیں تھی، شوکت صاحب
نی بڑی بڑی اور دلفریب آنکھوں سے نواب صاحب کو دیکھا اور کہا
لے تللے اور عیش کی زندگی بسر کرتے ہو، ہم ٹھہرے قوم کے بھکاری، فاقہ
لیتے ہیں، روکھی، سوکھی بھی کھا لیتے ہیں اور مگن رہتے ہیں (یوسفی صاحب
اشارہ کر کے) لیکن یہ لوگ ابھی پختہ نہیں خام ہیں، ان کے لئے بھی تو
چاہیئے۔ یہ قوم کی خدمت بھی کریں اور فاقے بھی کریں، یہ نہیں ہو سکتا

اختلافات رفع کرتے اور رفق و محبّت سے زندگی بسر کرنے کا سوال پیدا ہوتا تھا۔ تو سب کی رائیں مختلف ہو جاتی تھیں۔ ہر شخص کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ میری بات مان لی جائے۔ لینے پر سب تیار تھے۔ کھونے پر کوئی آمادہ نہیں تھا۔ دستِ طلب سب کا دراز تھا۔ جیب و دامن خالی کرنے پر کوئی آمادہ نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پرزور اور دھواں دھار تقریروں کے بعد،

گلشن میں کہیں بوئے دم ساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی!

دہلی میں خدا غریقِ رحمت کرے۔ ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی قومی کارکنوں اور لیڈروں کا مستقل مہمان خانہ تھی۔ یہ ایسا کارواں سرائے تھا۔ جہاں ہر شخص بے تامّل اور بے تکلف ٹھہر سکتا ہے۔ گاندھی جی ہوں یا موتی لال، شعیب قریشی ہوں یا جواہر لال، ابوالکلام آزاد ہوں، یا پنڈت مالوی، خلیق الزماں، تصدق احمد خان شروانی، عبدالرحمٰن صدیقی اور رفیع احمد قدوائی ہوں یا ذوالفقار علی خاں، راجہ صاحب سلیم پور، یا مسٹر فضل الحق مسلک و مشرب کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ جس کا جی چاہے جب تک چاہے چلا آئے۔ ڈاکٹر انصاری کا حسنِ اخلاق اور جذبہ مہمان نوازی ہمہ وقت خدمت گزاری کے لئے موجود تھا۔

اس طرح کی ایک نجی کانفرنس ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر کئی روز تک منعقد ہوتی رہی، اور بغیر کسی نتیجہ پر پہنچے ختم ہو گئی، مولانا شوکت علی اگرچہ مجلس خلافت کی زبوں حالی کے باعث بہت دل گرفتہ اور متعرض تھے، تاہم وہ بھی اس کی کانفرنس میں شریک ہوئے، اور حسبِ یہ

نشستند و گفتند و برخاستند!

پرویز صاحب کا "نظامِ ربوبیت"

اس نام سے پرویز صاحب کا ایک صحیفہ شائع ہو چکا ہے۔ جس میں زندگی کے [مسائل] حل کئے گئے ہیں۔ روح و شکم کا قضیہ دیرینہ طے کیا گیا ہے۔ بدن و جان کی [دو]ئی کا نسخہ تجویز کیا گیا ہے۔ اور یہ سب کچھ دن دہاڑے قرآن کریم کی روشنی میں کیا گیا ہے [اور] اقبال کا یہ شعر حقیقت بن کر نظر کے سامنے آگیا ہے۔

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر!
تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پازند

حقیقت یہ ہے کہ پرویز صاحب اور ان کے ہم خیال اصحاب نے فواتر، اور تسلسل [کے] ساتھ "مزاج شناس قرآن" بننے کی جو سعی نارو اکر رکھی ہے۔ وہ اب "ناقابل [بردا]شت" ہوتی جاتی ہے۔ قرآن کی منزل ادب و لٹریچر کی منزل نہیں ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ۔

نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

لیکن میں نے غلطی کی، پرویز صاحب جنیدؒ کے قائل ہی کب ہیں؟

دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

پرویز صاحب کا اصولِ قرآن فہمی یہ ہے کہ جو کچھ وہ فرمادیں وہی قرآن ہے، وہی [اس کی تف]سیر ہے، وہی اس کی تعبیر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ پرویز صاحب کو تو کوئی کچھ نہیں

ان سے تم ایک ہی کام لے سکتے ہو، یا فاقہ کرالو، یا کام لے لو، نواب صاحب خاموشی سے شوکت صاحب کی باتیں سنتے رہے۔ پھر جیب سے چیک بک نکالی اور ایک معقول رقم کا چیک نہایت ادب اور تواضع کے ساتھ پیش کردیا شوکت صاحب نے بغیر شکریہ ادا کئے چیک جیب میں رکھا اور مجلس برخاست کردی کیونکہ انھیں کہیں جانا تھا۔ نواب صاحب رخصت ہو کر چلے گئے، ان کے جانے کے بعد یوسفی صاحب نے کہا۔

دیکھ لیجئے گا، چیک واپس آجائے گا۔

شوکت صاحب نے گرج کر کہا۔

"نہیں، ــــ واپس نہیں آئے گا!

بات ختم ہوگئی! ــــ دوسرے روز شوکت صاحب نے یوسفی صاحب کو چیک کیش کرانے کے لئے بھیجا، وہ خوش خوش بنک گئے، انھیں کامل یقین تھا، چیک کیش نہیں ہوگا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ آئے تو چہرہ اترا ہوا تھا۔

چیک کیش ہوگیا تھا!

اس اصول پر پرویز صاحب تو مطمئن ہو سکتے ہیں ؟ جواب ظاہر ہے کہ نفی میں ہے۔ پرویز صاحب اور ان کے مخالفین میں کشمکش یہاں سے شروع ہوتی ہے۔

اس کتاب میں پرویز صاحب نے روح و شکم کے مسائل از روئے قرآن حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر انھوں نے قرآن کو بیچ سے نکال دیا ہوتا۔ اور ان خیالات کو اپنے ذہن و دماغ کے شاہکار کی حیثیت سے پیش کیا ہوتا۔ تو کوئی شبہ نہیں یہ افکار دلچسپ بھی تھے۔ قابل غور بھی اور لائق مطالعہ بھی۔ ان کے خیالات کلی یا جزوی طور پر قابل قبول ہوں یا نہ ہوں، یہ بالکل دوسری بات ہے۔ لیکن اگر ان میں جذب ہو تنوع ہو۔ رنگا رنگی ہو۔ حسن بیان ہو، لطف زبان ہو، ذہانت کی جلوہ آرائی ہو، طبع رسا کی بلند پروازی ہو۔ تو ان سے دلچسپی ضرور پیدا ہوتی ہے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اگر یہ صورت ہوتی، تو اس کتاب کی افادیت بڑھ جاتی۔ اور نوعیت بدل جاتی۔ لیکن بدقسمتی سے صورت حال یہ نہیں ــــ پرویز صاحب "مزاج شناس قرآن" بن کر نمودار ہوئے ہیں۔

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
دوسری پڑ گئی، اللہ یہ سر پہ کیسی؟

مودودی صاحب اور پرویز صاحب میں ایک بہت دلچسپ فرق بھی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ مودودی صاحب رائے غلط قائم کریں۔ کسی تعبیر میں ٹھوکر کھا جائیں۔ لیکن بہر حال ان کے صاحب علم ہونے میں شبہ نہیں پرویز صاحب کی ستم ظریفی یہ ہے کہ عربی بالکل نہیں جانتے صحیح عبارت پڑھ سکتے ہیں، نہ بول سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کے یکتا شارح بے مثال مفسر ہیں۔ ان کے سامنے رازی ہیچ اور زمخشری بیکار۔

کہتا۔ لیکن ان کے ہم نام اور ہم وطن مرزا غلام احمد صاحب مطعون ہو گئے۔ مرزا صاحب سے اگر کسی موقع پر ہمدردی پیدا ہوتی ہے تو وہ بھی موقع ہے۔ اور ماننا پڑتا ہے ان کی بدنامی اور پرویز صاحب کی "کم نامی" خوبی تقدیر کا کرشمہ ہے۔ ورنہ جہاں تک جرم کا تعلق ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کو مخاطب کرکے کہہ سکتے ہیں۔

ہم تو مرشد تھے تم ولی نکلے۔

قرآن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ صحابہ کرام نے جیسا اور جہاں ضرورت سمجھی، صاحبِ وحی سے اپنی مشکلات رفع کیں۔ انہیں معلوم تھا کہ کون آیت کب نازل ہوئی؟ کیوں نازل ہوئی؟ اس کے اثرات و نتائج کیا ہوئے؟ ان آیاتِ کریمہ کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقدام و عمل کا پروگرام کس طرح ترتیب دیا؟ کسی نے کچھ پوچھا۔ تو آپ نے جواب کیا دیا؟ غرض قرآن فہمی کے سلسلہ میں صحابہ رضہ کا کوئی حریف نہیں ہوسکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی اس کا شارح اور مفسر نہیں ہوسکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہ تھے جن پر قرآن نازل ہوا تھا صحابہ کرام وہ تھے جنکے سامنے قرآن نازل ہوا تھا اور جنھوں نے اسکی تشریح و تعبیر کا علم براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا تھا، فہم عامہ (کامن سنس) کا تقاضا یہ ہے کہ تفسیر و تعبیر قرآن کے سلسلہ میں صحابہ کرام کی رائے کو حرف آخر مانا جائے۔ لیکن پرویز صاحب روایات کے منکر ہیں۔ حالانکہ قرآن بھی روایات ہی کے ذریعہ پہنچا ہے۔ —— اس لئے وہ صدر اول کی کسی تفسیر کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں، اس موقع پر قدرۃً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قرآن سمجھا کس طرح جائے۔ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ یعنی پرویز صاحب کی خدمات حاضر ہیں۔

قصہ کوتہ گشت ورنہ دردِ سر بسیار بود

القیّم۔ خداوندی،

قیم" کا ترجمہ "محکم" اور "متوازن" تو خیر، لیکن "دین" کا ترجمہ "نظام ربوبیت خداوندی"
کسی کو ابھی آج تک نہ سوجھا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا۔ اور
ت سے نئے لفظ، اردو زبان کو دیے۔ مثلاً "استحصال بالجبر" "مرافعہ، استغاثہ،
وغیرہ۔ نیز بھک سے اڑ جانے والا مادہ" بھی انہی کا ترجمہ ہے۔ جس کی اب تک
تحسین کی جاتی ہے لیکن اگر ڈپٹی صاحب پرویز صاحب کے سامنے زانوئے شاگردی تہ
کرتے تو بلاشبہ یا تو خود "بھک سے اڑ جانے والا مادہ" بن جاتے یا پرویز صاحب
کو بنا دیتے۔

پرویز صاحب کا ایک شاہکار ترجمہ اور ملاحظہ فرمائیے۔

یوم یقوم الناس	تمام نوع انسانی خدا کی ربوبیت عامہ
لرب العالمین ۸۳	کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی —

ہے اس ترجمہ کا کوئی جواب؟

اب ایک نمونہ اور پیش کر کے ہم ترجمہ کی گفتگو ختم کر دیں گے :-

قد خسر الذین کذبوا	یہ جماعت جو سمجھے بیٹھی تھی کہ خدا کے قانون
بلقاء اللہ حتی اذا جاء	سے ان کا کبھی آمنا سامنا (ٹکراؤ) ہی نہیں
تھم الساعۃ بغتۃ	ہوگا۔ تباہ ہو کر رہے گی۔ حتیٰ کہ جب
قالوا یاحسرتنا علیٰ	انقلاب کی گھڑی دفعتۃً نمودار ہو جائے گی۔
ما فرطنا فیھا وھم	تو وہ کف افسوس ملکر کہیں گے۔ کہ اس باب
یحملون اوزارھم	میں جو کچھ ہماری طرف سے ہوتا رہا۔ اس پر
علیٰ ظھورھم الا سا	ہمیں ندامت ہے لیکن ان کی یہ پشیمانی اس
ء ما یزرون۔ وما	وقت ہوئی۔ جب ان کے اعمال اپنا نتیجہ مرتب

اب عربی دانی زیر بحث آگئی ہے تو اس کا ثبوت بھی دینا چاہیے۔ ثبوت کا ریکارڈ جمع کیا جائے، تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو جائے، لہذا مشتے نمونہ از خروارے، پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ صفحہ ۲۶۸ لیجئے۔ اور ایک قرآنی آیت کا پرویزی ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

من یعمل سوءً یجز بہ
ولا یجد لہ من دون
اللہ ولیّا ولا نصیرًا

جو قوم بھی ناہمواریاں پیدا کرنے والا پروگرام اختیار کرے گی وہ اس کا نتیجہ بھگتے گی خدا کے قانون کے مطابق نہ اس کا کوئی حامی ہوگا نہ سرپرست۔

۴/۱۲۳

آپ یہ کہہ سکتے ہیں شاہ عبدالقادر سے لے کر مولانا اشرف علی تک بلکہ ڈپٹی نذیر احمد تک کسی نے اس آیت کا یہ ترجمہ نہیں کیا۔ لیکن اس کی ذمہ داری پرویز صاحب پر تو عاید نہیں ہوتی، جو شخص مزاج شناس قرآن نہ ہو اور ترجمہ کرنے بیٹھ جائے، اس کا ترجمہ لازمی طور پر پرویز صاحب سے مختلف ہوگا۔ اور ملاحظہ فرمایئے۔

ومن احسن
دینا ممن اسلم
وجہہ للہ وھو محسن

اس سے بہتر نظام زندگی اور کس قوم کا ہوگا جو قانون خداوندی کے سامنے جھک جائے اور توازن بدوش پروگرام کو اپنا دستور عمل بنالے۔

۴/۱۲۴

اس ترجمہ کی ندرت کے دفاع میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا عبدالقادر، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا احمد رضا خاں بریلوی ڈپٹی نذیر احمد، مولانا اشرف علی وغیرہ کے زمانہ میں "توازن بدوش" کا رواج ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ حادثہ صرف پرویز صاحب کے حصہ میں لکھی تھی۔ سو انہیں حاصل ہو گئی۔

اور دیکھیے:-

وخالف الذین

یہ ہیں محکم اور متوازن نظام ربوبیت

(یہی مزاج شناس کے ذمہ رہا ہیں، کتنا بڑا فرق ہے دونوں میں!

چنانچہ قرآن کی جو اصطلاحیں قرآن میں نہیں مل سکتیں ان کی تفصیل مزاج شناس (قرآن) یوں پیش کرتا ہے۔ د سب کی گنجائش کہاں سے لائی جائے من چند پر (اکتفا) کیجیے،

— رب: خدا کا قانون ربوبیت جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔

گویا رب سے معنی رب نہیں "قانون ربوبیت" ہیں۔

— ربوبیت:۔ کسی شے کا کامل نشوونما پا کر اپنی اپنی تکمیل تک پہنچ جانا،

یعنی اس کی تعمیری صلاحیتوں کا پورے طور پر نشوونما پا جانا

یعنی ربوبیت کا رب سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں۔

— حق ۔ کسی عمل کا تعمیری پہلو، جو محسوس نتائج کی شکل میں سامنے آ جائے اور اپنی جگہ پر اٹل رہے۔

یعنی پرویز صاحب خود حق ہیں۔

— باطل۔ کسی عمل کا تخریبی پہلو جو منفی نتائج پیدا کرے۔

یعنی جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب؟

— سماء۔ خدا کا کائناتی قانون کہ —

یعنی ایسا قانون جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہر چند کہیں کہ ہے — نہیں ہے۔

— فضل۔ معاشی خوشحالی، ———— یعنی ————

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

— تقویٰ۔ معاشی پروگرام کو مستقل اقدار کے ساتھ ہم آہنگ رکھنا اور اس طرح فرد اور معاشرہ کو خوف اور حزن سے محفوظ کر لینا۔

الحیوٰۃ الدنیا الا لعب ولھو وللدار — کر چکے تھے ان کے اعمال کس قدر تباہ کن
الآخرۃ خیر للذین یتقون افلا تعقلون — پیدا کرنے والے تھے۔

"اس وقت وہ دیکھیں گے۔ کہ ذاتی مفاد پرستی کا نظریہٗ زندگی، کس طرح بچوں کا کھیل اور سعی لاحاصل تھا، اسکے برعکس جن لوگوں نے اپنی جدوجہد کو خدا کے قانون ربوبیت سے ہم آہنگ رکھا، انکے مستقبل کی نئی زندگی کس قدر منفعت بخش ثابت ہوئی"، اے کاش یہ لوگ

اگر آپ نے لفظ و معنی میں رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی، تو ناکام رہیں گے، اس لئے آپ کی طرح ہر ظاہر بین صرف یہی سوچتا ہے۔ کہ کس لفظ کے کیا معنی ہوئے؛ اس سے زیادہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتا، یہ کام صرف مزاج شناس کا ہوتا ہے کہ کس لفظ کے کیا معنی ہونے چاہئیں؛ چنانچہ جو کچھ ہونا چاہئے تھا اور نہیں ہوا ہے وہ کر دیتا ہے۔

——— سبحان اللہ پرویز صاحب

پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

اب ترجمہ سے قطع نظر ذرا "قرآنی اصطلاحات" پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیجئے۔

ہم آپ قرآن پڑھتے ہیں۔ اگر عربی نہیں جانتے تو کوئی ترجمہ سامنے رکھ لیتے ہیں اور اگر جانتے ہیں تو بغیر ترجمہ سامنے رکھے۔ "تلاوت کلام پاک شروع کر دیتے ہیں کسی لفظ کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ تو منجد سے لے کر لسان العرب تک سب حل جانے اس کی ورق گردانی شروع کر دیتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوہر مقصود مل ہی جاتا ہے۔ لیکن ——— ہمارا "مزاج شناس قرآن" نہ کتابی علم کا قائل ہے نہ لغات کی ورق گردانی کا اس کے نزدیک لغت نویسی کی کوششیں سعی نامشکور کے ذیل میں آتی ہیں، جو چاہیں کریں مزاج شناس ان رسمیات کا پابند نہیں۔ عوام لغت نویسوں کے محتاج ہیں۔ اور لغت

لوگوں نے مختلف نام لیئے۔ حضرت امام حسین کی مظلومیت پر تقریباً سب متفق ہو گئے۔

اقبال نے کہا۔

"نہیں۔ سب سے زیادہ مظلوم قرآن ہے۔"

جو شخص چاہتا ہے مفسرِ قرآن بن جاتا ہے۔"

"کاش پرویز صاحب نے قرآن کی مظلومیت میں اضافہ نہ کیا ہوتا۔"

گویا اس دَور عہد سب سے بڑا "متقی" کوئی شخص نہیں۔
ایک پورا ملک امریکہ ہے یا پھر روس!

۸ــــ اقامِ الصلوٰۃ۔ معاشرہ کو ان بنیادوں پر قائم کرنا ــــــــــــ
جن پر ربوبیت نوعِ انسانی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔"

کیا سمجھے آپ؟ کہہ دیجئے۔
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔

۹ــــ ایتاءِ زکوٰۃ۔ نوعِ انسانی کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچانا۔
پرویز صاحب کی یہ اپج واقعی قابلِ داد ہے۔ کیوں نہ ہو ــــــ

کہہ رہا ہوں جنوں میں کیسا کیا کچھ!

۱۰ــــ ایمان بالغیب۔ خدا کے نظامِ ربوبیت کے ان دیکھے نتائج پر یقین رکھنا۔
جس کی دعوت پرویز صاحب دے رہے ہیں۔

تلک عشرۃ کاملہ:۔

غرض کیا کیا عرض کیا جائے۔
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے!
سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لیے۔

اب آپ خود ہی غور فرمائیے۔ ان اصطلاحات کی روشنی میں اور اس ترجمہ بے مثال کی موجودگی میں پرویز صاحب نے جو گل کاریاں کی ہوں گی۔ ان کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اور ان دلائل کا قرآن سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ بھی کوئی راز نہیں۔

اقبال نے ایک مرتبہ اپنی مجلس میں سوال کیا۔
"دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم کون ہے"

ی مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ آنحضرت نے خلافت کے لئے کسی کو نامزد نہیں
کیا یہ کام امت پر چھوڑا کہ جسے چاہے سربراہ مقرر کرلے، حالانکہ بظاہر نامزدگی کی
سب سے زیادہ ضرورت اسی وقت تھی۔ لیکن آپ نے امت کے ایک حق کو سلب نہ
کیا چاہا۔ حضرت ابوبکر رضؓ نے حضرت عمر رضؓ کو نامزد کیا۔ لیکن یہ نامزدگی تابع تھی قبولِ
عامہ کی۔ حضرت عمر رضؓ نے چند آدمیوں کا ایک "پینل" قائم کردیا۔ لیکن حکماً اپنے صالح
و متقی بیٹے کو اس سے خارج کردیا۔ حضرت عثمان رضؓ نے کچھ نہ کیا۔ ان کی شہادت کے
بعد حضرت علی رضؓ کے ہاتھ پر اربابِ حل و عقد نے بیعت کرلی۔ حضرت علی رضؓ جب
اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو پوچھا گیا:
"کیا ہم حسن رضؓ کے ہاتھ پر آپ کے بعد بیعت کرلیں؟" علی رضؓ مرتضیٰ نے جواب دیا:
"میں نہ یہ کہتا ہوں کہ حسن رضؓ کی بیعت کرو، نہ یہ کہتا ہوں کہ نہ کرو۔ میں تمہیں
اس حالت میں چھوڑے جا رہا ہوں جس حالت میں رسول اللہ چھوڑ گئے تھے!"
گویا عہدِ خلافتِ راشدہ تک معمول یہ رہا کہ سربراہ امت نے اپنے بیٹے کو
نامزد نہیں کیا، لیکن امیر معاویہ امت میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے بزور شمشیر اور بنوک
سنگین اپنے بیٹے کو اپنی زندگی میں، اہل صحابہ کو نظر انداز کرکے، نامزد کردیا۔ اس
موقع پر عبداللہ بن زبیر نے کہا تھا "ہم آپ کی نامزدگی تسلیم کرلیں گے اگر آپ اپنے
بیٹے کو نامزد نہ کریں!" لیکن امیر معاویہ نامزدگی پر، اور اپنے بیٹے کی نامزدگی پر مصر
رہے۔ اور اس کے بعد سے موروثی حکومت کا غیر اسلامی سلسلہ جو شروع ہوا ہے تو
الغائے خلافت تک یعنی تقریباً تیرہ سو برس تک قائم رہا۔ امیر معاویہ
کی غلطی کو اگر اجتہادی غلطی سے تعبیر کیا جاتا (جیسا کہ بعض اکابر کا قول ہے) تو ایک
بات تھی، لیکن جناب مؤلف کی بیالیس سالہ تحقیقات کا حکم ناطق یہ ہے کہ امیر معاویہ
کا فعل عین صواب تھا۔

خلافت معاویہ و یزید

اس کتاب کے متعلق صاحب کتاب کا دعویٰ ہے کہ یہ ان کی چالیس سال کی محنت کا نچوڑ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی تالیعت پر ان سے ہمدردی کرنے کو جی چاہتا ہے، اس لئے کہ اس طویل مدت کی تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ کتاب سب کچھ ہے مگر تاریخ نہیں ہے۔ اگر تاریخ نام ہے "تاریخی مسلّمات کے انکار کا، متفق علیہ روایات کے عدم توجہ کا، اپنے مفروضہ مقصد کے خلاف روایات کو ترک کردینے کا، مشتبہ روایات کو سند قبول عطا کردینے کا، تب تو یہ بلاشبہ بڑی سنسنی خیز تاریخ ہے۔ لیکن اگر "تاریخ" تاریخ کو کہتے ہیں تو اسے کسی طرح بھی "تاریخ" نہیں کہا جا سکتا۔

کوئی کتاب جب لکھی جاتی ہے، تو قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کتاب کا بظاہر یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ یزید کو "امیرالمومنین" ثابت کیا جائے۔ حالانکہ یہ مقصد ایسا نہ تھا جس کے لئے عمر عزیز کے چہل سال ضائع کئے جاتے۔ یہ کتاب لکھے بغیر بھی جناب مصنف یزید کو امیرالمومنین مان لیتے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا، ــــ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست!۔

دوسرا سوال جو کسی کتاب کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے کہ آیا مصنف نے کوئی ایسی تحقیق پیش کی ہے جو کسی بنیادی مسئلہ کو زیادہ اجاگر کرتی ہو؟ یہاں اس اعتبار سے

لافت ما بہ النزاع تھا اس کے خلاف ہتھیار اٹھانا بغاوت اور سو سال کی جمی ہوئی حکومت کا تختہ الٹ دینے کی کوشش کرنا، اور الٹ دینا اصلاحی تحریک — شاید اس لئے کہ فاضل مؤلف خود بھی عباسی ہیں، ٭

(دسمبر ۱۹۵۹ء)

فاضل مؤلف نے اپنی تحقیق چہل سالہ کا سارا زور اس پر صرف کیا ہے کہ امام حسین رض کی حیثیت امیرالمومنین یزید کے مقابلہ میں باغی کی تھی، اور باغی کی سزا قتل ہی ہے۔ نیز یہ کہ امام حسین رض صرف اس لئے تختِ خلافت کے مدعی تھے کہ وہ رسول ص کے نواسے اور علی رض کے بیٹے تھے اس سلسلہ میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یزید کی بیعت (امام مالک وغیرہ کا فتویٰ ہے کہ بیعت جبری ناجائز ہے) جب جائز ہی نہیں تھی، تو اس کے خلاف ہتھیار اٹھانے والا باغی کیسے ہوگیا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ یزید اگر صرف اس لئے کہ معاویہ کا بیٹا تھا، خلافت کا مستحق تھا، تو حسین رض اس لئے کہ وہ رسول ص کے نواسے، اور علی رض مرتضےٰ کے بیٹے تھے، کیوں مستحق نہیں تھے؟ جبکہ دونوں کی سیرت، کردار اور شخصیت میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا؟

مؤلف نے اپنی حد تک تو یزید کے بارے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ——— خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں ——— لیکن یزید کے بارے میں، اور اس کے دورِ حکومت کے بارے میں، اور اس کے استحقاقِ خلافت کے بارے میں خود یزید کا لختِ جگر یعنی معاویہ بن یزید جو خطبہ دے کر خلافت سے دستبردار ہوگیا تھا اسے وہ یکسر نظر انداز کر گئے ہیں۔ کیا یہی اصول ان کی چہل سالہ تاریخی دریافت کی اساس ہیں۔؟

اس کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ ہے، جہاں فاضل مؤلف روانی میں کچھ ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جو لطائف و ظرائف کی تاریخ میں ایک مستقل حیثیت کی حامل ہیں۔ مؤلف کو اس پر اعتراض ہے کہ بنو ہاشم نے اموی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کیوں کی؟ اس کوشش کو وہ بغاوت تک سے تعبیر کرنے میں تامل نہیں کرتے لیکن عباسیوں نے جب اموی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش شروع کی تو اسے وہ "عظیم اصلاحی تحریک" قرار دیتے ہیں۔ گویا اس وقت جب یزید کا استحقاق

زینت:۔ جی امّی آئی

(قدموں کی آہٹ)

ماں:۔ کیا کر رہی تھیں بیٹی؟

زینت آٹا گوندھ رہی تھی۔

ماں:۔ خالی آٹا گوندھ کر کیا کرو گی بیٹی، دال ترکاری تو کچھ ہے نہیں۔

زینت:۔ شاید ابّا اپنے ساتھ لے آئیں۔ آج بڑی دیر ہو گئی۔ اب تک نہیں آئے۔

ماں:۔ ہاں شام ہو گئی نہ جانے کیوں دیر ہو گئی۔ آج ابھیں۔ اندھیرے میں دم گھٹ رہا ہے۔ ذرا چراغ تو جلا لے بچی!

زینت:۔ چراغ کہاں سے جلاؤں؟ تیل کی ایک بوند بھی نہیں۔

ماں:۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) شکر ہے خدا کا — بڑی دیر سے میں نے محمود کو نہیں دیکھا، کہاں نکل گیا؟

زینت:۔ گیا کہاں؟ — اسکول سے آتے ہی چلا گیا وہاں میچ میں کہہ رہا تھا آج اس کی ٹیم بھی کھیلے گی۔

ماں:۔ اے تو کیا رات کو میچ کھیلا جائے گا؟

زینت:۔ لیجئے وہ آ گیا۔ دیکھئے پسینہ پسینہ ہو رہا ہے بے چارہ۔

(محمود سامنے آتا ہے اور گنگنا رہا ہے)

ہم کون تھے، ہم کیا ہیں دنیا کو بتا دیں گے
مشرق کا سرا لے کر مغرب سے ملا دیں گے

ماں:۔ اے کچھ دیوانہ ہو گیا ہے لڑکے؟

محمود:۔ اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے

ایک فیچر

مہاجِر

کردار

میر صاحب .... ایک مہاجر
رابعہ .... ان کی بیوی
زینت .... لڑکی
محمود .... لڑکا
اختر .... ایک یتیم لڑکا
خان صاحب .... میر صاحب کے بچپن کے دوست

حکیم ڈاکٹر وغیرہ

(ایک خس پوش جھونپڑی)

ماں :- زینت ، ارے بیٹی زینت -

نت:۔ وہاں چولھے کے پاس رکھی ہے، خود اٹھا لو جاکر۔

ود:۔ مجھ سے اندھیرے میں کوئی چیز گر پڑے گی خوامخواہ

نت:۔ بڑی چیزیں رکھی ہیں جو گر پڑیں گی، کہیں خود نہ گر پڑنا

(محمود ہنستا ہے۔ جانے کی آواز)

ود:۔ زینت آپا آنکھیں بند کر لو، علاؤالدین کا چراغ جلاتا ہوں۔

نت:۔ بند کر لیں، جلاؤ۔

(ماچس رگڑنے کی آواز)

ود:۔ یہ دیکھو جل گیا۔ آنکھیں چکا چوند ہوئیں یا نہیں؟

نت:۔ (ہنس کر) یہ ذرا سی موم بتی، کتنی دیر جلے گی تمہاری؟

ود:۔ اتنی دیر تو جل ہی جائے گی کہ تمہیں سنانے کو دو چار شعر یاد کر لوں۔

اں:۔ (ہنس کر) تو بھی بڑا شریر ہے۔ ہر وقت چھیڑا کرتا ہے بہن کو۔

(قدموں کی آہٹ)

نت:۔ (سرگوشی کے لہجہ میں) ابا آ گئے۔

ماں:۔ بڑی دیر لگا دی آج تم نے ——— اے یہ تمہارے ساتھ چھوکرا کون ہے۔

پ:۔ میرا بیٹا۔ یہ آج سے محمود اور زینت کا بھائی ہے۔ بیٹی زینت

نت:۔ جی ابا جی

پ:۔ جاؤ اسے لے جاکر ہاتھ منہ دھلا دو، پھر محمود کے کپڑوں میں سے ایک نکال کر پہنا دو۔

نت:۔ بہت اچھا۔

(جاتی ہے)

اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

زینت:۔ ادئی کان کے پردے پھاڑ دیئے محمود تم نے تو، ـــــ اچھا چوچلا
ہے یہ بھی، ہٹو بھی واہ!

محمود:۔ آپا ہماری ٹیم جیت گئی۔

ماں بھاڑ میں جائے تیری ٹیم خبردار جواب کبھی شام کو گھر سے باہر
رہا ہوگا!

محمود:۔ اچھا اماں اب نہیں جاؤں گا۔
(پھر شاعری شروع کر دیتا ہے)
کبھی اے نوجوان مسلم، تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

زینت:۔ محمود میرے سر میں درد ہو رہا ہے اتنے زور سے تو نہ چیخ

محمود:۔ (بلند آواز سے) غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہانگیر و جہاں بان و جہاں دار و جہاں آرا!

زینت:۔ اماں دیکھ لیجیے۔ نہیں مانتا یہ محمود، میرا سر کھائے جا رہا ہے۔

محمود:۔ دیکھ لیجیے اماں، یہ زینت آپا تو خوامخواہ جلا کرتی ہیں مجھ سے۔ اب
شعر پڑھنا بھی گناہ ہو گیا۔

ماں:۔ اچھا بس ہو چکی شعر خوانی۔ کتاب اٹھا سبق یاد کرو۔

زینت:۔ تیل تو ہے نہیں اندھیرے میں سبق یاد کرے گا۔ مجھے بھی اپنی کتاب
پڑھنی تھی۔

محمود:۔ تیل نہیں تو کیا ہوا۔ میرے پاس علاؤالدین کا چراغ جو ہے۔ دیکھو کیسی
روشنی ہوتی ہے۔ ذرا ماچس تو دینا۔

اسے روکھی روٹی کھلاتے شرم نہیں آئے گی؟

باپ :- ضرور آئیگی، کم سے کم آج ایسا نہیں ہونا چاہیئے ـــ دو چار روز میں جب وہ مانوس ہوجائے گا۔ پھر کوئی بات نہیں۔

ماں :- یہی تو میں کہتی ہوں۔

باپ :- کچھ بھی نہیں ہے گھر میں؟

ماں :- یہ لو، کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ بے چاری زینت آس لگائے بیٹھی تھی تم آؤ گے تو دال ترکاری اپنے ساتھ لیتے آؤ گے۔

باپ :- ہاں۔ لیکن کیا کروں، مجبور ہوں؟ جن سیٹھ صاحب کے ہاں پندرہ دن کام کرنے کے بعد جواب مل گیا تھا، اب تک ان کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ مگر وہ آج وہ دفتر ہی نہیں آئے۔ انہیں کیا معلوم ہم پر کیا گذری ہے۔

ماں :- میں کہتی ہوں آخر اس لڑکے کا کیا ہوگا؟ آج یہ ایک نئی مصیبت لے آئے تم۔

باپ :- نئی مصیبت۔

ماں :- ہاں اور کیا؟ سوچو تو سہی۔ آدمی کو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیئے۔ جب ہم خود نہیں کھا سکتے۔ کسی دوسرے کو کہاں سے کھلائیں گے۔

باپ :- رابعہ بیگم، یہ آج تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ ہمیں تمہیں ایک دوسرے کا رفیق زندگی بنے تیئس برس ہوگئے اس طویل مدت میں آج پہلی بار تم میری نظر میں سبک ہوئی ہو۔ تم خوشحالی میں جتنی فراخ دل تھیں، غربت نے اتنا ہی تمہیں تنگ دل بنا دیا؟

ماں:- میں کہتی ہوں آخر یہ چھوکرا کون ہے؟

باپ:- کہہ تو رہا ہوں میرا لڑکا ہے اور کون ہے؟

ماں:- پھر وہی لگے پہیلیاں بجھانے - یہی تو مجھے اچھا نہیں لگتا -

باپ:- اچھا بھائی کیوں خفا ہوتی ہو، بتائے دیتا ہوں - کہتا ہے آگرہ کا رہنے
والا ہے باپ یہاں آتے ہی مرگیا، ماں چند دن ہوئے موٹر سے کچل کر
مرگئی، اب نہ کہیں ٹھکانہ ہے نہ آسرا، نوکری ڈھونڈنے نکلا تھا بیچارہ
ذرا دیکھو تو یہ عمر اور نوکری، میرا تو دل ہل گیا۔ خدا یہ وقت کسی پر
نہ ڈالے، بھئی مجھ سے تو ضبط نہ ہو سکا - اپنے ساتھ لے آیا ہرچہ
بادا باد!

ماں:- لیکن ——

باپ:- نہیں بھئی لیکن ویکن کی سند نہیں، چہرہ دیکھو تو کتنی معصومیت
برستی ہے غریب پر، —— یہ اس گھر میں رہے گا، اور اس کے ساتھ
وہی برتاؤ ہوگا جو محمود اور زینت کے ساتھ ہوتا ہے۔

ماں:- وہ تو میں نے مانا۔ میں نے خود جب سے اسے دیکھا ہے۔ دل
کڑھ رہا ہے (ٹھنڈی سانس لے کر) ماں باپ بھی کم عمر اولاد
کے لئے بڑی نعمت ہیں -

باپ:- سچ کہتی ہو؛ اور اگر بچے دل سے کہتی ہو تو یہ بچہ کبھی بھی یہ محسوس نہ کرنے
پائے کہ یہ نعمت اس سے چھن چکی ہے -

ماں:- یہی کوشش کروں گی، لیکن اس گھر میں کیا سکھ ملے گا۔ بیچارے
کو؟ حالت تو یہ ہے کہ آٹا گندھا رکھا ہے، نہ دال ہے نہ ترکاری
ہم لوگ تو نمک مرچ سے بھی روٹی کھالیں گے۔ مگر یہ یہاں آ

نوکروں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ آج میں خود ایک ایک در پر نوکری کی بھیک مانگنے جاتا ہوں۔ کہیں سے دھتکار دیا جاتا ہوں۔ کہیں کوئی عارضی آسامی مل جاتی ہے سو پچاس کی، کیا ان سارے انقلابات سے تم نے یہی سبق لیا ہے کہ اپنے دل کو اور زنگ آلود کر لو۔ آدمی کی آدمیت مصیبت کے وقت پہچانی جاتی ہے! مجھے بڑا افسوس ہے کہ تم پہلے ہی امتحان میں بری طرح فیل ہو گئیں۔

ماں:۔ تم تو پاس ہو گئے بڑے اچھے نمبروں سے۔ اب دیکھوں گی کہ کیا کھلاؤ گے اُسے۔

باپ:۔ میری جیب میں چار آنے ہیں۔ چار آنے کا سالن کافی ہوگا۔

ماں:۔ اللہ رکھے پانچ آدمی چار آنے کے سالن میں کھا لیں گے؟

باپ:۔ نہیں صرف اختر کھائے گا۔ اور جب وہ کھا پی کر سو جائے گا ہم حسب معمول روکھی روٹی کھائیں گے خدا کا شکر ادا کریں گے اور سو جائیں گے۔

والدہ بیگم:۔ کہو آج بھی سیٹھ سے ملاقات ہوئی کہ نہیں۔

میر صاحب:۔ حساب بے باق کر دیا سیٹھ نے۔

والدہ بیگم:۔ شکر ہے کیا لائے۔

میر صاحب:۔ کل پینتیس روپے ملے تھے۔ پچیس تو قرضداروں کو دے دیئے ہیں۔ دس بچ رہے وہ جیب میں ہیں۔

والدہ بیگم:۔ وہ بھی کسی کو دے کر سوار ہوتے کرآتے۔

آواز:۔ اے بھئی۔ میر صاحب ہیں۔

اپنا دیس، اپنا گھر، اپنی جائداد، اپنا مال، تج کر میں یہاں آیا، یہاں آنے کے بعد جیسی تنگی ترشی سے بسر ہو رہی ہے۔ جن مصیبتوں سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ جو دشواریاں آڑے آ رہی ہیں ان سب کا میں نے خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ کبھی ہراساں نہیں ہوا کبھی مغموم نہیں ہوا۔ لیکن آج کسر نکل گئی۔ آج مجھے وہ صدمہ پہنچا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا (ٹھنڈا سانس)

ماں:۔ آخر کیا ہوا؟ کیا کیا میں نے؟

باپ:۔ اور اس سے زیادہ کیا کہو گی۔ بے بیچارہ اختر، جس کا باپ مر چکا ماں گذر گئی، اس وسیع دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں یہ سر چھپا سکے۔ کوئی ایسا نہیں جسے یہ اپنا کہہ سکے۔ اسے میں پناہ دیتا ہوں! تو تم برا مانتی ہو؟ ذرا سوچو تم بھی ہمیشہ نہیں ہو گی۔ میں بھی آج مرا کل دوسرا دن، اگر یہی دن زینت اور محمود کو دیکھنا پڑے تو؟

ماں:۔ اے خدا نہ کرے، دشمنوں کے منہ میں خاک۔

باپ:۔ ہمارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ جو خدا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے یہ دنیا کسی کا ساتھ نہیں دیتی، یہاں ہر روز انقلابات آتے رہتے ہیں۔ اکونک ہمارے پاس کیا نہ تھا؟ کس چیز کی کمی تھی۔ ہیں! مگر آج؟ ذرا سوچو دیکھتے دیکھتے کیا ہو گیا۔ شاندار حویلی کی بجائے یہ معمولی جھونپڑی ہمارا مسکن ہے روپیہ کی ریل پیل ختم ہوئی اب ایک ایک پیسہ کو ہم ترستے ہیں۔ پہلے ہمارے دسترخوان پر کئی کئی قسم کے کھانے ہوتے تھے۔ اب روکھی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے ایک وہ زمانہ تھا کہ

ہے کہ وہ اپنا بھرا پُرا گھر چھوڑ دے تو ان میں یہ حوصلہ ہونا چاہیئے کہ اپنا نیا گھر خود اپنے ہاتھ پاؤں کی قوت سے تعمیر کر سکیں ۔ ایک طرف ایثار اور دوسری طرف حسن طلب میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ۔

خانصاحب:- اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم مہاجرین کو اسی پریشانی اور بے روزگاری کے عالم میں زندگی گذارنی چاہیئے ۔

صاحب:- میں تو صرف اپنے بارے میں کہہ رہا ہوں ۔ دوسروں کے بارے میں تو نہیں کہتا ۔ میں اپنے فعل کا مختار ہوں ، دوسرے اپنے فعل کے ۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ اپنا اپنا اصول ہے ۔ میں یہ اصول قائم کر چکا ہوں کہ مکان ، دکان ، کھیت کسی چیز کی طرف دست طلب نہیں بڑھاؤں گا ۔ زندگی میں بہت عیش کر چکا ۔ اب ذرا غربت اور فاقہ کشی کا مزہ بھی یہ چکھ لوں ۔

خانصاحب:- ہاں بھئی ! لیکن یہ تو ہمارا حق ہے ۔ اپنے حق سے کیوں دست بردار ہوں ۔

صاحب:- خانصاحب یہیں سے میرے اور آپ کے نقطۂ نظر میں اختلاف پیدا ہوتا ہے ۔ آپ حق پر زور دیتے ہیں اور میں فرض کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں ۔

خانصاحب:- معاف کیجیئے گا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ؟ میں بالکل نہیں سمجھا ۔

صاحب:- میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں حق مانگنے سے نہیں ملتا ۔ فرض ادا کرنے سے ادا ہو جاتا ہے ۔ حق مانگنے میں ، پانے میں ، لینے میں دشواریاں ہیں ، مخالفتیں ہیں ۔ نہ جانے کیا کیا ہے ۔ فرض کے ادا کرنے میں نہ کوئی

میر صاحب:۔ ذرا تم ادھر آڑ میں ہو جاؤ ۔ خاں صاحب آئے ہیں ۔ (بلند آواز سے)
آیئے خانصاحب تشریف لایئے ۔

خانصاحب:۔ کہیے مزاج کیسے ہیں ۔

میر صاحب:۔ دعا ہے آپ کی سنایئے کوئی نئی خبر!

خانصاحب:۔ ہاں ایک بڑے کام کی خبر لایا ہوں ۔

میر صاحب:۔ وہ کیا ؟

خانصاحب:۔ شہر کی جن دکانوں پر سیل لگی تھی وہ الاٹ ہونے والی ہیں ۔ لوگوں کو

میر صاحب:۔ بڑی اچھی خبر ہے آپ بھی دے رہے ہیں درخواست ؟

خانصاحب:۔ اجی میں نے تو اپنی درخواست بھیج بھی دی ۔ آپ سے کہنے آیا ہوں
ایسا موقعہ مشکل سے ملے گا ۔ دیر نہ کیجیے ۔

میر صاحب:۔ آپ کا مقصد یہ ہے کہ میں بھی درخواست گذار ن دوں کہ
لئے ہوئے یہ دل بے قرار ہم بھی ہیں

خانصاحب:۔ اور کیا ؟

میر صاحب:۔ نہیں خانصاحب مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا ۔

خانصاحب:۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ کیوں آخر ۔

میر صاحب:۔ اپنا اپنا اصول اپنا اپنا مذاقِ طبیعت ہے ۔ میں اپنی مہاجرت کا معاوضہ
لینا پسند نہیں کرتا ۔

خانصاحب:۔ یہ بھی خوب فرمایا آپ نے ۔ ارے بھائی اپنا خیال نہیں کرتے ۔
تو اپنے بچوں کا تو خیال کرو ۔ ۔

میر صاحب:۔ انہی کا خیال مجھے اس قسم کے کام کرنے سے روکتا ہے ۔ میں چاہتا
ہوں وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھیں اگر ان کے باپ میں ہمت

صاحب:۔ اگر مگر سے کام نہیں چلے گا۔ خانصاحب حق مانگنے اور فرض ادا کرنے میں
میں بھی تو فرق ہے۔ جب حق مانگتے ہیں تو مجبور ہیں کہ دیکھیں اور محسوس
کریں کہ فلاں کو حق نہیں ملا۔ فلاں کو ضرورت سے زیادہ مل گیا۔ فلاں
کو ضرورت سے کم ملا۔

صاحب:۔ بالکل ٹھیک یہ ہونا ہی چاہیئے۔

صاحب:۔ جی ہاں ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن جب ہم فرض ادا کریں گے تو دوسروں
کی بجائے اپنی طرف دیکھیں گے۔ اپنا جائزہ لیں گے۔ پہلی صورت
کشمکش کی ہے۔ دوسری عافیت کی مجھے تو بھئی عافیت پسند ہے۔
تم اپنا کام کرو مجھے اپنا کام کرنے دو۔

صاحب:۔ میر صاحب آپ کو تو کوئی سمجھا نہیں سکتا۔

صاحب:۔ اور نہ میں کسی کو سمجھا سکتا ہوں۔

(دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

صاحب:۔ اچھا اجازت دیجئے۔ انشاءاللہ پھر ملاقات ہوگی۔ السلام علیکم

صاحب:۔ وعلیکم السلام۔

(خانصاحب جاتے ہی رابعہ بیگم آڑ سے باہر نکل آتی ہیں)

بیگم تم ایسے ہی فرشتے تھے تو پھر آل اولاد کے جھنجھٹ میں کیوں پھنسے۔
تمہاری اور خانصاحب کی ساری باتیں میں نے سن لی ہیں۔

صاحب:۔ بہت اچھا کیا۔ دراصل یہ باتیں میں تم ہی کو سنانا بھی چاہتا تھا۔
تم نے زندگی بھر میرا ساتھ دیا ہے۔ زندگی کے اس آخری مرحلہ
پر مجھے تمہاری رفاقت کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ سچ کہو کیا

دشواری ہے نہ کسی مخالفت کا اندیشہ ہے،

خانصاحب:۔ ذرا اور وضاحت کیجئے!

میر صاحب:۔ میرا حق ہے کہ مجھے مکان ملے۔ میرے نام دکان الاٹ ہو، مجھے کھیت دیا جائے کسی کارخانے یا فیکٹری پر مجھے قبضہ دیا جائے۔ کسی مشین یا انجن کا قبالہ مجھے لکھ دیا جائے۔ لیکن جب میں یہ حق مانگنے نکلوں گا تو کسی سے میرا مقابلہ ہوگا۔ کوئی سفارشیں لائے گا۔ کوئی مخالفت کرے گا۔ کسی سے دشمنی مول لوں گا۔ بہت سے جھگڑے ہیں جن سے نپٹنا پڑے گا۔ کہیئے ہاں۔

خانصاحب:۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔

میر صاحب:۔ اور میرا فرض یہ ہے کہ اپنی روزی محنت سے کماؤں۔ میں مزدوری کر سکتا ہوں۔ قلی بن سکتا ہوں۔ ڈلیا ڈھو سکتا ہوں۔ ملازمت کر سکتا ہوں۔ ٹھیلا چلا سکتا ہوں۔ پھر کیوں نہ ہر آرزو اور تمنا کو دل سے نکال کر محنت کروں اور روزی کماؤں۔

خانصاحب:۔ ارے میاں خوب باتیں بنا لو۔ ہم نے بھی خوب تماشے دیکھے ہیں۔ تم بھی جی بھر کے دیکھ لو۔ تباہی کا تماشہ دیکھنے والے بہت ہیں ہمدردی کرنے والا کوئی نہیں۔ مذاق اڑانے والوں کی کمی نہیں، ساتھ دینے والا کہیں نظر نہیں آتا۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ ہمارا اگر کچھ فرض ہے تو دوسروں پر بھی کچھ فرض عائد ہوتا ہے۔

میر صاحب:۔ ضرور عائد ہوتا ہے

خانصاحب:۔ مگر ————

ہماری یہ فصل خزاں بھی موسم بہار سے بدلے گی۔ ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے مرجھائے ہوئے پھول بھی کھلیں گے۔ لیکن ہمیں ہراساں نہ ہونا چاہیئے۔ بددل نہ ہونا چاہیئے۔ مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ ہر نئی مصیبت پر میری زبان سے صرف ایک ہی بات ہی نکلتی ہے۔ لا تقنطوا من رحمۃ اللّٰہ۔ یعنی خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اگر خدا سے مایوس ہو گئے۔ تو بیشک ہمارا ٹھور ٹھکانہ پھر کہیں نہیں۔ اور اگر اس کی رحمت ہمارے ساتھ ہے تو ہر مصیبت راحت کا پیام بن کر ہمارے پاس آئے گی۔ میں ہر حالت میں خوش رہنا چاہتا ہوں۔ اپنا حوصلہ بلند رکھنا چاہتا ہوں۔

...ہرہ:- تو میں کب منع کرتی ہوں۔ خوش رہنے سے۔ تمہیں خوش رکھنے میں اگر میری زندگی بھی کام آجائے۔ اللہ جانتا ہے مجھے ذرا دریغ نہ ہوگا

...صاحب:- نہیں مجھے تمہاری زندگی کی نہیں، تمہاری ضرورت ہے۔

...ہرہ:- البتہ بچوں کو دیکھ دیکھ کر کلیجہ ہولتا ہے۔ زینت اللہ رکھے جوان ہونے کو آئی۔ محمود کو ابھی بہت کچھ پڑھانا ہے۔ اختر کی ذمہ داری بھی ہم لے چکے ہیں اسے بھی لکھانا پڑھانا ہے۔ یہ سب سوچ کر جب میں آگے کی طرف دیکھتی ہوں تو اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ مجھے اپنی ذرا بھی فکر نہیں۔ فکر جو کچھ ہے ان ہی بچوں کی ہے۔

...صاحب:- مجھے بھی ان کی کم فکر نہیں ——— میں بھی یہ چاہتا ہوں کہ محمود اور اختر بہترین اور اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ میری خواہش ہے کہ زینت کا بیاہ اپنے حوصلے کے مطابق کروں۔ لیکن ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اس میں لیفے لاکھوں کھائیوں کی طرح ہمیں اپنی

اس مرحلہ پر تم میرا ساتھ نہ دو گی ؟

رالعہ بیگم:۔ (آبدیدہ ہو کر) کیسی باتیں کر رہے ہو تم ؟

میر صاحب:۔ تم جانتی ہو یہ بوڑھا سر کسی کے سامنے نہیں جھکا۔

رالعہ بیگم:۔ ہاں جانتی ہوں میں نہ جانوں گی تو کون جانے گا؟

میر صاحب:۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کبھی کسی کی مدد قبول نہیں کی ؟

رالعہ بیگم:۔ ہاں خوب معلوم ہے۔

میر صاحب:۔ پھر کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ان ناموافق حالات کے سامنے میں سر جھکا دوں گا۔ لوگوں سے امداد اور اعانت کی بھیک مانگوں گا۔ مر جاؤں گا لیکن یہ نہیں کروں گا۔

رالعہ بیگم:۔ خدا نہ کرے۔ بار بار مرنے جینے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔

میر صاحب:۔ پھر میرا ساتھ دو۔ اس مصیبت کے دور میں صرف تم ہی ایک ہستی ہو جو میرا حوصلہ بڑھا سکتی ہے جس سے مجھے زندگی کی نئی اُمنگ مل سکتی ہے۔ میں کوئی کام ایسا نہیں کروں گا جس سے میری آن میں فرق آئے۔ میں خدا پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ میرا یہ عقیدہ ہے اس کا کوئی کام حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ دکھ کو سکھ سے بدل سکتا ہے۔ اور بدلے گا۔ رات کی تاریکی کے بعد دن کی روشنی ضرور نمودار ہوتی ہے گھنگھور گھٹاؤں کے طوفان کے بعد سورج اپنی چمک دمک ضرور دکھاتا ہے۔ خزاں کے موسم میں پھول مرجھاتے ہیں۔ پتیاں جھڑ جاتی ہیں۔ کونپلیں سوکھ جاتی ہیں۔ لیکن جب بہار کا موسم آتا ہے۔ تو پھول پھر کھلنے لگتے ہیں۔ پتیاں پھر ہری بھری ہو جاتی ہیں۔ کونپلوں میں پھر زندگی کی ہریالی آجاتی ہے۔۔۔

ہم ہجرت کرنے والوں کو حسب گنجائش اور حسب امکان مکان بھی ملتے ہیں۔ کھیت بھی ملتے ہیں۔ روزگار دلانے والے دفتر سے بے روزگاروں کو ملازمتیں بھی ملتی ہیں۔

لعہ:۔ تم تو اپنا قصّہ لے کر بیٹھ گئے۔

صاحب:۔ اور ایک ہجرت وہ تھی جب مکہ سے مہاجرین چلتے تھے۔ تو ان کا سامان چھین لیا جاتا تھا۔ ان کی بیویاں، لڑکیاں، بہنیں روک لی جاتی تھیں۔ ان کا اثاثہ ضبط کر لیا جاتا تھا۔ وہ ان سب تکلیفوں کا مسکرا کر خیر مقدم کرتے ہوئے مدینہ پہنچتے تھے۔ اور رضائے الٰہی کے خیال سے ہر دکھ اور مصیبت کو بھول جاتے تھے۔ وہ محنت کرتے تھے، مزدوری کرتے تھے۔ مشقت کرتے تھے۔ اور اس حالت میں بھی اپنے جیسے دوسرے مصیبت زدوں کی مدد کرتے تھے۔ اور جب وہ فاتح بن کر مکہ پہنچے تو اپنے رسولؐ کے کہنے سے انہوں نے اپنی چھوڑی ہوئی چیزیں ــــــ مکان، دکان، اثاثہ سب کچھ ــــــ انھیں لوگوں کو بخش دیا۔ جنھوں نے ان پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا۔ اور جس طرح مکہ چھوڑ کر مدینہ میں بغیر کسی ظاہری سہارے کے نئی زندگی شروع کی تھی۔ اسی طرح مدینہ سے مکہ واپس آکر بھی انھوں نے بغیر کسی سہارے کے محض رحمت خداوندی اور اپنے دست و بازو کی قوت کے بل پر نئی زندگی تعمیر کرنا شروع کر دی۔

العہ:۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) اللہ اللہ

صاحب:۔ اور جانتی ہو اس بے داغ مہاجرت اور خالص کردار کا انجام کیا ہوا؟

تمناؤں کو مختصر کرنا پڑے گا۔ یہ مصیبت صرف مجھ پر اور تم پر نہیں پڑی ہے۔ اور بھی لاکھوں آدمی ہیں۔ جو ہم سے تم سے کہیں زیادہ پریشان حال اور آشفتہ روزگار ہیں اگر ان پر ایک نظر ڈالو تو ماننا پڑے گا کہ خدا نے ہمیں ۔

سو سے برا تو لاکھ سے بہتر بنا دیا

نہ جانے کتنے ہیں جنہیں روکھی روٹی بھی میسر نہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو اپنے لڑکوں کو پڑھا نہیں سکتے۔ ان سے مزدوری کرانے پر مجبور ہیں۔ ان گنت لڑکیاں ہوں گی۔ جن کی پہلی زندگی زینت سے زیادہ راحت و آرام سے گذری ہوگی۔ آج وہ تمہاری زینت سے بھی بدتر حالت میں ہوں گی۔ میں جب یہ باتیں سوچتا ہوں تو منہ سے شکایت نہیں۔ کلمۂ شکر نکلتا ہے۔

رابعہ:۔ ہاں ہے تو ٹھیک۔

میر صاحب:۔ تم ہی سوچو ——————— میں صرف ایک بات چاہتا ہوں

رابعہ:۔ کون سی بات؟

میر صاحب:۔ یہ ہماری ہجرت بے داغ رہے۔

رابعہ:۔ کیا مطلب؟——————— ہجرت میں داغ کون سا لگا ہے؟

یہ کیا بات کہہ دی ہے؟

میر صاحب:۔ ایک ہماری ہجرت ہے۔

رابعہ:۔ اور دوسری؟

میر صاحب:۔ میں مہاجر ہوں، لیکن میرے ساتھ تم ہو۔ میری لڑکی ہے میرا لڑکا ہے کچھ تھوڑا بہت سامان بھی ہے۔ یہاں آنے کے بعد

جب اسی طرح مہاجرت کا انعام بندوں کی طرف سے نہیں، خدا کی طرف سے ہمیں ملے گا۔

رابعہ:- آمین۔

میر صاحب:- ارے بھئی سنا تم نے کچھ؟

رابعہ:- کون سی خوشخبری لائے ہو؟ کہیں کوئی نوکری مل گئی اچھی سی؟

میر صاحب:- لاحول ولاقوۃ سارا مزہ کرکرا کر دیا تم نے۔

رابعہ:- کیا ہوا ذرا میں بھی تو سنوں وہ خوشخبری۔

میر صاحب:- اسکول کا نتیجہ شائع ہو گیا؟

رابعہ:- ہاں تو پھر؟

میر صاحب:- تمہارے صاحبزادے اپنے درجے میں اول آئے ہیں۔

رابعہ:- اے سچ؟

میر صاحب:- ہاں بھئی بالکل سچ؟

رابعہ:- تعجب ہے یہ کھلنڈرا لڑکا اوّل کیسے آگیا؟

میر صاحب:- نہیں جی یہ نہ کہو وہ پڑھنے کے وقت پڑھتا ہے کھیلنے کے وقت کھیلتا ہے۔ اور یوں بھی ذہین ہے۔

رابعہ:- اور اختر کا کیا ہوا؟ وہ بھی تو اسی اسکول میں پڑھتا ہے۔

میر صاحب:- وہ بھی اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہے بڑا ہونہار بچہ ہے۔

رابعہ:- ہاں بہت بے زبان اور محنتی۔

رابعہ:- اب محمود کو انعام دینا پڑے گا تمہیں۔ اے لو بڑی عمر وہ آبھی گیا۔ آؤ بیٹا آؤ۔ کہو پاس ہو گئے۔

محمود:- اپنے درجہ میں اوّل آیا ہوں۔ اماں ہاں

رالعہ:۔ میں کیا جانوں تم ہی بتاؤ۔

میر صاحب:۔ (ذرا جوش سے) انجام یہ ہوا کہ وہی لوگ جو کچھ نہ تھے، سب کچھ بن گئے۔ جو مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ انھوں نے زور مکہ فتح کر لیا۔ بلکہ وہاں سے اٹھے تو وقت کی سب سے بڑی بادشاہت کا تختہ الٹ دیا۔ وقت کی سب سے زیادہ مہذب اور متمدن حکومت ایران کا تختہ الٹ دیا۔ ان کی فوجیں بڑھیں اور افریقہ میں پہونچیں انھوں نے مصر فتح کیا۔ ان کا پرچم اندلس پر لہرایا۔ انھوں نے چین پر فاتحانہ یلغار کی۔ انھوں نے افغانستان میں ایک خدا کا کلمہ بلند کیا۔ انھوں نے قسطنطنیہ پر اپنا جھنڈا لہرایا۔ انھوں نے ہندوستان کے علاقے جیت لئے اور جس سرزمین پر ہم بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ انہی کے ایک سترہ سالہ سپہ سالار محمد بن قاسم کی فتح کی ہوئی ہے اور جب سے آج تک یہاں کی فضا تکبیر کے نعروں سے مانوس ہے۔

رالعہ:۔ اُن کی کیا بات۔ وہ اللہ تعالےٰ کے برگزیدہ بندے تھے

میر صاحب:۔ انسان ماں کے پیٹ سے برگزیدگی لے کر نہیں آتا۔ اس کا عمل اس کا کردار، اس کا ایثار، اسے برگزیدہ بناتا ہے ——— برگزیدگی کا راستہ ہمارے لئے بھی کھلا ہے۔ اور ہمیں دعوت دے رہا ہے۔ کہ ہم اس پر چلیں، اس کی طرف بڑھیں۔ اسے اپنی منزل مقصود قرار دیں۔

رالعہ:۔ خدا وہ دن کرے۔

میر صاحب:۔ ہمت نہ ہارو، حوصلہ بلند رکھو وہ دن آئے گا اور جلد آئے

خانصاحب:- خیریت تو ہے سب؟

میر صاحب:- اور تو سب کچھ ہے وہی نہیں،

خانصاحب:- یعنی ـــــ بیمار ہے کوئی خدانہ خواستہ۔

میر صاحب:- جی ہاں محمود بھی کچھ ایسا پڑا ہے کہ اب تو مجھے اس کی زندگی خطرہ میں نظر آرہی ہے۔خدا خیر کرے۔

خانصاحب:- آخر کیا بیمار ہے وہ؟

میر صاحب:- کوئی صحیح تشخیص نہیں ہوسکی۔اب تک لیکن مرض ہے کہ بڑھتا چلا جارہا ہے اور مریض ہے کہ گھلتا چلا جارہا ہے ـــــ

خانصاحب:- علاج کس کا ہے؟

میر صاحب:- یہی اپنے پڑوس میں ایک حکیم صاحب بیچارے بڑے شریف آدمی ہیں۔

خانصاحب:- وہ تو ہم نے مانا کہ شریف ہیں۔لیکن حکیم کیسے ہیں؟

میر صاحب:- اپنے مقدور بھر تو بڑی توجہ سے علاج کرتے ہیں۔

خانصاحب:- میرے خیال میں تو آپ ڈاکٹری علاج کرائیے۔یا پھر اور کوئی حکیم تلاش کیجیے۔

میر صاحب:- موجودہ حالات میں دونوں باتیں ناممکن ہیں۔

خانصاحب:- یہ کیوں بھئی؟

میر صاحب:- نیا حکیم ہو یا کوئی ڈاکٹر دونوں میں سے جو بھی علاج کرے گا۔فیس بھی لے گا۔اور دوا کی قیمت بھی اور یہاں وہی مثل ہے کہ ـــــ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔یہ بیچارے حکیم صاحب چار آنے روز سے زیادہ کا نسخہ نہیں لکھتے۔ان سے معاملہ نبھ رہا ہے؟

رابعہ:۔ شاباش ——— اب تمہیں انعام ملے گا۔

محمود:۔ کیا انعام دیجیے گا؟

میر صاحب:۔ تم کیا لوگے؟

محمود:۔ میں تو سائیکل لوں گا۔

رابعہ:۔ نوج ——— میں تو کبھی نہ لینے دوں گی سائیکل۔

محمود:۔ کیوں اماں ——— روز پیدل جانا پڑتا ہے۔ اسکول اتنی دور ہے میں سائیکل ہی لوں گا۔

رابعہ:۔ نا بیٹے۔ مجھے سائیکل کے خیال سے ہول آتا ہے۔ ہر روز اس سے نہ جانے کتنے حادثے ہوتے رہتے ہیں۔

محمود:۔ بڑی احتیاط سے چلایا کروں گا۔ میری اماں نہیں۔

میر صاحب:۔ بیٹے ضد نہیں کرتے۔ سائیکل واقعی خطرناک چیز ہے تمہیں اور کوئی اچھا سا انعام ملے گا۔

رابعہ:۔ کئی دن سے نصیب دشمناں محمود کی طبیعت خراب ہے،

میر صاحب:۔ ہاں بہت کمزور ہو گیا ہے۔

رابعہ:۔ حکیم صاحب تو بس وہی ایک دوا دیئے جا رہے ہیں۔

میر صاحب:۔ دوا ایک روز اور دیکھو انشاءاللہ ٹھیک ہو جائے گا۔

خانصاحب:۔ ارے بھئی میر صاحب آپ تو عید کا چاند ہو گئے ہیں۔ آج اتنے دنوں کے بعد ملاقات ہوئی وہ بھی بازار میں۔

میر صاحب:۔ ہاں خانصاحب۔ ان دنوں بہت پریشان رہا۔

خانصاحب:- توبہ ہے بھائی کس قسم کے آدمی ہو - بھئی میر صاحب، کسی پہلو
مانتے ہی نہیں ـــ اچھا ایک بات تو مان لو -

میرصاحب:- کون سی بات؟

خانصاحب:- صبح آٹھ بجے میں تمہارے یہاں پہنچ جاؤں گا، ہسپتال چلنے کے
لئے تیار ملنا، وہاں کا ڈاکٹر میرا دوست ہے، داخلہ کرلے گا
محمود کا، وہاں دیکھ بھال بھی اچھی ہوگی۔ اور علاج بھی قاعدہ
کے ساتھ ہوگا ـــ بولو ملوگے تیار؟

میرصاحب:- ضرور تیار ملوں گا -

خانصاحب:- (چل کر) شکریہ آپ کی اس نوازش کا - السلام علیکم

میرصاحب:- وعلیکم السلام -

خانصاحب:- ارے بھئی میر صاحب،

میرصاحب:- آیا بھئی آیا،

خانصاحب:- یہ وکٹوریہ کھڑی ہے محمود کو لے آؤ اندر سے،

میرصاحب:- محمود کو تو لے آؤں لیکن اس کے ساتھ اختر بھی چلے گا۔

خانصاحب:- اختر؟ کیا ہوا اسے؟

میرصاحب:- رات سے وہ سخت نمونیہ میں مبتلا ہے -

خانصاحب:- نمونیہ میں؟

میرصاحب:- ہاں ـــ اور بہت بے چین ہے -

خانصاحب:- اچھا لے چلو، اسے بھی لے چلو -

میرصاحب:- ابھی آیا -

خانصاحب:۔ اور پرہیز ——؟

میر صاحب:۔ میرے تجربہ میں فاقہ سے بڑھ کر کوئی پرہیز نہیں،

خانصاحب:۔ اماں سٹھیا گئے ہو کیا؟ —— کیسی باتیں کر رہے۔ فاقہ کرا کرا کے
لڑکے کی جان لینے کا ارادہ ہے؟

میر صاحب:۔ ارادہ اور مشیّت تو صرف خدا کے لئے ہے ہم کیا اور ہمارا ارادہ
کیا۔

خانصاحب:۔ اچھا چھوڑیئے یہ بحث،

میر صاحب:۔ بہت اچھا السلام علیکم۔

خانصاحب:۔ ارے ارے سنیئے تو۔

میر صاحب:۔ فرمایئے۔

خانصاحب:۔ میرے پاس یہ سو روپے فالتو رکھے ہیں۔ ان سے کام چلایئے
پھر دیکھا جائے گا۔

میر صاحب:۔ شکریہ ۔ میں یہ روپے نہیں لے سکتا۔

خانصاحب:۔ میاں یاروں سے بھی آن دکھا رہے ہو ہم تم بچپن کے کھیلے ہوئے
ہیں۔ ہم سے کیا تکلّف۔

میر صاحب:۔ تعجب ہے۔ پھر بھی آپ نے میرے مزاج اور طبیعت کو نہیں پہچانا۔

خانصاحب:۔ نہیں پہچانا تھا تو اب پہچان لیا —— بھائی یہ قرض دے رہا ہوں
دے دینا جب چاہنا۔

میر صاحب:۔ قرض کس برتے پر لوں؟ —— یا تمہیں دھوکہ دوں گا یا آپ کو

خانصاحب:۔ اچھا قرضِ حسنہ سمجھ لیجئے۔

میر صاحب:۔ ہاں ٹھیک ہے، لیکن اس کا میں اپنے تئیں مستحق نہیں سمجھتا۔

میر صاحب:۔ اس کی حالت زیادہ خطرناک تھی ۔ اسے ہسپتال میں داخل کر دیا۔

رابعہ :۔ محمود کے بارے میں ڈاکٹر نے کیا کہا؟

میر صاحب:۔ دوا دی ہے نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔

رابعہ :۔ ہائے میرا دل دھڑک رہا ہے، زور زور سے ، نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے ، اس کا کیا مطلب؟

(رونے لگتی ہے)

میر صاحب:۔ خدا پر بھروسہ رکھو، تمہارے رونے سے محمود کیا اچھا ہو گا؟

رابعہ :۔ خدا کے لئے بتا دو، ڈاکٹر نے کیا کہا؟ کچھ زیادہ خطرہ تو نہیں ہے، میرے بچے کے لئے؟

میر صاحب:۔ خطرہ بہر حال خطرہ ہے، خواہ وہ زیادہ ہو یا کم ——— آنسو پونچھ ڈالو، وضو کرو، خدا سے گڑگڑا کر اس کی صحت کے لئے دعا مانگو، دکھی دلوں کی پکار اس تک فوراً پہنچتی ہے، میں مسجد جا رہا ہوں۔

حکیم صاحب:۔ کیا حال ہے محمود کا؟

میر صاحب:۔ رات سے غفلت میں پڑا ہے۔ حکیم صاحب! چلئے ذرا دیکھ لیجئے چل کر۔ اس کی ماں بہت بے قرار ہو رہی ہے بہن کی بھی روتے روتے آنکھیں سوج گئیں ہیں۔

حکیم صاحب:۔ چلئے ——!

(وکٹوریہ کے چلنے کی آواز)

خانصاحب:۔ کہیئے ڈاکٹر صاحب، آپ نے دونوں لڑکوں کا معائنہ کر لیا؟

ڈاکٹر:۔ جی ہاں ـــــ دونوں کی حالت تشویش انگیز ہے۔ یکساں طور پر خطرہ دونوں کے سر پہ منڈلا رہا ہے۔

خانصاحب:۔ پھر اب کچھ نہیں ہو سکتا؟

ڈاکٹر:۔ ہم کوشش کر سکتے ہیں، نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔

خانصاحب:۔ داخلہ کر لیجیئے دونوں کا۔

ڈاکٹر:۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں صرف ایک بستر خالی ہے۔ لہٰذا ایک ہی کا داخلہ ہو سکتا ہے۔

خانصاحب:۔ اور دوسرا؟ دوسرے کا کیا ہوگا۔

ڈاکٹر:۔ یا گھر لے جایئے یا کسی دوسرے ہسپتال میں کوشش کیجیے۔

خانصاحب:۔ اچھا، تو دونوں میں جو بڑا لڑکا ہے اسے داخل کر لیجیے، دوسرے کو ہم لے جاتے ہیں۔

میر صاحب:۔ نہیں، ـــــ چھوٹے کو داخل کیجیے بڑا واپس جائے گا۔

ڈاکٹر:۔ جیسا کہیئے، مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے؟

خانصاحب:۔ میر صاحب، میر صاحب،

میر صاحب:۔ بھئی اس معاملہ میں کچھ نہ کہیئے، خانصاحب اختر یہاں رہے گا محمود کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا

رابعہ:۔ تم محمود کو تو واپس لے آئے، میرا بچہ اختر کہاں رہ گیا؟

نیم تاریخی فیچر

قاضی کا انصاف

کردار

عذرا	ایک کنیز
نصر بن حمید	خلیفہ حکم بن ہشام کا مصاحب خاص
سہل	زیاد بن میمون کا دوست
زیاد بن محمود	عذرا کا مالک، عاشق
خلیفہ حکم بن ہشام	فرمانروائے قرطبہ
قاضی ابوسعید	قاضی شہر

عود دھیمے اور مدھم سروں میں بج رہا ہے۔ گنگنانے کی آواز آرہی ہے
آواز جاری ہے۔ یکایک مردانہ قدموں کی آہٹ اور پھر دفعتہً عود کی
بند ہو جاتی ہے۔ دروازہ کھلنے کی آواز

میر صاحب:۔ کیوں بیٹا اختر اب طبیعت ٹھیک ہے بالکل؟ یہاں ہسپتال میں جی تو نہیں گھبراتا؟

اختر:۔ اب تو اچھا ہوں، ڈاکٹر صاحب کہتے تھے، کل ہسپتال سے چھٹی مل جائے گی تمہیں۔

میر صاحب:۔ کل ہم آکر تمہیں لے جائیں گے،

اختر:۔ محمود بھیّا کیسے ہیں؟

میر صاحب:۔ اچھے ہیں، تمہیں بہت یاد کرتے ہیں،

میر صاحب:۔ ارے خانصاحب آپ اس وقت یہاں کہاں؟

خانصاحب:۔ آپ کہاں غائب تھے اتنی دیر سے؟

میر صاحب:۔ ہسپتال گیا تھا، اختر کے پاس، اب اچھا ہے کل آجائے گا۔

خانصاحب:۔ آپ اندر جائیے، فوراً ——"

میر صاحب:۔ ہاں جا رہا ہوں، کوئی خاص بات؟

(اندر سے رونے کی آواز، ہلکی ہلکی)

(میر صاحب اندر آتے ہیں)

زینت:۔ ابّا محمود!

(رونے لگتی ہے)

رابعہ:۔ میرا بچّہ،

(رونے لگتی ہے)

میر صاحب:۔ (وقار کے ساتھ) اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ ہ

(سسکیوں کی آوازیں جاری ہیں)

کنیز ـــــــ عذرا میں نے فیصلہ کر لیا ہے کل صبح ہوتے ہی پہلا کام یہ کرونگا کہ تمہیں آزاد کر دونگا۔

عذرا۔ (گھبرا کر) نہیں، نہیں، میرے آقا یہ ظلم نہ کیجئے گا۔ میں آزاد ہونا نہیں چاہتی۔ میں آپکو نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ ساری زندگی آپکی باندی بن کر گذار دونگی۔ وعدہ کیجئے کہ آپ مجھے آزاد نہیں کریں گے۔"

"میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔

(سسکیوں کی آواز)

"میں تمہیں ضرور آزاد کر دونگا۔

(سسکیاں جاری تھیں)

"اور آزاد کرنے کے بعد تم سے نکاح کر لونگا۔ پھر تم مجھے آقا نہ کہہ سکو گی، پھر تم کنیز نہ رہو گی پھر تم میری شریک حیات مونس جان اور رفیق زندگی بن جاؤ گی۔ بولو کیا اب بھی تمہیں کچھ اعتراض ہے؟

عذرا۔ آپ کتنے کریم، کتنے حلیم اور کتنے رحیم ہیں۔ جی چاہتا ہے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ لیکن شکریہ کا بڑے سے بڑا لفظ بھی میرے جذبات کا ترجمان نہیں بن سکتا۔

"واقعی تم میرا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہو؟

عذرا۔ ہاں میرے آقا چاہتی ہوں کہ آپ کا شکریہ ادا کروں لیکن الفاظ نہیں ملتے۔

شکریہ ادا کرنا چاہتی ہو مگر الفاظ نہیں ملتے — یہی بات ہے نا؟"

عذرا۔ ہاں میرے آقا۔

"مجھے تمہاری اس بے بسی پر رحم آتا ہے کیا تمہاری مدد کروں؟

عذرا۔ ضرور میرے آقا۔

عذرا:۔ میرے آقا آپ آ گئے۔؟

ہاں میں آگیا عذرا۔

عذرا:۔ تھوڑی دیر کے لئے بھی آپ باہر جاتے ہیں تو گھر کی رونق اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

نہیں عذرا یہ نہ کہو —— میں اپنے ساتھ گھر کی رونق نہیں تمہاری یاد اپنے ساتھ لے جاتا ہوں تمہاری طرح وہ بھی میری زندگی کی ساتھی بن گئی ہے۔

عذرا:۔ میرے آقا مجھے اپنی خوش بختی پر ناز ہے، مجھ جیسی کنیزیں ہر روز بازار میں بکا کرتی ہیں یہ آپ کی بندہ نوازی ہے کہ آپ نے مجھے منہ مانگے داموں خرید لیا پھر ایسا برتاؤ کیا ایسی آسائشیں بہم پہونچائیں کہ میں اپنا سارا غم بھول گئی۔۔

(ٹھنڈی سانس لے کر)

سوچتی ہوں اگر آپ کے سوا کوئی اور مجھے خرید لیتا تو کیا حشر ہوتا میرا؟

"تم ازل سے میرے مقدر میں لکھی جا چکی تھیں پھر کیسے ممکن تھا کہ کوئی اور تمہیں خریدتا؟

—— تصور کے موقلم نے میرے لئے حسن و جمال خوبی و رعنائی عفت و عصمت عشوہ و ادا کی جو تصویر کھینچی تھی سچ کہتا ہوں عذرا تم ہو بہو وہی ہو۔

عذرا:۔ میرے آقا کتنے اچھے ہیں آپ"

"تم مجھے آقا کیوں کہتی ہو؟

عذرا:۔ کنیز اگر اپنے مالک کو آقا نہ کہے تو کیا کہے؟

(دروازہ کھلنے کی آواز)

"کون ہو تم؟"

"پولیس کے سپاہی"

"کیا کام ہے؟"

سپاہی:- "ہم تلاشی لینا چاہتے ہیں اس گھر کی"

"تلاشی؟ ــــــ میرے گھر کی؟ ــــــ میں لیٹرا نہیں، چور نہیں، ڈاکو نہیں، اس طرح نا وقت آنے اور تلاشی لینے کا مطلب؟

سپاہی:- "تم سب کچھ ہو ــــ لیٹرے بھی، چور بھی ڈاکو بھی ــــــ

"میں؟"

سپاہی:- "ہاں تم، اتنی حیرت کیوں ہے؟ ہٹو راستہ سے اندر جانے دو۔"

"یہ میرا گھر ہے۔"

سپاہی:- "معلوم ہے ہمیں!"

دوسرا سپاہی:- "گھر ہم اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے اطمینان رکھو؟"

"نہیں تم میرے گھر میں نہیں آسکتے!"

سپاہی:- "یہ یوں نہیں مانے گا۔"

دوسرا سپاہی "ہٹ"

"نہیں"

دوسرا سپاہی:- "لے ابھی تو کیا یاد کریگا استاد"

(مارپیٹ کی آواز ــــــ کوئی گرتا ہے)

"آہ"

علارا:- بدیع کر) یہ کیا ہوا میرے آقا آپ کو زخمی کر دیا۔ ان ظالموں نے۔

"تو ایسا کرو — ابھی جب میں آیا ہوں تم عود بجا رہی تھیں — اور کچھ گنگنا بھی رہی تھیں۔ بس وہی ساز اور وہی آواز مجھے سنا دو، مگر یہ ادا ہو جائے گا — عذرا — میرے صبر کا زیادہ امتحان نہ لو۔ اپنی ان نازک انگلیوں کو جنبش دو کہ ان بے جان تاروں میں زندگی کی لہر دوڑا دیں۔

تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز!

اپنے ان جاں بخش ہونٹوں کو حرکت دو کہ وہ نغموں کی بارش شروع کر دیں — عذرا — عذرا —

عذرا:۔ "میرے آقا — میرے آقا —

دیکھو دیکھو۔ چاند نے اپنی گردش روک دی ستارے چلتے چلتے رک گئے۔

عذرا:۔ (گھبرا کر) یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میرے آقا؟

"یہ سب تمہارا نغمہ سننے کے لیے بیتاب ہیں۔

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

عذرا:۔ یہ کون ہے۔ دیکھئے جاکر دروازہ پر مجھے نہیں معلوم میں جاننا بھی نہیں چاہتا کون ہے

(کھٹ کھٹ)

عذرا:۔ کوئی ہمارا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

"کوئی بھی ہو اس وقت دروازہ نہیں کھولونگا"

دروازہ کھولو — دروازہ کھولو۔"

"کون ہے؟"

"دروازہ کھولو، ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے"

عذرا:۔ (گھبرا کر) یہ کون لوگ ہیں؟

"جا کے دیکھتا ہوں —"

سے دیکھے، تجھے کس شرع و آئین نے اجازت دی ہے کہ ایک غیر عورت سے یوں ہم کلام ہو؟ ——— کیا تو امیرالمومنین کے انصاف سے نہیں ڈرتا —؟"

نصر "(قہقہہ لگا کر) امیرالمومنین ——— انصاف!! زیادہ باتیں نہ کر چل میرے ساتھ!"

عذرا "کہاں لے چلو گے مجھے؟"

نصر "امیرالمومنین، حکم بن ہشام فرماں روائے قرطبہ کے پاس ———

عذرا (مچل کر) نہیں ——— میں نہیں جاؤں گی، میں یہیں رہوں گی۔"

نصر "خاموش ——— تجھے چلنا پڑے گا میرے ساتھ

عذرا "میں نہیں جاؤں گی"

نصر "سپاہیو ——— یہ اس طرح نہ مانے گی، اسے جکڑ لو گرفتار کر لو۔

(ہاتھا پائی دھینگا مشتی کی آواز)

عذرا "یہ میرا گھر ہے میں یہیں رہوں گی"

زینے سے اترنے کی آواز)

میں نہیں جاؤں گی۔

آواز رفتہ رفتہ مدھم ہو کر دور ہو جاتی ہے
اور فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے

(کرا ہنے کی آواز)

"(کمزور آواز میں) عذرا، عذرا (پھر زور سے) عذرا، عذرا۔

سپاہی :۔ "تم کیوں گھبراتی ہو۔ تمہیں کوئی زخمی نہیں کر سکتا۔"

دوسرا سپاہی: "زخمی تو تم نے کیا ہے"

عذرا :۔ (گھبرا کر) غلط جھوٹ، میں نے کسی کو زخمی نہیں کیا"

تیسرا سپاہی:۔ "اللہ ری معصومیت"

پہلا سپاہی "انہی اداؤں نے تو گھائل کیا ہے ——— خلیفہ کے مصاحب خاص نصر بن حمید کو"

سپاہی "ارے یار یہ تو بے ہوش ہوگیا"

دوسرا سپاہی "ہو جانے دو۔ مرا تو نہیں۔ اور مر بھی جائیگا تو کیا ہوگا"

عذرا "نہیں نہیں، یہ نہ کہو، وہ نہیں مریں گے، وہ زندہ رہیں گے، وہ بڑے اچھے آدمی ہیں، ظالمو راستہ سے ہٹو مجھے مرہم پٹی کرنے دو"

(زینے پر چڑھنے کی آوازیں، جیسے کئی آدمی آ رہے ہوں)

سپاہی (آہستہ سے) معلوم ہوتا ہے سردار نصر بن حمید آ رہے ہیں"

دوسرا سپاہی "(سرگوشی کے لہجہ میں) ہاں وہی معلوم ہوتے ہیں۔"

(کچھ لوگوں کے اندر داخل ہونے کی آواز)

نصر بن حمید "کہاں ہے زیاد بن میمون جس نے اس کنیز کو خریدا تھا؟"

سپاہی "یہ پڑا ہے بے ہوش ——— یہ تو لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگیا تھا"

نصر "بس تو اپنی سزا کو پہونچ گیا ——— اے جاریہ تیرا کیا نام ہے؟"

عذرا "(کانپتی ہوئی آواز سے) عذرا"

نصر "عذرا ——— اوہو کتنا خوبصورت، کتنا حسین و جمیل نام ہے ——— اتنا ہی خوبصورت جتنی تو ہے، اتنا ہی حسین و جمیل جتنا تیرا سراپا ہے"

عذرا "اے شخص تو کون ہے؟ ——— تجھے کیا حق ہے کہ مجھے بے باک نظروں

بتاؤ کیا اتنے بڑے حادثہ پر صبر کیا جا سکتا ہے؟"

سہیل "صبر کے ساتھ جدوجہد کی جا سکتی ہے۔"

زیاد "نہیں یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ نصر کے مقابلہ میں انصاف نہیں مل سکتا ٹھوکریں مل سکتی ہیں۔"

سہیل "جب تک قاضی ابوسعید مسند قضا پر متمکن ہیں۔ انصاف کا ہاتھ خلیفہ بھی نہیں پکڑ سکتا۔"

زیاد "قاضی ابوسعید ——— ہاں تم ٹھیک کہتے ہو سہیل میں قاضی ابوسعید کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا یا تو وہاں سے اپنی عذرا کو لے کر آؤں گا ورنہ وہ سنگ آستاں ہوگا اور میرا لہولہان سر۔

عذرا "میں آپ کو، آپ کی دولت کو آپ کی دی ہوئی ہر نعمت کو حقارت کے ساتھ ٹھکراتی ہوں۔ میں ایک دفعہ خریدی گئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بک گئی۔ اب ہفت اقلیم کی دولت بھی مجھے نہیں خرید سکتی۔ زندگی کی آخری سانس تک میں زیاد اور صرف زیاد کا دم بھرتی رہونگی۔

نصر "(قہقہہ لگا کر) ——— تیرے غصہ میں بھی بانکپن ہے تیرا جلال بھی تیرے جمال سے کم دلکش نہیں ——— تو چپ کیوں ہو گئی؟ اپنے تند و تیز تلخ اور ترش الفاظ کا سارا ذخیرہ استعمال کر ڈال۔ تیرے الفاظ کی تندی اور تیزی میں وہی لطف آتا ہے جو مے ارغوانی کے چھلکتے ہوئے جام میں ——— جس نے ذرا بھی برا نہیں مانا۔

زیاد "یا اللہ یہ کیسا انقلاب آگیا؟ عذرا کیا ہوئی؟ ——— یہ پولیس والے کیوں آئے تھے؟ آہ، کیا وہ عذرا کو بھی اپنے ساتھ لے گئے؟

(کسی کے آنے کی آہٹ)

زیاد "کون؟ ——— سہل آؤ ——— آؤ؟"

سہل "زیاد تم بہت کمزور ہو لیٹے رہو۔"

زیاد "ہاں لیٹوں گا ——— لیکن بستر پر نہیں قبر میں ——— یہ ظلم و ستم کا پہاڑ یک بیک مجھ پر ٹوٹ پڑا، سہل، میں نے کسی کا کیا لگاڑا تھا؟ سمجھ میں نہیں آتا؟ پولیس والے یہاں کیوں آئے اور آئے تھے تو مجھے مار ڈالتے، لیکن عذرا کو کیوں لے گئے؟

سہل "پولیس والوں نے جو کچھ کیا نصر بن حمید کے حکم سے کیا۔"

زیاد "نصر بن حمید خلیفہ کا منہ چڑھا مصاحب؟"

سہل "ہاں وہی۔"

زیاد "نہیں نہیں تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہاں صرف پولیس والے آئے تھے نصر نہیں آیا تھا۔"

سہل "وہ آیا تھا میں نے خود دیکھا، میں جھروکے سے سب کچھ دیکھ رہا تھا سب کچھ سن رہا تھا، وہی عذرا کو زبردستی لے گیا۔ کیسا کیسا چیخی چلّائی بے چاری مگر ظالم نے ایک نہ سنی۔"

زیاد "آہ ——— عذرا! اب میں کیا کروں گا۔ میری زندگی ویران ہو گئی میں برباد ہو گیا۔ زندگی میرے لئے زہر بن گئی موت تو کہاں ہے؟

سہل "ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہو زیاد؟"

زیاد "تو کیا تمہارے رستے سے صبر کر دوں، اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر

نصر "دیوار ہم گوش دارد"

خلیفہ "یہاں کی دیواریں بھی اسی طرح بہری اور گونگی ہیں جس طرح اس خلوت گاہ خاص کے خدام پہلے یہ تو بتاؤ تم اتنے دن کہاں غائب رہے۔"

نصر "غلام مصر گیا تھا۔ امیر المومنین۔"

خلیفہ حکم "ہم نے سنا ہے کہ مصر کے بازار میں دنیا جہان کی خوبصورت اور پری جمال کنیزیں بکتی ہیں۔ کیا سچ ہے؟

نصر "بالکل سچ وہاں حسن کے ایسے نمونے نظر آتے ہیں کہ کوہ قاف کی پریاں بھی ان کے آگے پانی بھرتی ہیں"

خلیفہ "پھر تم نے کچھ خریداری کی؟"

نصر "نقد جان دے کر ایک نایاب تحفہ امیر المومنین کے لئے لایا ہوں"

خلیفہ "کیا چیز ہے وہ"

نصر "وہ ایک کنیز ہے اس کا گانا سن کر ناہید فلک کو پسینہ آ جاتا ہے اس کا رقص بے محابا دیکھ کر طاؤس اپنا ناچ بھول جاتا ہے۔ اس کے دانت ہیں جیسے درعدن۔ اس کے ہونٹ سیب کی قاش اس کی آنکھیں بادام کی طرح ——

خلیفہ "کہاں ہے وہ؟

نصر "اب تک وہ میرے سیہ خانہ کی روشنی تھی، آج سے قصر سلطانی کے بام و در اس کی ضیا سے جگمگائیں گے"

خلیفہ ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں"

نصر وہ صرف اسی لئے ہے کہ حرم سلطانی میں داخل ہو کر ظل الہٰی کی

عذرا "یہ لگاوٹ کی باتیں مجھ پر اثر نہیں کر سکتیں —"

نصر "آخر تو چاہتی کیا ہے؟"

عذرا "آپ کے پنجۂ ہوس سے رہائی"

نصر "(قہقہہ لگا کر) رہائی ——— اگر میں تجھے رہا کر دوں تو بھی تو زیاد کے پاس نہیں جا سکتی"

عذرا "(سہم کر) کیوں؟"

یہ میرا فیصلہ ہے

عذرا "(جوش سے) ہاں یہ تیرا فیصلہ ہے اور مجھے بتایا گیا ہے کہ تو اپنا فیصلہ نہیں بدلا کرتا۔"

نصر "بالکل سچی بات ہے میرا فیصلہ ہمیشہ اٹل ہوتا ہے"

عذرا "اگر تو خدا ہے تو بے شک تیرا فیصلہ قطعی اور آخری ہے۔ لیکن اگر تو بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک حقیر بندہ ہے تو کان کھول کر سن لے تیرے فیصلہ سے کہیں زیادہ مضبوط مکڑی کا جالا ہے۔"

نصر "خاموش بے ادب چھوکری تو حد سے آگے بڑھ رہی ہے کوئی ہے!"

آواز "حاضر ———"

نصر "اسے لے جاؤ ——— یہ گستاخ لونڈی ابھی تربیت کی محتاج ہے"

(قصر خلافت۔ خلیفہ ہشام سے نصر مخاطب ہے)

نصر امیر المومنین غلام تخلیہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔

خلیفہ ہشام "جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو یہاں کوئی نہیں ہے اور ہمارے اذن کے بغیر کسی میں جرأت نہیں کہ قدم رکھ سکے۔"

نصر "ظل اللہ۔"

خلیفہ حکم "اس کنیز کو حرم شاہی میں پہونچا دیا جائے۔ نصر یہ کنیز تم نے کتنے میں خریدی تھی۔؟"

نصر غلام کی طرف سے آقا کی خدمت میں یہ ایک حقیر تحفہ ہے۔"

خلیفہ حکم "ہم نے اس تحفہ کو قبول کر لیا۔ اس خیر خواہی پر تم انعام کے سزاوار ہو۔ جاؤ ہم نے حکم دیدیا ہے۔ خزانۂ سلطانی سے ایک لاکھ اشرفیوں کے توڑے لیلو۔"

نصر تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(قاضی ابو سعید کا ایوان عدالت)

زیاد (بلند آواز سے) انصاف۔ انصاف!

قاضی ابو سعید "تم کون ہو تمہیں کیا شکایت ہے؟"

زیاد "قاضی صاحب میں لٹ گیا، برباد ہوگیا، میری زندگی غارت کردی گئی، میری زندگی کا سکھ چھین لیا گیا"

قاضی خدا کے بندے اتنے پریشان کیوں ہوتے ہو؟"

زیاد "آہ! میرا قرار چھین لیا گیا میرا سکون لوٹ لیا گیا، میں کہیں کا نہ رہا۔"

قاضی "اطمینان رکھو تمہارے ساتھ پورا انصاف ہوگا۔"

زیاد "انصاف ہوگا! میرے ساتھ انصاف ہوگا! (ٹھنڈی سانس بھر کر) یہ طفل تسلی ہے قاضی صاحب میرے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا۔"

قاضی "بہت سہمے ہوئے ہو شاید تم پر کوئی بڑا ظلم ہوا ہے۔ استغاثہ پیش کرو

دل بستگی کا سبب بنے لیکن ـــــ

خلیفہ حکم لیکن کیا؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

"وہ آہوئے وحشی ہے ابھی تادیب و تربیت کی ضرورت ہے"

خلیفہ "یہ ہونہار ہے گا کنیزانِ حرم راہ پر لے آئیں گی اسے ہماری خدمت میں پیش کرو۔"

نصر "بہت خوب ظل الٰہی ابھی تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔"

خلیفہ حکم "ہم منتظر ہیں"

نصر "ظل اللہ، یہ ہے وہ دُرِ بے بہا، جسے یہ غلام اپنی جان خطرہ میں ڈال کر لایا ہے۔"

خلیفہ "ہوں (سسکیوں کی آواز) لیکن یہ اتنی دلگیر اور سوگوار کیوں نظر آرہی ہے (سسکیاں) اے جاریہ تیرا کیا نام ہے (سسکیاں)

نصر "ظل اللہ اس کنیز کا نام عذرا ہے۔ اسے دیکھ کر قبیلہ عذرا کی وہ نازنین یاد آجاتی ہیں جن کے حسن دلآویز اور چشم سحر خیز نے نوجوانان عرب کا قرار چھین لیا تھا، جن کے سامنے شہسوار اور تیغ زن سر جھکاتے تھے۔ جن کے حاصل کرنے کے لئے میان سے تلواریں نکلتی تھیں، فضا میں نیزے چمکتے تھے، ریت کے سمندر میں خون کے دریا بہتے تھے ـــــ قتل و غارت اور کشت و خون کا بازار گرم ہو جاتا تھا۔

خلیفہ حکم "یہ بھی تو کہو۔ شاعر شعر کہتے تھے تشبیب سے کام لیتے تھے اور ان کا شعر زبان عوام پر جا کر ترانے بن جاتے تھے۔"

کرونگا۔ لیکن آہ .... روتے لگتا ہے)

قاضی (بلند آواز) عذرا تمہیں ملے گی (اور بلند آواز سے) نصر بن حمید کو حاضر کیا جائے۔

قاضی نصر تم کیا کہتے ہو گواہ گذر چکے تمہارا جرم ثابت ہو چکا"

نصر میں بیزین خرید رہا تھا زیاد نے بیچ میں ٹانگ اڑا دی میں نے دس ہزار درہم کہے اس نے ۲۰ ہزار میں سودا کر لیا یہ گستاخی میری غیرت کے لئے تازیانہ ثابت ہوئی اور ....

قاضی "اور عذرا کو تم نے چھین لیا، کیوں"

نصر "جی ہاں میں نے اپنے لئے نہیں ظل اللہ کے لئے۔"

قاضی "اور ظل اللہ نے (کڑک کر) اس سودے کو منظور کر لیا؟

نصر "ظل اللہ کی شخصیت ہر اعتراض اور ہر احتساب سے ماوراء ہے وہ خلیفۃ اللہ ہیں ظل اللہ ہیں امیر المومنین ہیں۔"

قاضی (بلند آواز سے) خاموش

نصر (گھبرا کر) میں امیر المومنین کا ....

قاضی "خاموش یہ ایوان عدالت ہے یہ وہ مسند قضا ہے جس پر رسول کریم اور خلفائے راشدین بیٹھ چکے ہیں۔ اس مسند پر خدا کے سوا کسی کی بالادستی قائم نہیں ہو سکتی، حکم امیر المومنین کو بھی اسی طرح حاضر ہونا پڑے گا۔ جس طرح زیاد آیا ہے۔ جس طرح نصر طلب کیا گیا ہے اور اگر وہ مجرم ثابت ہو گیا تو امیر المومنین ہونے کے باوجود اسے سزا بھی ملے گی اسلام کا انصاف سلطان و گدا وزیر و فقیر

زیاد — کس کے خلاف؟"

قاضی — "ملزم کے خلاف"

زیاد — "آہ! یہی تو نہیں کر سکتا۔

قاضی — کیا نہیں کر سکتے؟ جھجکتے کیوں ہو؟ ڈرتے کس سے ہو؟ ملزم کا نام کیوں نہیں لیتے؟ کیا یہ سمجھتے ہو ہمارا دست انصاف ملزم تک نہیں پہونچ سکتا؟

زیاد — "یہی بات ہے قاضی صاحب ملزم کی شخصیت اتنی بڑی ہے کہ وہاں آپ کے عدل وانصاف کے پاؤں کانپیں گے۔"

قاضی — (جوش سے) "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا" عدالت اسلامی کا اقتدار بڑی سے بڑی شخصیت کو اس کٹہرے میں لاکر کھڑا کر سکتا ہے تم استغاثہ پیش کردہ ملزم کا نام بتاؤ۔"

زیاد — "قاضی صاحب ایسا نہ ہو میرے ساتھ آپکا انصاف بھی رسوا ہو"

قاضی — "ایسا نہیں ہوگا"

زیاد — "تو میں عرض کرتا ہوں پہلا ملزم نصر بن حمید ہے۔ خلیفہ کا معتمد خاص جس نے گھر میں گھس کر میری کنیز عذرا کو جبراً چھینا مجھے زدو کوب کیا۔"

قاضی — "ہوں' اور دوسرا ملزم؟"

زیاد — "اور دوسرا ملزم خود خلیفہ ہے۔ جس نے عذرا کو خریدا اور مجھے زندگی سے محروم کر دیا (بیتابی کے ساتھ) قاضی صاحب میں عذرا سے محبت کرتا ہوں' اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا' وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے آزاد کر کے نکاح

نیم تاریخی فیچر

عبدالعزیز والیٔ اندلس کا قتل

کردار

عبدالعزیز بن موسیٰ .... والیٔ اندلس
عرب .... ایک عام مسلمان
کنیز ....
ملکہ ..... عبدالعزیز کی عیسائی بیوی

ہجرت نبویؐ کو تقریباً ایک صدی گذری ہے عرب فتوحات کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔
موسیٰ بن نصیر، اس کا غلام طارق بن زیاد اور اس کا بیٹا عبدالعزیز اندلس کے قلعوں اور شہروں کو فتح کرتے چلے جاتے ہیں۔
عبدالعزیز موسیٰ کا چہیتا بیٹا تھا۔

سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے نہ وہ کسی سے مرعوب ہوتا ہے نہ کسی کی رعایت کرتا ہے۔ حکم خلیفۃ المسلمین کے نام فرمانِ حاضری صادر کیا جائے۔

قاضی "حکم تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو؟"

خلیفہ حکم "مجھے نصر نے دھوکا دیا اس نے کہا کہ وہ مصر سے میرے لئے کنیز لایا ہے میں نے اسے قبول کر لیا۔ مجھے قطعاً معلوم نہ تھا کہ وہ زیاد کی ہے۔ اپنی غلط فہمی پر مجھے ندامت ہے۔ میں کنیز زیاد کو واپس کرتا ہوں، زیاد آج سے میرا دوست ہے۔ اور عذرا بہن ہے ان دونوں کی دھوم دھام سے شادی میں اپنی طرف سے کرونگا جاگیر بخشونگا۔ انعام دونگا۔ زندگی بھر یہ دونوں میرے لطف و کرم کے سایہ میں رہیں گے اور نصر کے لئے۔

قاضی ابوسعید نصر کے لئے ہم پچاس دروں کی سزا تجویز کرتے ہیں"

حکم "بسر و چشم۔"

قاضی ابوسعید "زیاد بتاؤ تم مطمئن ہوگئے۔ انصاف تمہیں ملا؟"

زیاد "مل گیا۔ میں نے سب کچھ پالیا۔ آپ نے انصاف کی لاج رکھ لی آپ نے بتا دیا۔ اسلام اب بھی زندہ ہے۔ ایک معمولی انسان کا استغاثہ خلیفہ کے خلاف سنا جا سکتا ہے۔ ایک معمولی شخص کی طرح ملزم کے کٹہرے میں خلیفہ تک کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ اس سے باز پرس ہو سکتی ہے اس کا تفصیہ کیا جا سکتا ہے اسے سزا دی جا سکتی ہے۔ اسلام زندہ باد"

ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر شدہ

یں وہ سب سے بلند مرتبہ پر فائز تھا بربر بھی اسے خراج تحسین ادا کرتے تھے اور عرب بھی اس کے آگے سر جھکاتے تھے۔

اسپین کے مقتول بادشاہ راڈرک کی بیوہ سے عبدالعزیز نے محض الیف قلب اور دلجوئی کے خیال سے شادی کر لی تھی، اس رشتہ نے اسپین کے غیر مسلم باشندوں میں عبدالعزیز کو اور زیادہ معزز اور محترم بنا دیا تھا۔

راڈرک شاہ اسپین کی بیوی اپنے شوہر کے مرنے کے بعد بے لبسی اور کس مپرسی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ کل تک قصر سلطانی میں اور نہ صرف قصر سلطانی میں بلکہ سارے ملک میں لوگ اس کے اشارہ چشم کے منتظر رہتے تھے۔ اور اب وہ ایک بیوہ عورت تھی۔ جس کا نہ کوئی والی تھا نہ کوئی وارث، جس کی نہ کوئی عزت تھی، نہ دبدبہ۔ جو اپنی وقعت کھو چکی تھی۔ لیکن عبدالعزیز نے اسے اپنی رفیقۂ حیات بنا کر ایک طرح اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑا اور اسے ایک نئی زندگی اور نئی خوشی عطا کی دوسری طرف اس نے اندلس کے باشندوں پر یہ بھی ثابت کر دیا کہ مسلمان قوم فاتح ہونے کے باوجود مفتوح کے ساتھ برابری اور مساوات کا برتاؤ کرتی ہے۔

جمعہ کی نماز کے بعد عبدالعزیز اپنے دارالامارۃ میں عرض حال اور اظہار خیال کے لئے ہر کس و ناکس کو اذن باریابی عطا کرتا تھا۔ وہ ہر ایک کی بات سنتا تھا۔ اس کے خیالات سے واقفیت حاصل کرتا تھا۔ پھر اپنی رائے اور فیصلہ کا اظہار کر دیتا تھا۔ آج بھی جمعہ کا دن ہے اور عبدالعزیز اپنے دارالامارۃ میں بیٹھا ہوا ہے۔

وہ بہت اچھا سپاہی، بہت اچھا سپہ سالار بہت اچھا سردار قوم اور بہت اچھا انسان تھا۔

اس نے بڑے بڑے معرکے سر کئے، اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میدان جنگ میں شجاعت اور دلیری کی یادگار مثالیں قائم کیں اس نے اپنے چھوٹے سے لشکر کو اس طرح لڑایا کہ وہ دشمن کی بڑی بڑی فوجوں پر غالب آیا، نا امیدی، مایوسی، خوف و دہشت اور پست ہمتی یہ وہ الفاظ تھے جن کے نام سے عبدالعزیز نا آشنا تھا۔ وہ کبھی اور کسی حالت میں مایوس نہیں ہوتا تھا۔ نازک سے نازک موقع پر اس کے ہوش و حواس قائم رہتے تھے بڑے سے خطرے کو وہ ہیچ سمجھتا تھا۔ بڑی سے بڑی قوت اور طاقت کو وہ خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس نے اندلس کے متعدد شہر فتح کئے۔ امیورقہ منورقہ، ہرورینہ اور سوس اقصیٰ کو زیر نگیں کرنے والا وہی موسیٰ کا جیالا فرزند عبدالعزیز تھا۔ جس کی دلآوری اور بہادری کے کارناموں سے تاریخ کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔

دربار خلافت سے موسیٰ کو واپسی کا حکم ملا۔ اس نے امارت کی مسند نشینی چھوڑی اور ایک وفادار سپاہی کی طرح دربار خلافت کی طرف چل پڑا۔ جاتے وقت موسیٰ نے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اپنی جگہ پر سپہ سالار فوج اور امیر حکومت مقرر کر دیا۔

عبدالعزیز کے اس انتخاب پر اندلس کے باشندوں نے خوشی کا اظہار کیا، اس لئے نہیں کہ وہ موسیٰ جیسے سپہ سالار اعظم کا بیٹا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ تدبیر و دانش سپہ گری اور شجاعت کے اعتبار سے اعیان و اشراف عرب

کو مل سکتی ہے۔ اگر مسلمان سے کوئی لغزش ہو گی تو جس طرح ایک غیر مسلم اپنی خطا کاری پر عقوبت کا سزا وار قرار دیا جائے گا اسی طرح وہ مسلمان بھی سزا سے نہیں بچ سکتا۔

عرب :۔ اگر میرا دعویٰ خارج ہو گیا تو میری توہین ہو گی۔

عبدالعزیز :۔ تمہاری توہین برداشت کی جا سکتی ہے۔ لیکن اسلام کی توہین کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ تم چاہتے ہو کہ تمہارے فخر و اعزاز میں فرق نہ آئے۔ خواہ اسلام کی عزت پر حرف آ جائے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ جب تک مسند امارۃ پر موسیٰ بن نصیر کا بیٹا عبدالعزیز متمکن ہے۔ یاد رکھو اس سے تم وہی پاؤ گے۔ جس کے مستحق ہو۔ وہ نہ کسی پر ظلم کر سکتا ہے نہ کسی کی رعایت کر سکتا ہے۔

راڈرک شاہ اسپین کی بیوہ اور عبدالعزیز کی بیوی اپنے محل میں بصد جاہ تجمل بیٹھی ہے، سامنے مؤدب، سلیقہ شعار، خوبرو، اور خوش اندام کنیزوں کا گروہ دست بستہ کھڑا ہے، ملکہ کی ایک منہ چڑھی سہیلی اس سے کہتی ہے۔

کنیز :۔ ملکۂ عالم آج امیر عبدالعزیز اب تک تشریف نہیں لائے

ملکہ :۔ آتے ہی ہوں گے۔ ابھی آ جائیں گے۔ غرض مندوں نے گھیر رکھا ہو گا۔ اور وہ ان سے اپنا دامن نہ چھڑا پاتے ہوں گے۔

کنیز :۔ کتنے اچھے ہیں ہمارے امیر، رحم دل، بہادر، فیاض، بامروت

ملکہ :۔ ہاں اے کنیز تو سچ کہتی ہے مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہے۔

(مختلف آوازیں)

السلام علیکم!

اسلام علیکم۔

عبدالعزیز:۔ وعلیکم السلام، اہلاً وسہلاً۔ خوش آمدید، تشریف رکھیے۔

ایک عرب:۔ اے امیر میں ایک شکایت لے کر تیرے پاس آیا ہوں۔

عبدالعزیز:۔ اے برادر عرب تم اپنی شکایت بیان کرو۔ اگر وہ معقول ہوگی تو میں اسے رفع کروں گا۔

عرب:۔ ایک عیسائی سردار یوحنا میرا قرضدار ہے۔ لیکن روپیہ واپس کرنے میں لیت ولعل سے کام لیتا ہے۔

عبدالعزیز:۔ اس دعویٰ کا ثبوت۔

عرب:۔ ایک عرب کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ ایک مسلمان کبھی غلط دعویٰ نہیں کرتا۔

عبدالعزیز:۔ تم سچ کہتے ہو واقعی ایک عرب کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ ایک مسلمان کبھی غلط دعویٰ نہیں کرتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تمہارے یہ دونوں دعوے سچ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر تم کوئی ثبوت نہیں رکھتے تو یوحنا کو میری عدالت مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ تمہیں روپیہ واپس کرے۔ میں بحیثیت مدعا علیہ کے اسے یہاں تک بلا بھی نہیں سکتا۔ یہ سب کچھ صرف اس وقت ہو سکتا ہے۔ جب تم اپنے دعوے کا ثبوت پیش کر دو۔ ہماری حکومت پر جتنا حق کسی مسلمان کا ہے اتنا ہی ایک عیسائی کا بھی ہے اگر عرب غلطی کرے گا تو اسے بھی وہی سزا ملے گی جو کسی بربر

ملکہ :- پہلے کسی کی مجال نہ تھی کہ ہمارے محل میں قدم رکھ سکے ۔

کنیز :- اور اب ؟

ملکہ :- اب یہاں ہر وقت ہر شخص آسکتا ہے ۔ رہ سکتا ہے ۔ پہلے بادشاہ کے دیدار کے لئے لوگ برسوں ترستے تھے ۔ اب امیر کا دامن ہر راہ چلتا پکڑ سکتا ہے، پہلے بادشاہ کے سامنے لوگوں کی قوت گویائی سلب ہوجاتی تھی ، اب رعایا کا ہر فرد امیر کو ٹوک سکتا ہے اس کا احتساب کر سکتا ہے ، اس پر اعتراض کر سکتا ہے ـــــ کیوں میں غلط تو نہیں کہتی ؟

کنیز :- جی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ۔

ملکہ :- پہلے ہمارے دسترخوان پر صرف وہی بیٹھ سکتا تھا ، جسے ہم بلائیں ، جو ہماری ٹکر کا ہو ۔ جس کا مرتبہ شان ، اور حیثیت اونچی ہو ۔ اور وہ بھی ڈرتے ڈرتے ہمارے قریب آتا تھا ۔ ڈرتے ڈرتے ہمارے پاس بیٹھتا تھا ۔ اور اب دسترخوان بچھا اور صلائے عام کی ندا بلند ہوئی ، سب بے تکلفی سے ایک ساتھ بیٹھتے ہیں ایک ساتھ کھاتے ہیں ، نہ فرق مراتب ، نہ احساسِ کمتری ، کیوں میں نے غلط تو نہیں کہا ۔؟

کنیز :- جی نہیں بالکل صحیح فرمایا ۔

ملکہ :- پہلے اگر کوئی بادشاہ سلامت کی خدمت میں باریاب ہونا چاہتا تھا تو اسے مہینوں امیدواری کرنی پڑتی تھی ۔ پھر کہیں جاکر حاضری کی اجازت ملتی تھی ۔ وہ بھی چند لمحوں کے لئے اور یہ چند لمحے بھی اس طرح گذرتے تھے کہ حاضر ہونے

مایوسی کی تاریکی اور بے بسی کے اندھیرے میں وہ روشنی بن کر نمودار ہوا اور اس کے نمودار ہوتے ہی میری زندگی پھر جگمگا اٹھی۔

کنیز :- ہماری ملکہ کے خوش قسمت ہونے میں کون شک کر سکتا ہے۔ وہ پہلے بھی خوش قسمت تھیں اور آج بھی خوش قسمت ہیں۔ پہلے بھی اس محل کی آب و تاب ہماری ملکہ کے دم سے تھی اور آج بھی وہی عالم ہے۔ ملک میں اتنا بڑا انقلاب آگیا۔ جو بلند تھے وہ پست ہو گئے۔ جو پست تھے وہ بلند ہو گئے۔ بادشاہ میدانِ جنگ میں کام آیا۔ بڑے بڑے سورما دادِ شجاعت دیتے ہوئے موت کی آغوش میں پہنچ گئے۔ حکومت بدل گئی اس کا نظام بدل گیا۔ لیکن۔

ملکہ :- ہاں کہو لیکن

کنیز :- لیکن ہماری ملکۂ عالم کے اقتدار اور اختیار میں فرق نہیں آیا۔ ان کا ستارۂ اقبال زوال سے کبھی ہم کنار نہیں ہوا وہ پہلے بھی ملکہ تھیں اور اب بھی ملکہ ہیں۔

ملکہ :- ہاں تم سچ کہتی ہو میں پہلے بھی ملکہ تھی اور آج بھی ملکہ ہوں لیکن ایک فرق بھی ہے۔

کنیز :- فرق؟

ملکہ :- ہاں اور بہت بڑا فرق۔

کنیز :- لونڈی سمجھی نہیں۔

ملکہ شائد تمہارے لئے اس فرق کا سمجھنا آسان بھی نہ ہو۔

کنیز :- لیکن ملکہ عالم ارشاد تو فرمائیں۔ لونڈی سمجھنے کی کوشش کرے گی۔

ملکہ:- اقتدار واقعی میرے شوہر کے ہاتھ میں ہے لیکن اس اقتدار کو استعمال کرنے میں بڑی دشواریاں اور پابندیاں بھی تو عائد ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ نہ میرا شوہر بادشاہ ہے۔ اور نہ میں ملکہ، وہ مسلمانوں کا امیر ہے اور میں اس کی بیوی ہوں، مسلمانوں کے امیر اور ہمارے بادشاہ میں بڑا فرق ہے

کنیز:- یہ تو آپ سچ کہتی ہیں ملکۂ عالم، ان باتوں کی طرف میرا کبھی دھیان ہی نہیں گیا۔

ملکہ:- تیرا دھیان کیوں جاتا تو پہلے بھی باندی تھی اور اب بھی ہے تیری حالت میں تو کوئی فرق نہیں ہوا۔

کنیز:- آپ سچ کہتی ہیں۔

ملکہ:- لیکن میری حالت تو بالکل بدل گئی، میں اپنی موجودہ حالت کا جب گذشتہ حالت سے موازنہ کرتی ہوں تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہوں کہ بظاہر میری عزت و حشمت میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا ہے لیکن حقیقتہً اب مجھ میں اور ایک عام عورت میں کوئی فرق نہیں۔ اور یہ محسوس کر کے میرا دل بہت کڑھتا ہے۔

کنیز:- ضرور کڑھتا ہوگا ملکۂ عالم، لیکن ایک بات عرض کروں؟ اجازت ہے؟

ملکہ:- کہو۔ کہہ سکتی ہو۔

کنیز:- آپ امیر عبدالعزیز سے یہ باتیں کیوں نہیں کہتیں؟

ملکہ:- کیا کہوں ان سے؟

والے کی آنکھ اوپر نہیں اٹھ سکتی تھی، اس کا سر جھکا رہتا تھا آداب شاہی اور رعب سلطانی سے اس کے ہوش کانپتے تھے اور آواز نہیں نکلتی تھی۔ اور اب تو جانتی ہے کیا حال ہے؟

کنیز:۔ جی فرمایئے۔

ملکہ:۔ اب یہ کیفیت ہے کہ جب اور جس وقت خواہ دن ہو یا رات جو چاہے آ سکتا ہے، اب نہ آداب شاہی نہ رعب سلطانی فقط السلام علیکم کا نعرہ بلند کیا۔ اور مساوات کا حق حاصل ہو گیا۔ اب نہ الفاظ کے انتخاب میں احتیاط کی ضرورت ہے نہ حضور شاہی میں لرزنے اور ڈرنے کی حاجت۔ تو مانتی ہے نا۔۔ میں نے جو کچھ کہا سچ کہا؟۔

کنیز:۔ جی مانتی ہوں۔

ملکہ:۔ سابق بادشاہ کے سامنے لوگ سر جھکا کر آتے تھے؟ اب موجودہ امیر کے سامنے سینہ تانے ہوئے آتے ہیں، پہلے ہر بادشاہ اپنی تخت نشینی کے وقت زرتار اور زرکار تاج بنواتا تھا اب نئی حکومت کا فرماں روا تاج سے بے نیاز ہے۔ نہ وہ تاج پہنتا ہے نہ تخت شاہی پر بیٹھتا ہے۔ نہ لوگوں کو جاگیریں انعام میں دیتا ہے، نہ خفا ہو کر لوگوں سے جاگیریں واپس لیتا ہے، نہ گانا سنتا ہے نہ ناچ دیکھتا ہے کتنا بڑا فرق ہے پہلے میں اور اب میں بول تو بولتی کیوں نہیں؟ جواب کیوں نہیں دیتی؟۔

کنیز:۔ جی، واقعی بہت بڑا فرق ہے؟

ملکہ:- اب یہ ساری باتیں اس محل سے تعلق نہیں رکھتیں۔

کنیز:- ملکۂ عالم یہ کیا فرما رہی ہیں۔ یہ باتیں اگر اس محل سے تعلق نہیں رکھتیں تو پھر کہاں سے تعلق رکھتی ہیں۔

ملکہ:- (ٹھنڈی سانس لے کر) اب ان سب باتوں کا تعلق ایوانِ عدالت سے ہے۔

کنیز:- یہ کیا چیز ہوتی ہے میری ملکہ۔؟

ملکہ: یہ سارے اختیارات امیر عبدالعزیز کے ہاتھ میں نہیں۔ قاضی شہر کے ہاتھ میں ہیں۔

کنیز:- اے سچ؟

ملکہ:- ہاں ۔۔۔ اور امیر قاضی کے فیصلے میں مداخلت نہیں کرسکتا۔

کنیز:- کون روک سکتا ہے اسے؟

ملکہ:- قانون! ۔۔۔ ہمارے امیر کے مذہب کا قانون ہی یہ ہے امیر اس قانون کے آگے بے بس ہے وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ قاضی جسے موت کی سزا دے اسے مرنا ہی پڑے گا اور جسے رہا کردے پھر اس کے لئے کسی طرح جیل کا پھاٹک نہیں کھل سکتا۔

کنیز:- میں کیسے مان لوں میری ملکہ؟ بادشاہ کو سات خون معاف ہوتے ہیں۔

ملکہ:- پہلے ہوتے تھے اب نہیں ہوتے۔ اب تو اگر خدانخواستہ ہمارے امیر عبدالعزیز بھی کسی بے گناہ کو قتل کر دیں تو انھیں قصاص میں قتل کر دیا جائے۔

کنیز:- قتل کر دیا جائے؟ امیر کو قتل کر دیا جائے۔

ملکہ:- ہاں پہلے ہم قانون بناتے تھے اب ہم قانون نہیں بنا سکتے۔

کنیز:- ان سے کہیئے کہ وہ شاہانہ کروفر سے رہیں۔ تاج زر نگار کو اپنے سر سے زینت دیں۔ تخت شاہی پر قدم رنجہ فرمائیں۔ حریر اور پرنیاں کا لباس پہنیں۔ جس طرح ایک زبردست بادشاہ رہتا ہے اس طرح رہیں آخر انھیں کمی کس بات کی ہے؟

ملکہ:- تو بھی کیسی پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہے؟

کنیز:- لونڈی نے کیا غلط کہا؟

ملکہ:- کیا تیرا خیال ہے میں اگر امیر سے کہوں تو وہ مان لیں گے؟

کنیز:- اے میں کہتی ہوں میری ملکہ، کیوں نہیں مانیں گے بھلا آپ کی بات نہ مانیں گے۔؟

ملکہ:- مان چکے۔

کنیز:- ضرور مانیں گے۔

ملکہ:- تو انھیں نہیں جانتی میں جانتی ہوں، وہ ان سب باتوں کو ڈھکوسلا سمجھتے ہیں۔ وہ میری ہر بات مان لیں گے مگر نہیں مانیں گے تو یہی بات۔

کنیز:- میری ملکہ جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں؟

ملکہ:- جان کی امان کس سے مانگتی ہے بگی؟

کنیز:- اپنی ملکہ سے، ملکۂ عالم سے اور کس سے؟

ملکہ:- وہ دن رخصت ہو گئے جب بادشاہ یا ملکہ کے ہاتھ میں لوگوں کی جان ہوا کرتی تھی ان کے ایک اشارہ پر گردن کٹ جاتی تھی اور ایک حکم پر پھانسی کے مجرم رہا ہو جاتے تھے۔

کنیز:- کیوں یہ کیسے؟

سی نظر آرہی ہو۔

ملکہ :- خدا آپ کی مہربانی قائم رکھے، مجھے افسردگی سے کیا تعلق؟ آج آپ کو کچھ دیر ہوگئی تشریف لانے میں؟

عبدالعزیز:- (ہنس کر) اچھا اب بات سمجھ میں آئی، تم میرا انتظار کررہی تھیں؟

ملکہ :- جی بہت دیر سے۔

عبدالعزیز:- آج خلاف معمول بہت لوگ آگئے، ان کی شکایات اور حالات سننے میں بہت وقت گذر گیا۔

ملکہ :- اہل حاجت کا ہجوم ہر وقت آپ کو گھیرے رہتا ہے۔ آپ کے آرام و راحت کا خیال بھی نہیں کرتا۔ اور نہ خود آپ کو اپنے آرام و راحت کا خیال ہے۔

عبدالعزیز:- امیر کی ذمہ داری بہت ہوتی ہے، یہ امارت پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا تاج ہے، اور جب میں نے اپنے باپ اور سردار کے حکم سے یہ تاج پہن لیا ہے تو میرا فرض ہے کہ اپنے آرام و آسائش پر ان لوگوں کو مقدم رکھوں جو زمانے کے ستائے ہوئے ہیں۔ جنہیں کسی پہلو قرار نہیں جن پر ظلم ہوا ہے اور جو حالات کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ اگر میں اپنے فرائض کو اپنے آرام پر مقدم رکھوں گا تو میں عارضی زندگی کے بعد مستقل اور نہ ختم ہونے والی زندگی کا زمانہ آرام سے نہیں گذار سکوں گا۔ میں اِس زندگی پر اُس زندگی کو ترجیح دیتا ہوں۔

(اسی اثنا میں ایک غلام حاضر ہوتا ہے)

بنا بنایا قانون ہمارے امیر کے مذہب کا موجود ہے ۔ اور اس
کی تعمیل کرنا ، بس یہی ہمارا کام ہے ، یہی ہمارا اختیار ہے ،
اس قانون میں نہ ہم ایک شوشہ بڑھا سکتے ہیں ۔ نہ ایک نقطہ
کم کر سکتے ہیں ۔ تو نہیں جانتی اب حالات کیا ہیں ؟

کنیز :- یہ تو سچ ہے کہ میں نہیں جانتی حالات کیا ہیں ، لیکن ایک بات
ضرور جانتی ہوں ۔

ملکہ :- وہ کیا ؟

کنیز :- ہمارے امیر دوسروں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے
آپ بھی اپنے مذہب پر قائم ہیں اور میں بھی ، امیر نے کبھی
ہمیں مجبور نہیں کیا کہ ہم اپنا مذہب قبول کر لیں ۔

ملکہ :- ہاں یہ تو ٹھیک کہتی ہے ۔ لیکن ان کے مذہب کا قانون یہ بھی
ہے کہ مذہب کے معاملہ میں کسی پر جبر نہ کیا جائے ۔

کنیز :- کتنا اچھا قانون ہے ؟

ملکہ :- ہاں بہت اچھا !

(قدموں کی آہٹ)

کنیز :- ملکہ عالم ـــــ ملکۂ عالم

ملکہ :- ہاں میں نے دیکھ لیا امیر آرہے ہیں اب تو جا ۔

(امیر عبدالعزیز کو دیکھ کر ملکہ اٹھ کھڑی ہوتی ہے ۔ اس کی پیشوائی کرتے
ہوئے کہتی ہے)

ملکہ :- آئیے تشریف لائیے ۔

عبدالعزیز :- ہاں میں آگیا کیا بات ہے ۔ آج تم کچھ افسردہ اور مضمحل معلوم

کر سکتا، صرف خدائے حیّ وقیوم کی ذات ہی اس قابل ہے کہ اسے سجدہ کیا جائے ۔ انسان انسان سب برابر ہیں ۔

ملکہ :- سب برابر ہیں ؟ میں نہیں مانتی یہ بات، آپ امیر اور سردار ہیں، آپ کے سامنے سب کو جھکنا چاہئیے ۔

عبدالعزیز :- کیوں، کیا امیر اور سردار انسان نہیں ہوتا ؟

ملکہ :- وہ انسان ہو یا نہ ہو لیکن میں آپ کو سب سے سربلند دیکھنا چاہتی ہوں کہ آپ کی بڑائی کے آگے سب کے سر جھکیں ۔

عبدالعزیز :- میں بادشاہ نہیں اور بادشاہ بننا بھی نہیں چاہتا، تم مجھے بادشاہت کے راستے پر لے چلنا چاہتی ہو، یہ ناممکن ہے ۔

ملکہ :- (روہانسی آواز میں) آپ میری کوئی بات نہیں مانتے، آپ میرا دل توڑتے ہیں، میں صرف اس لئے زندہ ہوں کہ آپ کا جاہ وجلال دیکھوں، آپ کی شان وشوکت کا نظارہ کروں، اور آپ — آپ ...... (رونے لگتی ہے) اور آپ کو صرف یہ آتا ہے اور آپ کو صرف یہ آتا ہے کہ میری آرزوؤں کو پامال کریں، میرے محبت بھرے ہوئے دل کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیں ۔

(سسکیوں کی آوازیں)

عبدالعزیز :- (ہنس کر) ارے تم رونے لگیں ۔ یہ بھی کوئی بات ہے ؟

ملکہ :- میرے لئے یہ بات بہت بڑی ہے ۔

عبدالعزیز :- اچھا میں غور کروں گا کہ کس طرح اپنے اصول پر قائم رہ کر تمہاری بات پوری کر سکتا ہوں لیکن ایک شرط ہے ۔

ملکہ :- کیا ہے، وہ شرط ؟

غلام :- السلام علیکم، یا امیر-

عبدالعزیز :- وعلیکم السلام- کوئی خاص بات؟

غلام :- آج جمعہ ہے، اہل حاجت بہت کافی تعداد میں آچکے ہیں-

عبدالعزیز :- اور میرے منتظر ہیں؟

غلام :- یا امیر-

عبدالعزیز :- جاؤ اطلاع کر دو میں ابھی آتا ہوں-

(جانے کی آواز)

ملکہ :- (ذرا بلند آواز سے) میں اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتی

عبدالعزیز :- کیا نہیں برداشت کر سکتیں- کیا ہوا-؟

ملکہ :- میں آپ کی توہین نہیں برداشت کر سکتی- کسی طرح نہیں، کسی قیمت پر نہیں-

عبدالعزیز :- توہین؟ میری توہین! یہ تم کیا کہہ رہی ہو- یہ میں کیا سن رہا ہوں-

ملکہ :- ہاں- یا امیر یہ آپ کی توہین ہے- آپ فوج کے سپہ سالار ہیں آپ فوج کے امیر ہیں- آپ حکومت کے سب سے بڑے فرد ہیں-

عبدالعزیز :- ہاں ہیں یہ سب کچھ ہوں مگر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟

ملکہ :- میں گوارا نہیں کر سکتی کہ ہر کس وناکس اکڑتا ہوا سینہ تانے آپ کے سامنے چلا آئے-

عبدالعزیز :- تو کیا یہ چاہتی ہو کہ سجدے کرتا ہوا آئے-

ملکہ :- ہاں میں یہی چاہتی ہوں-

عبدالعزیز :- (بلند آواز سے) ایسا نہیں ہو سکتا- انسان انسان کو سجدہ نہیں

"تم ٹھیک کہتے ہو یہ نہیں ہوسکتا۔
"وہ جب گفتگو کرتا ہے تو اپنی ذات کو اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ میں نہیں کہتا ہم کہتا ہے۔"
"وہ غلاموں کے جھرمٹ میں نکلتا ہے، لوگوں سے پندار و نخوت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس نصرانی ملکہ نے اس میں عجمی ذہنیت پیدا کر دی ہے۔"

(آج پھر ملکہ اور کنیز میں گفتگو ہو رہی ہے)

کنیز:- اب تو ہماری ملکہ بہت خوش نظر آتی ہیں، کہاں اس چاند سے مکھڑے پر ہر وقت اداسی کی گھٹائیں چھائی رہتی تھیں، کہاں اب دیکھتی ہوں پھولوں کی طرح ____

ملکہ:- ہاں اب میں بہت خوش ہوں، بہت خوش۔

کنیز:- خدا میری ملکہ کو سدا یونہی خوش رکھے، دن عید ہو رات شب برات، لیکن میں بھی تو سنوں ملکہ اتنی خوش کیوں ہیں؟

ملکہ:- اری بگلی تو دیکھتی نہیں، اس چمن میں پھر سے بہار آ گئی، ہمارا گیا ہوا جاہ و دبدبہ پھر سے واپس آ گیا۔ اب یہ محل واقعی شاہی محل ہے، اب یہاں جو آتا ہے سر جھکا کر آتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ آنکھ اٹھا کر بھی میری طرف دیکھ سکے، کسی کی ہمت نہیں کہ ہم سے بات کر سکے، کسی میں جرأت نہیں کہ ہماری بات میں دخل دے سکے۔ اب لوگوں کو انعام ملتا ہے۔ لوگوں سے جاگیریں چھنتی ہیں، درہم و دینار کے خزانے پر اب پہرہ نہیں، ہم جسے

عبدالعزیز:۔ آنسو پونچھ لو، اور وعدہ کرو اب نہیں روؤ گی، ہمیشہ مسکراتی رہو گی
ملکہ تمہیں یہ وعدہ کرنا ہوگا، ورنہ میں اپنے الفاظ واپس لے لوں گا
ملکہ:۔ (خوشی کے ساتھ) اچھا وعدہ کرتی ہوں کبھی نہیں روؤں گی ہمیشہ
مسکراتی رہوں گی۔
عبدالعزیز:۔ تم تو ابھی سے مسکرانے لگیں، تم نے اپنے وعدہ کا پاس کیا۔ اطمینان
رکھو، میں بھی اپنے وعدے کا خیال رکھوں گا۔
ملکہ:۔ مجھے یقین ہے امیر اپنا وعدہ ضرور پورا کریں گے۔

(پارک میں، سڑکوں پر، گھروں میں، بازار میں اکثر لوگ سرگوشیاں
کرنے لگے ہیں)
"(سرگوشی کے لہجہ میں) ارے بھائی کچھ سنا؟"
"کیا؟ کیا ہوا؟"
"یہ ہمارا امیر بادشاہ بنتا چلا جا رہا ہے"۔
"وہ کیسے؟"
"اس نے اپنی نشست گاہ میں ایک چھوٹا سا دروازہ بنایا ہے
تاکہ ہر شخص جھک کر اس میں داخل ہو؟"
"سنا تو میں نے بھی ہے۔ لیکن اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟"
"(بلند لہجہ میں) یہ کہ وہ بڑا ہے، ہم چھوٹے ہیں؟ اس کے حضور
میں جب ہم پہونچیں تو ہمیں جھک کر جانا چاہئے۔ یعنی انسان
اپنی وقعت کے سامنے اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں
کو سربسجود کرانا چاہتا ہے؟"

بیت المال کا روپیہ بہا رہا ہے، وہ کسی سے مشورہ نہیں لیتا صرف اپنی رائے اور اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے

"— اگر اس نے اپنی روش نہ بدلی تو —"

"— ہم اسے قتل کر دیں گے —"

"— ہاں ہم اس کی جان لے لیں گے —"

"— ہم اسے مار ڈالیں گے —"

"— عبدالعزیز اب ایک عرب سردار نہیں، ایک عجمی بادشاہ ہے۔ اس کے سامنے لوگوں کو سر جھکا کر جانا پڑتا ہے۔"

"— یہ بات کسی طرح گوارا نہیں کی جا سکتی —"

"— معلوم ہوتا ہے موت اس کے سر پر منڈلا رہی ہے —"

"— وہ ہماری دینی اور ملی روایات کے ساتھ کھیل رہا ہے۔"

"— ہم اس کا سر کچل دیں گے —"

"— ہم بغاوت کر دیں گے۔"

"— ہم اس کی عجمیت کو زندہ نہیں رہنے دیں گے —"

"— ہم اسے کبھی زندہ نہیں رہنے دیں گے —"

امیر عبدالعزیز اپنی محبوب ملکہ سے مصروف تکلم ہے۔

عبدالعزیز:۔ ملکہ اب تم خوش ہوئیں؟ اب تمہاری آرزو پوری ہوئی؟

ملکہ:۔ ہاں اب میں خوش ہوں، اب کوئی شخص آپ کے سامنے سینہ تانے ہوئے بدتمیزی کے ساتھ نہیں آسکتا، اب جو آئے گا اسے جھکنا پڑے گا۔ ایک امیر اور سردار کا کم از کم اتنا احترام تو ہو۔

جو چاہیں دیدیں، جس سے جو چاہیں چھین لیں۔ ہم میں اور بادشاہ میں اب کوئی فرق نہیں۔

کنیز :- میری ملکہ خدا آپ کو اس سے زیادہ شان و شوکت دے پھر واقعی اب آپ سچ مچ کی ملکہ ہیں۔

ملکہ :- ہاں اور کیا۔

کنیز :- پھر میرے بھائی کو جیل سے رہا کرا دیجیے جسے چوری کے جرم میں سزا ہوئی تھی۔

ملکہ :- ہاں رہا کرا دیا جائے گا۔

کنیز :- اور اس حاکم کو بھی یہاں سے بدلوا دیجیے جس نے اُسے پکڑا تھا

ملکہ :- اس کا تبادلہ بھی کر دیا جائے گا۔

کنیز :- لیکن ملکہ جب وہ رہا ہو کر آئے گا تو کھائے گا کیا؟

ملکہ :- ہم اسے محل میں ملازمت بھی دلا دیں گے۔

کنیز :- میری ملکہ ـــ میری ملکہ

عبدالعزیز کے دبدبہ اور طنطنہ نے رفتہ رفتہ عرب کی سادگی اس سے چھین لی اس میں شاہانہ پندار پیدا ہو گیا۔ عرب اس ذہنیت کو برداشت نہ کر سکے، ان کے دلوں میں طوفان مچلنے لگا، وہ مشتعل ہو گئے۔ انھیں اپنے امیر سے نفرت ہو گئی۔ اس امیر سے جو امارت کی مسند سے جست لگا کر بادشاہت کے تخت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آواز :- ہمارا امیر اب واقعی بادشاہ بن گیا ہے۔ وہ پانی کی طرح

عبدالعزیز:۔ ہاں ہم دیکھ رہے ہیں۔
غلام :۔ وہ آپ کی طرف لپک رہے ہیں۔
عبدالعزیز:۔ انھیں نہ روکو
(ایک ہوائی تیر چلاتا ہے جو عبدالعزیز کے سینے سے پار ہوجاتا ہے وہ آہ کرکے گر پڑتا ہے)
غلام :۔ آہ کسی ظالم نے تیر مار کر میرے آقا کو ہلاک کر دیا۔
ملکہ :۔ اُف یہ کیا ہوا؟ — میرا سہاگ پھر لٹ گیا؟ میری زندگی پھر برباد ہو گئی، ہائے یہ کیا ہوا!؟
" — یہ تمہارے کرتوتوں کا پھل ہے؟ تم ہی نے ہمارے امیر کو گمراہ کیا"
" — اس عورت نے امیر عبدالعزیز کو اکسایا کہ وہ لوگوں کو اپنے برابر سمجھے"
" — انھیں اپنے سے فروتر سمجھے"
" — وہ جب آئیں تو سر جھکا کر آئیں"
" — گھٹنے ٹیک کر حاضر ہوں"
ملکہ :۔ ہاں تم سچ کہتے ہو اصلی مجرم میں ہوں، تم نے میرے سرتاج کو مار ڈالا لیکن مجھے کیوں چھوڑ دیا، اپنے ترکش سے ایک تیر اور نکالو اور میرا سینہ بھی چھید دو، خاموش کیوں ہو۔ میان سے تلوار نکالو اور میری گردن کاٹ لو، میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔
"ہم عورت پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے" (ریڈیو پاکستان سے نشر شدہ ۱۹۴۸ء)

(شور و غل کی آوازیں)

عبدالعزیز:- یہ شور کیسا بلند ہو رہا ہے؟

ملکہ:- آواز قریب ہوتی جا رہی ہے؟

عبدالعزیز:- معلوم ہوتا ہے بہت سے لوگ اس طرف آ رہے ہیں؟

ملکہ:- کہیں لوگوں نے بلوہ تو نہیں کر دیا۔

(کسی کے قدموں کی آہٹ)

غلام:- غضب ہو گیا ہے امیر

عبدالعزیز:- کیا ہوا۔

غلام:- بلوائیوں کا بہت بڑا مجمع محل کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے وہ اسی طرف دھاوا کر رہا ہے۔

عبدالعزیز:- بلوائی؟ دھاوا؟ ــــ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔؟

(شور بڑھ جاتا ہے)

غلام:- میں بالکل صحیح عرض کر رہا ہوں۔ جلدی یہاں سے بھاگیے۔

عبدالعزیز:- میں بھاگوں؟ ــــ میں؟ اندلس کا فاتح، میدان جنگ کا سورما، موسیٰ بن نصیر کا بیٹا؟ ــــ نہیں

(شور اور زیادہ بڑھ جاتا ہے)

عبدالعزیز:- نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا؟

(شور اور بڑھ گیا)

غلام:- دیکھیے، دیکھیے، وہ بلوائی محل میں آ گئے۔

عبدالعزیز:- آنے دو۔

ملکہ:- وہ اسی طرف آ رہے ہیں۔

ت و ہلاکت کا طوفان تھا۔

اس طوفان کی زد میں آکر لاکھوں مسلمان بھیڑ، بکریوں کی طرح ذبح
یئے گئے۔

ہزارہا ہزار مسلمانوں کو غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ صدہا
ا اور پر رونق شہر کا خاک کا ڈھیر بن گئے۔

ان کی خوبصورت اور خوشنما اور مستحکم۔ بلند و بالا عمارتیں مسمار کر دی
یں۔

ان کے لہلہاتے ہوئے کھیت اور مرغزار روند ڈالے گئے۔
مدرسے مکاتب، اور خانقاہیں زمین کے برابر کر دی گئیں۔
وسط ایشیاء کا وہ پورا علاقہ جو تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا ویران و سنسان
ا۔

اسلام کے نام لیواؤں پر ایسی مصیبت کبھی نہ آئی تھی۔ مشرق سے لے کر
ب تک خاک اڑنے لگی۔

یہ تاتاری منگولیا کے صحرائے گوبی کے باشندے تھے۔ یہ بے آب و
خطہ قدرت کی فیاضیوں سے یکسر محروم تھا۔
قبائل ہر قسم کے نظم و ضبط سے محروم تھے۔ سب جدا جدا زندگی
رتے تھے۔ خانہ جنگی ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ خانہ جنگی سے جو وقت بچتا
و فواحش پر صرف ہوتا تھا۔ یہ نہ کسی اصول کے پابند تھے نہ قانون
حرام کے قائل تھے۔ نہ حلال کے، نہ مذہب کے، نہ سوسائٹی کے
سے بیگانہ، سب سے الگ سب سے جدا زندگی بسر کرتے تھے
گی میں مگن تھے۔

تاریخی فیچر

جلال الدّین خوارزم شاہ

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا!
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

جلال الدین خوارزم شاہ
چنگیز خان
افسر، سپاہی، عملہ

چھٹی صدی ہجری کا آغاز۔ عام طور پر ساری دنیائے اسلام کے لئے اور خاص طور پر وسط ایشیا کی اسلامی حکومتوں کے لئے قتل و غارت، تباہی و بربادی، ہلاکت اور فلاکت کا پیام تھا۔
اسی صدی کے آغاز میں تاتاریوں کا طوفان ایک سیل بلا کی صورت میں اٹھا اور ترکستان سے لے کر سارے وسط ایشیا اور روس تک چھا گیا۔

سے دلاورانِ عالم کانپتے تھے۔

اب وہ بہت بڑا تاجدار۔ اور شہنشاہ تھا۔جس کا رعب اور سطوت کا یہ عالم تھا کہ اس کی رعایا۔اس سے اتنی ہی خائف اور ترساں رہتی تھی جتنی بکری شیر سے۔ وہ اپنی فوجِ گراں لے کر جس طرف بڑھتا تھا، موت ہلاکت اور بربادی کی بارش کرتا ہوا گزرتا تھا۔

چنگیز کی حکومت تلوار کی نوک اور خنجر کی دھار پر قائم تھی۔ اسے آبادیوں کو اجاڑنے گردنوں کو کاٹنے، شہروں کو ڈھانے، عمارتوں کو مسمار کرنے۔کھیتوں اور باغوں کو جلانے میں وہ لطف آتا تھا جو کسی شکاری کو شکار میں آتا ہے۔انسانی زندگی کی کوئی وقعت اس کی نظر میں نہ تھی۔

وہ ایک ذرا سی بات کا بہانہ بنا کر علاؤالدین محمد خوارزم شاہ سے الجھ پڑا۔اس نے خوارزم شاہ کو پیام بھیجا "میں تمہارے مقابلہ میں آتا ہوں۔اگر تم دنیا کے آخری حصہ میں بھی ہو گے تو تم کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔ علاؤالدین محمد خوارزم شاہ اگرچہ چنگیز کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا لیکن اس نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔

(گھبرائی ہوئی آواز) سلطان عالم پناہ!

محمد خوارزم شاہ:۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟

مخبر:۔ سلطان عالم ــــ عالم پناہ!

محمد خوارزم شاہ:۔ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ کیا کوئی بری خبر آئی ہے؟

مخبر:۔ سلطان عالم۔!

محمد خوارزم شاہ:۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ دو۔میں سب کچھ سننے کے لئے تیار

انہی خانہ بدوشوں اور وحشی لوگوں میں ایک شخص پیدا ہوا - چنگیز!
نوعمری میں یتیمی کا دکھ سہنا پڑا - اس حادثہ نے اس کے دل کو سخت بنا دیا
رفتہ رفتہ وہ تاتاری قبائل کا جیالا ، بہادر اور منچلا سردار بن گیا چنگیز
کا دل چنگیز کا دل تھا - وہ صحرائے گوبی کی زندگی پر اپنی حوصلہ مندیوں اور
اولوالعزمیوں کو قانع نہ کر سکا -

وہ وحشیوں اور تہذیب نا آشنا لوگوں کی سرداری پر اپنی طبیعت
کو رضامند نہ کر سکا - وہ جنگل اور صحرا کی حکومت سے خوش نہیں تھا - وہ شہروں
کو فتح کرنا چاہتا تھا - مہذب اور متمدّن آبادیوں کو زیر نگیں کرنا - اس کی زندگی
کا سب سے بڑا مقصد تھا -

اس نے تاتاری سرداروں کو مغلوب کر کے اپنی ایک ریاست
قائم کر لی! پھر اس نے یگانۂ روزگار دلاوروں اور نوجوانوں کی ایک فوجِ
گراں مرتب کی اور صحرائے گوبی سے ایک مہیب اور ہولناک طوفان کی
صورت میں روانہ ہوا -

(دہل اور نقارہ کی ہلکی آواز کے ساتھ ایک بڑے لشکر کے گزرنے
کی کیفیت) ، چنگیز صحرائے گوبی سے نکلا - فتح و نصرت نے اس کے قدموں
کو چوما - کامیابی اور کامرانی اس کے جلو میں تھی - فیروزمندی اور بختاوری
اس کے سر پر سایہ فگن رہی -

چند ہی سال کے اندر چین اور ترکستان کے زرخیز و شاداب ، آباد
اور پر رونق ، مصنوعات سے مالا مال ، اور سیم و زر سے بھرپور
علاقوں پر چنگیز کا پرچم لہرانے لگا -
اب وہ ایک بہت بڑا سپہ سالار تھا جس کی ہیبت اور دہشت

بخارا راکھ کا ڈھیر بن گیا۔
ایک عینی شاہد کا قول تاریخ کے صفحات پر اب تک محفوظ ہے۔
آمدند و کندند و سوختند و بردند و رفتند ــــــ"
چنگیز کا ٹڈی دل لشکر بخارا کے مدرسوں اور خانقاہوں۔ محلوں اور عمارتوں کو برباد کرنے کے بعد آگے بڑھا۔ اب سمرقند کی باری تھی ــــــــــ سمرقند کا بھی وہی حشر ہوا جو بخارا کا ہوا تھا۔
سمرقند کے بعد اور بھی کئی شہروں اور بستیوں کو پامال کرتا ہوا چنگیز سیدھا مازندران پہنچا۔ علاؤالدین محمد خوارزم شاہ تو اس کے ہاتھ نہ آسکا لیکن اس کے اہل و عیال کو گرفتار کر کے قید کر لیا۔
علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کی صحت عرصہ سے خراب تھی۔ چند روز بیمار رہ کر اس حالت میں کہ تاتاری اس کا تعاقب کر رہے تھے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کی اولاد میں جلال الدین خوارزم شاہ اپنی فکر و تدبیر، شجاعت و دلیری، جہاں بانی اور جہان داری۔ دانش و بینش اور اعتدال و توازن کی بنا پر سب میں ممتاز اور یگانہ تھا۔
باپ کے مرنے کے بعد کانٹوں کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا۔ حالات نامساعد تھے، فضا ناموافق تھی، دوست دشمن ہو رہے تھے۔ خود ماں جائے بھائی خون کے پیاسے تھے۔ وہ تخت حکومت کو اپنا حق سمجھتے تھے، امراء و دولت اور اعیان ملک کی ایک بڑی

ہوں ۔ کیا چنگیز آگیا؟

مخبر :۔ عالم پناہ ۔ چنگیز آگیا ۔ وہ آگیا ۔ وحشی تاتاریوں کا سیلِ بلا لیکر وہ چڑھ آیا ۔ حدِ نظر تک اس کی فوج پھیلی ہوئی ہے ۔

محمد خوارزم شاہ :۔ کیا رزنوق کی فتح سے اس کی جوع الارض کم نہیں ہوئی؟ کیا وہ بخارا کو بھی فتح کرنا چاہتا ہے؟ کوئی مضائقہ نہیں ہم لڑیں گے ۔

[طبلِ جنگ کی آواز ۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ ۔ ٹاپوں کی آواز
{ جنگ کی کیفیت ۔ تلوار کی شپا شپ ہائے وائے کی آوازیں
[سواروں کے گھوڑوں سے گرنیکی آوازیں ۔ گھمسان کی جنگ کا سماں

(گھڑیال پر زور سے چوٹ ۔ سکوت ۔ سناٹا

بخارا فتح ہوگیا ۔ چنگیز کی فوجیں شہر میں داخل ہوگئیں ۔

(فوجوں کی مارچ کی کیفیت)

چنگیز :۔ شاباش بہادرو! تم نے میری تمنا پوری کر دی ۔ بخارا فتح کر لیا لیکن ابھی تمہارا کام ختم نہیں ہوا شہر کی ایک ایک عمارت کو مٹی کا ڈھیر بنا دو ۔ کام کے آدمیوں کو غلام اور جوان عورتوں کو لونڈی بنالو ۔ باقی ماندہ لوگوں کو قتل کر دو ۔ اور ہاں یہ سب کچھ کر کے شہر میں آگ لگا دو ۔ یہ سرسبز و شاداب شہر جب آگ کے شعلوں میں جلے گا ۔ اور جل کر خاکستر ہوگا ۔ تو اس راکھ کو ہمارے گھوڑوں کی ٹاپیں روندتی ہوئی آگے بڑھیں گی ۔ شاباش ۔ شاباش بہادرو شاباش!

(شکست و ریخت کے دھماکے آہ و فریاد کی آوازیں)

جلال الدین :۔(ڈپٹ کر) کیا کہا؟ ـــــــ کیا کہا تم نے؟
درباری :۔ (ڈر کر) سلطان عالم
جلال الدین :۔ میں سننا چاہتا ہوں، کیا کہہ رہے تھے تم؟
درباری :۔(لرزتی ہوئی آواز میں) تاتاری ایک آن چین نہیں لینے دیتے اپنے مورو ملخ کے سے لشکر کے ساتھ برابر تعاقب کئے جا رہے ہیں تاتاریوں کی قوت اتنی بڑھ چکی ہے اور انھوں نے عوام پر اتنی دہشت قائم کر لی ہے کہ ان سے نبٹنا آسان کام نہیں رہا۔
جلال الدین :۔(گرج کر) میں جانتا ہوں۔ تاتاری انسان نہیں درندے ہیں۔ مجھے معلوم ہے وہ بے پناہ قوت کے مالک ہیں۔ اس حقیقت سے بھی میں بے خبر نہیں کہ یہ نام لوگوں پر دہشت اور سراسیمگی پیدا کر دیتا ہے۔ پھر بھی میں لڑوں گا۔
درباری :۔ (خوف زدہ آواز میں) پھر بھی آپ لڑیں گے۔
جلال الدین :۔ ہاں لڑوں گا، آخر وقت تک، آخری سانس تک، آخری قطرہ خون تک، میں جنگ جاری رکھوں گا۔ وہ شہروں کو ویران کر سکتے ہیں، لیکن جلال الدین کے عزم استقامت کی دنیا ویران نہیں کر سکتے۔ ان کی تلوار لوگوں کی گردن کاٹ سکتی ہے۔ لیکن جلال الدین کی دلیری اور شجاعت کو ذبح نہیں کر سکتی۔ وہ بادشاہتوں کو، ملکوں کو، حکومتوں کو کچل سکتے ہیں، لیکن جلال الدین کی خودداری اور عزت نفس کو تاراج نہیں کر سکتے۔ اگر تم سب متحد ہو جاؤ۔ مسلمان اپنے باہمی اختلافات فراموش کر دیں۔ تو میں دعویٰ کرتا ہوں کہ تاتاریوں کو چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دوں گا ۔ اور

جماعت خفیہ اور علانیہ سازشوں میں مصروف تھی، تاتاریوں کی یورش اور یلغار کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ بھی جاری تھا، بلکہ ان کی یورش اور یلغار میں اب اور زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے علاؤالدین محمد کے بعد پالا مارنے میں آسانی ہوگی، ان کا خیال تھا علاؤالدین محمد کے دوسرے بیٹوں کی طرح جلال الدین بھی خودغرضی، جاہ طلبی اور خانہ جنگی کے تباہ کن مشاغل میں مبتلا ہو جائے گا۔ لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا۔ جلال الدین خوارزم شاہ نے اپنے سپہداروں، دوستوں، ساتھیوں ملک کے امیروں اور رئیسوں کو جمع کیا اور کہا۔

جلال الدین خوارزم شاہ:۔ دوستو! میں جانتا ہوں اور تم بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو حالات نے کتنی نازک صورت اختیار کرلی ہے؟

درباری: (ادب کے ساتھ) سلطان عالم۔ حالات کی نزاکت کا ہمیں پورا احساس ہے۔

جلال الدین خوارزم شاہ:۔ اور تم سب سے یہ بات بھی پوشیدہ نہیں کہ میرے بھائی میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ میرے دوست دشمنوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ میرے ساتھی میرا ساتھ دینے سے جی چراتے ہیں۔ میں اگر یہ کہوں کہ میرے ہاتھ پاؤں میرے دشمن ہیں، تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

ایک درباری:۔ (سلطان عالم کا ایک ایک لفظ حقیقت کی منہ بولتی تصویر ہے۔

دوسرا درباری:۔ (سہمی ہوئی آواز میں) اور پھر سب پر بالا کم بخت تاتاریوں کی یورش۔

اگر ایسا نہیں ہوتا تو بھی یاد رکھو۔ جلال الدین تن تنہا اپنے مٹھی بھر جاں نثاروں اور فداکاروں کے ساتھ، اس سیل بلا کو روکتا رہے گا یہاں تک کہ۔

یا تن رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید!

ایک مصاحب:۔ لیکن سلطان ——

جلال الدین:۔ لیکن کا وقت گذر چکا۔ اب عمل کا وقت ہے —— عزت کی موت مرنا چاہتے ہو تو میرا ساتھ دو۔ ذلت کی موت مرنا ہے، تو تاتاریوں کی اطاعت قبول کر لو۔

(سناٹا، خاموشی)

جلال الدین:۔ بتاؤ کیا فیصلہ کیا تم نے؟

(سناٹا، خاموشی)

جلال الدین:۔ میں تمہارا فیصلہ معلوم کرنا چاہتا ہوں، تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے حوصلے اور امنگ کا اندازہ کرنا چاہتا ہوں، تمہاری غیرت اور حمیت کو تولنا چاہتا ہوں؟ تم خاموش کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟ —!

(سناٹا، خاموشی)

جلال الدین:۔ (اثرانگیز آواز میں تاسف کا لہجہ) میں سمجھ گیا، تم میں وہ ولولہ نہیں رہا۔ جس نے تمہیں سربلند کیا تھا، تم اب ادبار و انحطاط کے راستے پر کھڑے ہو، تم میں زندگی کی امنگ اور تڑپ باقی نہیں رہی، تمہیں زندگی عزیز نہیں، تم موت کی طرف آرزو اور اشتیاق کے ساتھ لپک رہے ہو۔

درباری:۔ ہم میں تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہیں اپنی قوت اور

طاقت کا اندازہ ہے۔

ل الدین:- ہاں تمہیں اپنی قوت وطاقت کا اندازہ ہے ، تاتاریوں کی قوت اور طاقت کا اندازہ بھی ہے ۔لیکن شاید خدا کی قوت وطاقت کا اندازہ تم بالکل نہیں رکھتے ۔مجھے ہے اور اسی کے بھروسہ پر میں تاتاریوں سے جنگ جاری رکھوں گا!

جلال الدین خوارزم شاہ ، بے سروسامانی کی حالت میں خوارزم سے نکلا ۔راستہ میں تاتاریوں سے مڈبھیڑ ہوئی اور وہ لڑتا ہوا غزنی کی طرف چلا گیا ۔

جیسے ہی جلال الدین خوارزم سے نکلا تاتاریوں نے پوری قوت کے ساتھ خوارزم پر حملہ کر دیا اور وہاں کے حکمراں اور جلال الدین کے بھائی قطب الدین ازلاق نے راہ فرار اختیار کی لیکن تاتاریوں نے اس کو مع خدم و حشم گرفتار کیا اور طالب اماں ہونے کے باوجود قتل کر دیا ۔

تاتاری فصیل توڑ کر شہر میں گھس گئے ۔شہر بڑا وسیع اور آبادی بہت گنجان تھی ۔ہر محلہ ایک مستقل بستی کی حیثیت رکھتا تھا ۔خوارزم کے باشندوں نے مقابلہ کرنا چاہا تاتاریوں نے آگ لگادی ۔بہت سے محلے جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئے ۔

تاتاریوں نے ایک محلہ پر دھاوا بولا ۔مسمارشدہ شہر پر قبضہ کر لیا ساری آبادی کو فصیل سے باہر لے جاکر ایک میدان میں جمع کیا ۔ ایک لاکھ اہل حرفہ کو تاتار بھیجنے کے لئے چھانٹ کر ۔باقی ماندہ آدمیوں

قاصد:۔ میرے آقا جلال الدین خوارزم شاہ نے امیرالمومنین کی خدمت عالی میں استمداد کی غرض سے غلام کو بھیجا ہے ۔

خلیفہ ناصر:۔ کیا کہا استمداد کے لئے ؟

قاصد:۔ امیرالمومنین ۔

خلیفہ ناصر:۔ (زہرخند کے ساتھ) جلال الدین ہماری مدد کا محتاج نہیں، جو تاتاریوں کی یورش کا تنہا مقابلہ کرسکتا ہے اسے کسی سے مدد طلب کرنے کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے ۔ جلال الدین خود ایک فاتح ہے ایک شہنشاہ ہے ۔ اس سے دوسرے مدد طلب کر سکتے ہیں ۔ وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہوسکتا ۔

قاصد:۔ میرے آقا نے امیرالمومنین کے لئے دعائے عمر و ترقی اقبال کے بعد عرض کیا ہے کہ تاتاریوں کی یورش کا وہ تنہا مقابلہ نہیں کرسکتا ۔

خلیفہ ناصر:۔ پھر کس طرح کرسکتا ہے ؟

قاصد:۔ ممالک اسلامیہ کے اتحاد و تعاون سے ــــ

خلیفہ:۔ ہوں،

قاصد:۔ میرے آقا کا دعویٰ ہے کہ وہ تاتاریوں کو کچل سکتا ہے ۔ ان کا کس بل نکال سکتا ہے ۔ ان کی وحشت اور درندگی کا ترکی بترکی جواب دے سکتا ہے ــــ

خلیفہ ناصر:۔ بہت خوب اور؟

قاصد:۔ میرے آقا نے عرض کیا ہے، تاتاریوں کا فتنہ بہت بڑا، بہت ہولناک اور بے انتہا تباہ کن ہے ۔ تاتاری مسلمانوں کے دشمن ہیں، انسانیت کے دشمن ہیں، تہذیب و تمدن کے دشمن ہیں، وہ آج

کو فوج میں تقسیم کر دیا اور شہر کو لوٹ کر ویران کر دیا۔

مشہور مورخ ابن اثیر کا بیان ہے کہ شہر کو فتح کرنے کے بعد دریا کے بند کو جس کے ذریعے شہر میں پانی آتا تھا، کھول دیا۔ اور سارا شہر مع آبادی کے غرق آب ہو گیا۔

(طبل پر ایک زوردار چوٹ)

یہ امیر المومنین خلیفہ ناصر لدین اللہ کا دربار ہے۔ قصر خلافت سے امیر المومنین کی سواری روانہ ہو چکی ہے۔

چوبدار:۔ نگاہ روبرو! ادب!! امیر المومنین تشریف لا رہے ہیں۔

(چاپ کی آواز)

دو آوازیں:۔ (زور سے) نصرٌ من اللہِ و فتحٌ قریب

چوبدار:۔ (زور سے) امیر المومنین

(سناٹا)

خلیفہ ناصر:۔ ہمیں معلوم ہوا ہے جلال الدین خوارزم شاہ کا قاصد شرف باریابی حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا ہے۔

چوبدار:۔ امیر المومنین قاصد دربار میں حاضر ہے۔

خلیفہ ناصر:۔ حاضر کیا جائے۔

(قدموں کی چاپ)

خلیفہ ناصر:۔ تم ہو جلال الدین خوارزم شاہ کے قاصد؟

قاصد:۔ امیر المومنین،

خلیفہ ناصر:۔ کیا پیام بھیجا ہے اس نے؟

قاصد:۔ امیر المومنین وہ مسلمانوں کے دشمن ہیں ۔

خلیفہ ناصر:۔ یہ بھی غلط ـــــ وہ صرف جلال الدین خوارزم شاہ کے دشمن ہیں۔

قاصد:۔ عالی جاہ آج ـــــ اور کل جب وہ خوارزم شاہ کو پامال کر چکیں گے تو ان کی حوصلہ مندی انھیں نچلا نہ بیٹھنے دیگی ، وہ شام ، روم ، بغداد ہر طرف بڑھیں گے ـــ

خلیفہ ناصر:۔ بغداد کی فوجیں جانتی ہیں کہ بغداد کی حفاظت کس طرح کرنی چاہیئے عساکر خلافت اس چیز سے واقف ہیں کہ دشمن اگر آگے بڑھے تو کس طرح پیچھے دھکیلا جا سکتا ہے ؟ تاتاری اتنے احمق نہیں ہیں کہ خلافت بغداد کی طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھ سکیں ۔

قاصد:۔ امیر المومنین ، امیر ـــــ

خلیفہ ناصر:۔ جلال الدین سے کہہ دینا ہم اس کی مدد کرنے سے قاصر ہیں اور اگر ہم پر کوئی وقت پڑا تو ہم بھی اس سے امداد و اعانت کے طالب نہیں ہوں گے ۔

قاصد:۔ امیر المومنین پھر غور فرمالیں ۔

خلیفہ ناصر:۔ ہم کوئی بات بے سوچے سمجھے نہیں کہتے ـــ تم صرف قاصد ہو تم جلال الدین کا پیام لائے ، ہم نے سن لیا ، اب ہمارا پیام لے جاؤ اور اسے سنادو ۔ اپنی حد سے بڑھنے کی کوشش مت کرو ـ

چنگیز خاں بڑھتا رہا ، آگے بڑھتا رہا ۔

وہ جدھر رخ کرتا تھا ۔ جلال الدین مقابلہ کے لئے موجود ملتا تھا ۔

اس نے جلال الدین کو نیچا دکھانے کے لئے اپنے تمام ذرائع و وسائل

دولت خوارزم شاہ کو تباہ وبرباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں - کل جب
انھیں موقع ملے گا ــــــ

خلیفہ ناصر :- تو خلافت بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے (ہنس کر)
کیوں تم یہی کہنا چاہتے تھے نا۔

قاصد :- امیرالمومنین - میں یہی عرض کرنا چاہتا تھا - میرے آقا نے مجھے
حکم دیا تھا کہ میں صاف صاف عرض کر دوں -

خلیفہ ناصر :- ہم نے سن لیا ، اس نے کیا کہلوایا تھا اور تم نے کیا کہا ؟ ـــ
بس یا اور کچھ ؟

قاصد :- میرے آقا نے امیرالمومنین سے عرض کیا تھا کہ امداد و دستگیری
فرمائیں ، تاکہ وہ تاتاری فتنہ کا سر کچل سکیں ، یہ فتنہ ہر روز مہیب
سے مہیب تر صورت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے ضرورت ہے کہ جلد
از جلد اس کا سر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کچل دیا جائے -

خلیفہ ناصر :- جلال الدین کو ہمارا پیغام پہونچا دینا کہ ہم اس کے نصائح
کے شکر گذار ہیں -

قاصد :- لیکن میرے آقا نے امیرالمومنین کی خدمت میں امداد و
اعانت کی جو درخواست پیش کی تھی اس کا جواب ؟

خلیفہ :- کہہ دینا ہم بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ نہیں لگانا چاہتے - ہم
تاتاریوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا نہیں چاہتے - وہ ہم سے برسرپیکار
نہیں ، کوئی وجہ نہیں کہ ہم انھیں اپنا دشمن بنالیں -

قاصد :- لیکن امیرالمومنین وہ اسلام کے دشمن ہیں -

خلیفہ ناصر :- غلط -

پھر وہ طالقان پہونچا، اور یہاں بھی سڑکوں پر اور گلیوں میں پانی کی طرح مظلوم انسانوں کا خونِ ناحق بہایا۔

اب بامیان کی باری تھی، یہاں کے معرکہ میں چنگیز کا ایک لڑکا زخمی ہوگیا بجائے اس کے کہ جلال الدین گرفتار ہوتا، قتل کیا جاتا، خود چنگیز کا لڑکا زخمی ہوا۔ چنگیز غصہ سے بے قابو ہوگیا۔ اس نے دیوانوں کی طرح سر کے بال کے نوچ لئے۔ کپڑے پھاڑ ڈالے۔

شیر کی طرح گرج کر اس نے کہا، بامیاں کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹادو۔ یہاں کے انسان تو انسان جانور ــــ چرند، پرند تک زندہ نہ بچنے پائیں۔

چنگیز خاں کا انتقام اتنا ہولناک تھا کہ وہ بے زبان، اور بے گناہ جانوروں تک کو معاف کرنا نہیں جانتا تھا، لیکن وہ انتقام جلال الدین کے سامنے بے بس نظر آرہا تھا۔

چنگیز ہر مرتبہ اپنی فوج میں اعلان کرکے قہر خداوندی کا نمونہ بن کر پوری تندخوئی اور سفاکی ساتھ آگے بڑھتا تھا۔ وہ مکانوں کی دیواریں کھود ڈالتا تھا، وہ کھیتوں کو جلا دیتا تھا، وہ معبدوں، مدرسوں، مکتبوں اور خانقاہوں کو منہدم کردیتا تھا۔ وہ انسانوں اور جانوروں کا خون پی لیتا تھا ــ

لیکن جلال الدین خوارزم شاہ ہر مرتبہ ایک نیا چرکہ دے کر چنگیز کے دل پر ایک گھونسا مار کر اس طرح نکل جاتا تھا۔ جیسے آٹے سے بال۔

چنگیز نے سب کچھ کر لیا۔ لیکن وہ جلال الدین کا بال بھی بیکا نہ کر سکا

صرف کر دیئے ۔ اپنی ساری دولت صرف کر دی، اپنا ٹڈی دل لشکر
لے کر طوفان کی طرح بڑھتا رہا ۔
لیکن وہ جلال الدین کو شکست نہ دے سکا ۔ وہ جلال الدین کے حوصلہ
کو نہ ہرا سکا ۔
وہ جلال الدین کی خودداری عزت نفس، شجاعت اور دلیری کو
مجروح نہ کر سکا،
چنگیز کا غصہ بڑھتا جاتا تھا، ہر ناکامی پر وہ اور زیادہ غضبناک ہو جاتا
تھا ۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں ۔ وہ غصّے سے اپنی بوٹیاں
نوچنے لگتا تھا ۔
وہ ترمذ پہونچا، اور ترمذ پر قابض ہو گیا ۔ وہاں کی ساری آبادی کو
اس نے تہ تیغ کر دیا ۔ لیکن وہ جلال الدین کو نہ پکڑ سکا ۔
پھر وہ بدخشاں کی ولایت پر قابض ہو گیا ۔
یہاں بھی اس نے اسی سفاکی، خون آشامی اور درندگی کا مظاہرہ
کیا ۔ جس کی ترمذ میں اس نے نمائش کی تھی ۔ بدخشاں کے ایک ایک آدمی
کو چن چن کر اس نے قتل کیا ۔ لیکن جلال الدین اس کے لشکر کو نقصان
پہنچاتا ہوا صاف بچ کر نکل گیا ۔ پھر وہ بلخ پہونچا، جلال الدین یہاں
بھی اس کے ہاتھ نہ آیا ۔ اس نے بلخ کے تمام باشندوں کو بیدردی اور
سنگدلی سے ہلاک کر دیا ۔ جلال الدین برق جہندہ کی طرح اس کے
لشکر پر گرا اور نکلا چلا گیا ۔
پھر وہ خراسان پہونچا ۔ یہاں بھی اس کی تلوار نے بے گناہ انسانوں کا
خون چاٹا ۔

نہیں مانی ، میں کسی شخصیت سے مرعوب و متاثر نہیں ہوا ، میں کسی بڑی سے بڑی قوت سے ذرا نہیں سہما ۔۔ بتاؤ میں غلط تو نہیں کہتا ؟

ملی جلی آوازیں :- نہیں ، نہیں ۔۔۔ ہمارا بادشاہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا ، وہ بہادری میں یکتا ہے ، ساری دنیا اس کے نام سے کانپتی ہے ۔

چنگیز :- ہاں ساری دنیا میرے نام سے کانپتی ہے ۔ لیکن کیا جلال الدین خوارزم شاہ بھی ؟

ملی جلی آوازیں :- وہ بھی وہ بھی ،

چنگیز :- نہیں ، مجھے خوش کرنے کے لئے جھوٹ نہ بولو ۔

(سناٹا ، خاموشی)

چنگیز :- وہ مجھ سے نہیں ڈرتا ، میرا مذاق اڑاتا ہے ۔ میں نے بلند و بالا عمارتوں کو کھنڈر اور ملبہ بنا دیا ۔ میں نے بڑے بڑے تاریخی شہروں کو خاک کا ڈھیر بنا دیا ۔ میں نے جنگلوں ، باغوں ، اور کھیتوں کو جلا کر خاکستر کر دیا ، میں نے بہادر جوانوں اور سپہ گروں کی گردنیں کاٹ لیں میں نے خون کی ندیاں نہیں سمندر بہا دیئے ۔ میں نے جانوروں تک کو للکارا ، اور انھیں قیمہ قیمہ کر دیا ۔ میرے سامنے آنے کے بعد کوئی بھی اپنی جان سلامت نہ لے جا سکا ۔

ملی جلی آوازیں :- بیشک ، بیشک ،

چنگیز :- لیکن میں جلال الدین کو شکست نہ دے سکا ، میں اس کے عزم و ہمت کو مجروح نہ کر سکا ۔ میں اس کی خودداری اور عزت نفس کو کچلنے میں کامیاب نہ ہو سکا ، ۔۔۔ بتاؤ میں غلط تو نہیں کہتا ؟

(خاموشی)

چنگیز سیلاب کی طرح بڑھتا ہوا غور پہنچا ۔ یہاں بھی وہ جلال الدین کو زیر نہ کر سکا ۔ جلال الدین نے اس پر وار کیا ، اور قبل اس کے کہ وہ سنبھلے ، بجلی کی طرح اپنی چمک دکھا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا ۔

جوش غضب سے بے خود ہو کر چنگیز نے غور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جو سامنے آیا ، اسے ہلاک کر دیا ۔ لیکن جلال الدین کے نقش قدم کے سوا وہ اور کچھ نہ پا سکا ۔

اور اب چنگیز اپنی تمام ہلاکت سامانیوں اور تباہ کاریوں کے ساتھ غزنی میں موجود تھا ۔

غزنیں کا بھی وہی حشر ہوا تھا جو بامیان کا ہوا تھا ۔ نہ کوئی آدمی زندہ بچا نہ کوئی عمارت سلامت رہی ، نہ کوئی درخت اپنی جگہ قائم رہ سکا نہ سبزۂ خودرو کو امان ملی ۔ نہ جانوروں اور پرندوں کی جاں بخشی ہوئی ۔

سب پر تلوار چلی ، اور جو تلواروں کی زد میں آیا ، سلامت نہ رہ سکا لیکن ـــــ جلال الدین یہاں بھی چنگیز کی صفوں کو چیرتا ہوا نکلا چلا گیا چنگیز نے اپنے شاہی خیمہ میں ایک مجلس مشاورت منعقد کی ، فوج کے سردار ، امراء ، رؤسا ، اصحاب فکر و تدبر اور خود چنگیز کے دلاور اور سپہ گر لڑکے موجود تھے ۔

مجلس پر موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا ۔ چنگیز کی دہشت سب پر مسلط تھی ۔ اتنے میں اس سناٹے کو چنگیز کی چنگھاڑ نے توڑا ـــ اس نے کہا ۔

چنگیز :- میں آج تک شکست سے دوچار نہیں ہوا ، میں نے کسی سے ہار

یہ دریائے سندھ کا کنارہ ہے ۔جلال الدین خوارزم شاہ کا تعاقب کرتا ہوا چنگیز خان اپنی ٹڈی دل فوج کے ساتھ یہاں موجود ہے ۔
جلال الدین اپنے مٹی بھر سپاہیوں کے ساتھ بہادری اور بے جگری سے لڑ رہا ہے ۔
جلال الدین کے خیمہ پر چنگیز نے قبضہ کر لیا ۔اس خیمہ میں جلال الدین کے اہل وعیال موجود تھے ۔
ان سب کو چنگیز خاں نے گرفتار کر لیا ،پھر اپنے ایک افسر سے اس نے کہا ۔

چنگیز :۔جلال الدین کے یہ لڑکے میرے قبضہ میں ہیں ۔
یہ کہہ کر وہ بے ساختہ ہنس پڑا ،
(ایک شیر خوار بچے کی رونے کی آواز)
چنگیز :۔ یہ کس کا بچہ رو رہا ہے ؟
مصاحب :۔عالی جاہ ـــ یہ جلال الدین خوارزم شاہ کا شیر خوار بچہ ہے ۔
چنگیز :۔جلال الدین خوارزم شاہ کا شیر خوار بچہ !
مصاحب :۔عالی جاہ ،
چنگیز :۔ہوں ،ـــــ

(سناٹا ،خاموشی)

چنگیز سانپ کا بچہ سنپولا ،(غضب ناک آواز میں) یہ آج بچہ ہے ،کل بڑا ہو کر جلال الدین بنے گا (اور زیادہ غضبناک ہو کر) نہیں میں اسے جلال الدین نہیں بننے دوں گا ـــ یہ جلال الدین نہیں بن سکتا یہ زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتا ـــ
(خاموشی)

چنگیز :۔ مجھے اپنے وجود سے شرم آنے لگی ہے ۔ میں نے ہر معرکہ میں زیادہ سے زیادہ تازہ دم فوجیں جھونکیں ، اور ہر معرکہ سے زندہ دلی، اور شرارت کے ساتھ جلال الدین خوارزم شاہ بچ کر نکل گیا ۔

درباری :۔ لیکن کب تک ؟

دوسرا درباری :۔ آخر ایک نہ ایک دن وہ ہمارے ہاتھ آئے گا ۔

تیسرا درباری :۔ اور اس کا بھی وہی حشر ہوگا ۔ جو اس کے لاکھوں ہم قوموں کا ہو چکا ہے ۔

چنگیز :۔ ہاں ـــ لیکن وہ دن کب آئے گا ۔ کیا میری زندگی میں ؟

ملی جلی آوازیں :۔ ضرور ۔ ضرور ۔ ضرور ۔ دنیا کی وسعت اب اس کے لئے تنگ ہو رہی ہے ، وہ غزنیں سے ہندوستان کا ارادہ کر کے روانہ ہوا ہے ۔ اگر اس کا تعاقب جاری رکھا جائے تو اس مرتبہ وہ ضرور ہمارے ہاتھ آجائے گا ۔ اور پھر ساری کسر ایک دفعہ میں نکل جائے گی ۔

چنگیز :۔ تمہاری یہ اطلاع کہاں تک صحیح ہے ؟

مصاحب :۔ ہمارے جاسوسوں نے بڑی تگ و دو کے بعد اس کا پتہ لگایا ہے ۔

چنگیز :۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں فوراً کوچ کر دینا چاہئیے ـــ ابھی اسی وقت ! ـــ جلال الدین اگر دریا کی تہہ میں پہونچے گا تو میں وہاں بھی اس کا تعاقب نہیں چھوڑوں گا ـــ کوچ ، کوچ !

(کوچ کا سماں ، باجے ، تاشے ، گھوڑوں اور جانوروں کی آوازیں ۔ باربار نقارہ کی آواز ، گھوڑوں کی ٹاپ ۔ اور ہنہنانے کی آوازیں)

باقی ہے۔ کہاں ہے میرا بیٹا چغتائی۔

چغتائی:۔ میں حاضر ہوں۔

چنگیز:۔ میرے بعد تجھے بادشاہت سنبھالنی ہے، میں تجھی کو اپنا ولی عہد بنانا چاہتا ہوں، میں چاہتا ہوں اس جلال الدین کا سر تو اپنی تلوار سے سے قلم کرے —— دیکھ وہ اب تک لڑ رہا ہے، ۔

(لڑائی کی مذکورہ آوازیں ہلکے طور پر جاری ہیں)

وہ اپنے مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ جدھر نکل جاتا ہے صفوں کی صفیں الٹ دیتا ہے یہ میرے لئے، تیرے لئے، سارے تاتاریوں کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے۔

چغتائی:۔ جلال الدین اب ہمارے پنجہ سے نکل کر نہیں جا سکتا۔ اس کی ہلاکت کا شرف میں اکیلا نہیں حاصل کرنا چاہتا، اس شرف میں ہماری ساری فوج شریک ہوگی۔

چنگیز:۔ وہ کس طرح میرے بیٹے۔

چغتائی:۔ ایک طرف بحر ذخار کی طرح دریائے سندھ لہریں مار رہا ہے، دوسری سمت کمان کی شکل میں تاتاریوں نے اسے گھیرے میں لے لیا ہے، ہمارے حصار کا دائرہ آہستہ آہستہ تنگ ہوتا جا رہا ہے، —— وہ زندہ گرفتار ہوگا۔ پھر مارا جائے گا۔

(دریا میں زور سے گرنے کا دھماکہ)

چنگیز:۔ ہیں یہ کیا ہوا؟

چغتائی:۔ عالی جاہ! جلال الدین گھوڑے سمیت دریائے سندھ میں کود پڑا کمبخت نے ہماری تلواروں سے مرنا گوارا نہ کیا۔ دریا میں ڈوب کر جان دی

چنگیز :- ادھر لاؤ اسے،

[بچہ چنگیز کے سامنے لایا جاتا ہے، بچہ رونا بند کر کے اسے غور سے دیکھنے لگتا ہے۔ چنگیز بھی اسے گھورتا ہے۔ بچہ چنگیز کی داڑھی پر ہاتھ مارتا ہے اور دوسرے ننھے ہاتھ سے طمانچہ مارتا ہے۔ چنگیز چیختا ہے۔]

چنگیز :- قتل کر دو اسے،

(تلوار کے چلنے کی آواز، بچہ کا سر زمین پر دھم سے گرتا ہے)

چنگیز :- ایک جلال الدین بچ گیا۔ لیکن دوسرا جلال الدین میرے ہاتھ سے نہ بچ سکا۔ وہ قتل ہو گیا۔

(ہنستا ہے)

(خاموشی)

چنگیز :- جلال الدین کے کچھ اور لڑکے بھی گرفتار ہوئے ہیں؟

آواز :- عالی جاہ۔

چنگیز :- کتنے؟

آواز :- عالی جاہ۔ تین نوعمر لڑکے، !

چنگیز :- انھیں بھی میرے سامنے لاؤ۔

(قدموں کی آواز)

چنگیز :- انھیں بھی قتل کر دو۔

(تلوار کے چلنے کی کھٹا کھٹ کی آواز)

چنگیز :- (قہقہہ لگا کر) آج میں نے ایک نہیں، دو نہیں، تین، چار جلال الدین مارے، ـــــ لیکن نہیں میں ابھی خوش نہیں ہوں۔ وہ اصلی جلال الدین

چنگیز:- نہیں نہیں ——— وہ ڈوبا نہیں، وہ تیر رہا ہے۔ اس نے دریا کا پاٹ تیر کر پار کر لیا — دیکھ وہ دیکھ، وہ ہندوستان کی سرحد پر پہنچ گیا، وہ ہمارے پنجے سے ایک مرتبہ پھر بچ کر نکل گیا، وہ دھوپ میں اطمینان سے کھڑا، اپنے کپڑے سکھا رہا ہے۔ اور اس کا گھوڑا اطمینان سے گھاس چر رہا ہے، — وہ بہادر ہے، اس کا گھوڑا بھی بہادر ہے۔ اس کے حوصلے میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا۔" ہر باپ کے بیٹے کو اتنا ہی دلیر اور ایسا ہی بہادر ہونا چاہیئے۔

اب تعاقب بے کار ہے، چلو واپس چلو، اس نے شکست نہیں مانی وہ فاتح ہے۔

(فوج کا کوچ باجوں کی آوازیں، انہی آوازوں کے شور میں تحت اللفظ)

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!

(ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر شدہ ۵۶ء)